مردہ خانے میں عورت
مشرف عالم ذوقی

# مردہ خانہ میں عورت

(ناول)

مشرف عالم ذوقی

پیارے دوست

**خورشید اکرم**

اور

**نعمان شوق**

کے نام

مارِ شہوت را بکش در ابتدا
ورنہ اینکہ گشت مارت اژدہا
(خواہش کے سانپ کو ابتدا میں ہی مار دو ورنہ
دیر ہونے پر اژدہا قابو سے باہر ہو جائے گا)

— مولانا روم

عزیزمن احتشام الحق آفاقی کا بے حد ممنون
جنھوں نے
اس ناول کا حرفاً حرفاً مطالعہ کیا اور مجھے ہر طرح کا تعاون دیا



اس ناول کے تمام کردار، واقعات فرضی ہیں۔
کسی بھی طرح کی مماثلت کو اتفاق کہا جائے گا۔ اس
کے لیے مصنف اور پبلشر ذمہ دار نہیں ہے۔

# فہرست





"When reason fails, the devil helps!"

-- Fyodor Dostoyevsky, Crime and Punishment

"The fear of appearances is the first symptom of impotence."

-- Fyodor Dostoevsky, Crime andPunishment



"Only to live, to live and live! Life, whatever it may be!"

-- Fyodor Dostoyevsky, Crime and Punishment

# ابتدائیہ

## مصنف کا بلاگ

'وہاں بہت سے بندر ہیں'

'جہاں بندر ہوتے ہیں وہاں کتے بھی ہوتے ہیں۔'

بطور مصنف میں اس کے جواب سے مطمئن نہیں تھا۔ سڑک کے کنارے ایک مداری والا تھا۔ مداری والے سے کچھ قدم آگے ڈولفن مچھلی جھولہ جھول رہی تھی... اور ایک بندر آنکھوں پر چشمہ لگائے، درخت کے سایے میں کتاب پڑھنے میں مصروف تھا۔ ایک تتلی تھی جو مداری کے آس پاس منڈراتی ہوئی صوفیانہ رقص میں مشغول تھی۔ اس کے داہنے طرف چوہوں کی ایک قطار تھی۔ اور چوہے کسی جشن میں شامل ہونے کے لیے جا رہے تھے... اگر یہ سب عجیب ہے تو اس وقت ملک میں جو کچھ ہو رہا تھا، اس سے کہیں زیادہ عجیب تھا... اور میں کہتا ہوں، ناول کے صفحات پر کبھی کسی مصنف کو چوہے کی طرح دوڑ کر نہیں آنا چاہیے اور یہ بات مسیح سپرا ہی کر سکتا تھا۔ میں اس سے کئی بار ملا۔ بندروں کے درمیان، کتوں کے درمیان



اور ریچھوں کے اس پارک میں، جہاں میں نے کبھی ڈولفن نہیں دیکھی مگر مسیح سپرا کہتا تھا کہ ڈولفن ہے اور اس نے کئی بار ڈولفن کو پانی میں انگڑائی لیتے ہوئے دیکھا ہے۔

ڈولفن، بندر، کتے اور مسیح سپرا کے درمیان اچانک ملک آگیا تھا... اور ملک بھی ایسا، جس کے ثقافتی اور تمدنی رنگ کے بارے میں، سب کے پاس اپنے اپنے چشمے تھے۔ ہزاروں سال، بلکہ لاکھوں سال اور ایک وہ بھی تھا جس نے چنبل گھاٹی میں پڑی دراڑوں کو دکھا کر بتایا تھا کہ یہاں اڑنے والے اور پاؤں سے چلنے والے ڈائنا سور ہوا کرتے تھے۔ پہلے یہاں ان کے قدموں کے نشان تھے۔ اب ان چٹانوں پر گھاس اُگ آئی ہے۔ بلکہ چٹانوں پر ڈائنا سور کے ڈی این اے اسی طرح تلاش کیے جا سکتے ہیں، جیسے ان دو بندروں کے، جو درختوں کی شاخوں پر چھلانگ لگاتے ہوئے جب ایک دوسرے سے ملے تو ان کے کوٹ کی جیب میں دو الگ الگ کاغذ کا مسودہ رکھا ہوا تھا۔ ایک مسودہ زرد رنگ کا تھا اور یقین ہے کہ یہ مسودہ آزادی کے فوراً بعد کا تھا اور اسی لیے کاغذ بوسیدہ تھا اور ہاتھ میں تھامنے پر کاغذ کے اڑ جانے کا خطرہ تھا۔ دوسرے بندر کے ہاتھ میں نیا کاغذ تھا اور ایسا لگتا تھا، جیسے یہ مسودہ ابھی ابھی تیار ہوا ہو... اور اسی لیے بطور مصنف، میں یاد کر سکتا ہوں کہ ان دونوں کے درمیان کیا باتیں ہوئیں۔

پہلے نے بوسیدہ کاغذ نکالا۔

دوسرے نے نیا۔

پہلے نے کہا۔ 'ضرورت نہیں۔'

دوسرا ہنسا... 'کاغذ دیکھو... پڑھا بھی نہیں جاتا۔'

پہلا ہنسا... 'کاغذ اس قدر بوسیدہ ہو چکا ہے کہ...'

دوسرا مطمئن تھا... 'اور اسی لیے میں نے نیا مسودہ.....'

پہلے نے بوسیدہ کاغذ زمین پر پھینک دیا۔ جوتے سے مسل دیا۔ اب وہ مطمئن تھا۔

'اس کی شکل دیکھو..'

'کس کی؟'

'مسودے کی....؟'

'مسودہ کہاں ہے' دوسرا ہنسا۔ 'اب وہ مٹی کا حصہ ہے۔'

'یہ غلط ہے۔' پہلا سنجیدہ تھا۔' اس میں مٹی مت لاؤ۔ مٹی کا مطلب ہے قومیت۔'

'ہاں یہ تو ہے..'

'ایسے بولو... یہ شمشان کا حصہ ہے...'

پہلا مسکرایا... 'یہ قبر کا حصہ ہے....'

دوسرا مطمئن تھا۔ 'یہ زیادہ اچھا ہے..'

پہلے نے کہا۔ 'اب ہمارے پاس نیا مسودہ ہے.....'

'نیا کاغذ..'

'لیکن کیا اس مسودے کو....؟'

' کیا کبھی ہم نے دوسروں کے بارے میں سوچا ہے؟' پہلے نے ٹھہا کہ لگایا...

'کبھی نہیں۔'

'پہلا اچانک چونکا۔ 'یہ آندھی کیسی ہے...؟'

' کافی تیز ہے...اور ہمارے درختوں سے آرہی ہے۔'

'نہیں۔ درختوں کے پیچھے سے بھی۔'



' آندھی تو آئے گی ہی۔' دوسرے کے چہرے پر سوالیہ نشان تھے...' کیا وہ آسانی سے چلے جائیں گے۔؟'

'اس کی امید کم ہے...اور اسی لیے آندھی...' وہ کہتے کہتے رُک گیا۔

'پہلا مطمئن تھا۔ انہیں گولیور کے دیس بھیج دیں گے۔'

دوسرا آہستہ سے بولا۔ ' گولیور کے دیس سے بندر اب یہاں آ چکے ہیں۔'

وہ ہنسا...اور اب پرانی تاریخ کی جگہ نئی تاریخ لکھ رہے ہیں۔

اور جس وقت یہ مکالمہ کررہے تھے، اس وقت زمین بہت تیزی سے ڈول رہی تھی اور مسیح سپرا کو احساس تھا کہ یونان کی دیو مالائی کہانیوں سے نکل کر سمندر کے دیوتا بوسیڈان نے اپنی برچھی سے زمین کو چھوا ہے...اور یقیناً جب جب وہ ایسا کرتا ہے، زمین ہلنے لگتی ہے۔

اور اس وقت زمین ہل رہی تھی، ایک کہرام مچا تھا— مسیح سپرا نے آہستہ سے کہا، وہ بندروں سے خوفزدہ نہیں ہے۔ مگر وہ گم ہونے جارہا ہے۔

اور وہ اچانک دیکھتے ہی دیکھتے گم ہو گیا...

مجھے اس کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

جھاڑیوں کے درمیان ایک نیم پلیٹ ملی۔ اس پر مردہ خانہ تحریر تھا۔

سامنے ایک دروازہ تھا، جس پر تالہ لگا تھا۔

یونانی دیوتا بوسیڈان کو غصہ آیا ہوا تھا اور زمین مسلسل ہل رہی تھی۔

# باب اوّل

# اندھیرا، موت اور مسیح سپرا



## (1)

وہ ان پراسرار وادیوں میں کب سے ہے؟

اس نے سوچا، مگر اس کا کوئی جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

اس نے سوچا، کیا آفتاب سچ مچ طلوع ہوتا ہے؟ غروب ہوتا ہے؟ سمندروں سے موجیں اٹھتی ہیں؟ اس نے پہاڑ کے شگاف سے اٹھنے والے آتش فشاں کو دیکھا۔ اور اس وقت وہ دشت لایعنیت کے صحرا میں تھا.... اور ایک زندہ انگلی اس کے لئے قطب نما تھی جو اسے راستہ بتا رہی تھی۔ اس نے ایک قحبہ خانے کو دیکھا، دھول مٹی کی سڑک کو.... اور ایک خاص بو کو محسوس کیا جو شمال سے ہوتی ہوئی چاروں سمت پھیل رہی تھی۔

....اور اس نے سوچا، پیدا ہوتے ہی پہاڑی شگاف سے اٹھنے والے آتش فشاں ہمارے ساتھ ہوتے ہیں، مگر ہم موسموں کا اعداد و شمار رکھتے ہیں اور اس لمحہ وقت کسی مسخرے سے کم نہیں ہوتا۔ وہ آفتاب کی طرح طلوع و غروب کے رقص میں ہوتا ہے، مہتاب کی طرح بادلوں کے قافلہ میں چھپتا اور اُبھرتا ہے... اور سمندر کی

بے قرار موجوں کی طرح فلک تک اچھال لیتا ہے اور بکھر جاتا ہے.....

وہ اس زندہ انگلی کے لمس کے ساتھ گھر لوٹا تھا اور اس وقت اس نے بی بی مریم کے مجسمے کو دیکھا تھا اور اس سرخ چیونٹے کو جو صندوق کے پاس دیوار پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سونے کی کوشش کرتا ہے تو وہ انگلی رقص کرتی ہوئی اس کے سامنے آجاتی ہے۔ وہ ایک برف کے قلعے کو دیکھتا ہے اور پھر ریحانہ کو۔ وہ قلعے کی فصیلوں پر کھڑی مسکرا رہی ہے اور پھر اپنی چار انگلیاں دکھا کر کہتی ہے کہ ایک انگلی تمہارے لیے چھوڑ دی، کہ تم مردہ مچھلیوں کی طرح ساکت نہ رہو اور چاہو تو کسی خاتون کو گھر لے آؤ، جو میری طرح برف کے قلعوں میں قید نہ ہو۔

سپرا نے پہلے ایک صحرا دیکھا۔ پھر ایک خوبصورت مجسمہ۔ پھر اس پرندے کو دیکھا، جو یونانی داستانوں میں فینکس کے نام سے طویل عرصہ تک زندہ رہنے والا پرندہ ہے۔ جو سورج سے وابستہ ہے اور اپنی راکھ سے دوبارہ نمو حاصل کرتا ہے۔ جسے بی بی مریم نے ہاتھوں میں اٹھا رکھا ہے اور حضرت مسیح نے صلیب کو چومتے ہوئے فینکس کو دیکھا تھا اور کہا کہ میں دوبارہ واپس آؤں گا۔

فینکس نے منہ سے شعلہ اُگلا۔ بھسم ہوا۔

سپرا نے دیکھا...... وہ دوبارہ زندہ ہوا، اس کے پنکھ عقاب کی طرح سونے کے ہیں۔ اس نے عیسیٰ مسیح کو مصلوب دیکھا......حق کی نگہداشت کرنے والا باپ، جو دوبارہ موجوں سے اُٹھا اور چوٹیوں پر برآمد ہوا... اور اس وقت جب دنیا تباہی کی طرف جا چکی تھی۔

سپرا نے آہستہ سے دہرایا۔ فینکس ......مسیح......

فینکس نے دوبارہ شعلہ اُگلا اور غائب ہو گیا۔

اب اس کی نظروں کے سامنے ضحاک تھا۔ دو سانپ، جو اس نے دو دو بار



دیکھے۔ زہر اُگلتے اور غائب ہوتے ہوئے......لیکن ضحاک کے دہانے سونے جیسے نہیں تھے۔

اس نے پھر محسوس کیا، اس کی سانس لینے والی نلکی کے پاس ایک ہڈی کا ٹکرا آ گیا ہے۔ تاہم وہ مطمئن تھا کہ یہ ٹکرا نکل جائے گا اور وہ پھر سے سانس لے سکے گا اور اگر نہیں بھی لے سکا تو کوئی بات نہیں کیونکہ وہ زندہ کب ہے اور وہ فینکس بھی نہیں ہے۔

اس نے سوچا، اس نے ایسا بہت کچھ سوچا اور نیند کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا قاف کی وادیوں میں اتر گیا۔

(2)

زندگی آپ میں سے کچھ نہ کچھ خالی کرجاتی ہے۔ پیدائش سے موت تک یعنی
آخری سانس تک روح کا باقی اثاثہ بھی آپ سے چھین لیتی ہے اور سرد جسم دیکھنے
والوں کے لیے چھوڑ جاتی ہے۔اس سرد جسم کا قصہ یوں ہے کہ کچھ دیر تک یونہی
لاوارث چھوڑ دیجیے تو مکھیاں بیٹھنے لگتی ہیں کچھ دیر اور چھوڑ دیجیے تو چیونٹیاں
سوراخوں سے نکل کر خوراک بنا لیتی ہیں۔اور کچھ ہی گھنٹوں میں اس سرد جسم کی بدبو
پھیلنے لگتی ہے— جو کچھ دیر پہلے یا کچھ ماہ قبل جب زندہ تھا تو خواہشات کا مجسمہ تھا۔
اس مجسمے میں تپش بھی تھی اور خواہش بھی۔روح کا اثاثہ چلا گیا تو ایک بے حس جسم،
جس پر کوّے بھی منڈرائیں گے اور گدھ بھی۔اور مسیح سپرا کے لیے یہ معاملہ یوں
دلچسپ تھا کہ اس نے خود کو زندگی میں ہی مردہ تصور کرلیا تھا۔ وہ تین زبانیں جانتا
تھا۔ اردو، ہندی اور انگریزی۔ اسی لیے وہ سوچتا تھا اور اس وقت سوچتا تھا، جب
اس نے خود کو مردہ تصور نہیں کیا تھا کہ انگریزی میں موت کو دیتھ کہا جاتا ہے۔دیتھ
سے د نکال دیجیے تو ایٹ یا کھانے کے لیے اُمنگ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔یعنی پیدا



ہوتے ہی موت آپ کا شکار کرنے یا آپ کو کھانے بیٹھ جاتی ہے۔ ہندی میں موت
کے لیے مرتیو کا لفظ ہے۔آپ م نکال دیجیے تو ریتو کی موسیقی پیدا ہوتی ہے۔مگر یہ
موسیقی اس قسم کی ہے جو آپ کو اداسی اور موت کی طرف لے جاتی ہے۔یعنی موت
کا موسم۔موت قریب ہے۔آپ بدنصیب ہیں کہ پیدا ہوگئے۔اب ساری زندگی
مرتیو کی ریتو کا انتظار کیجیے۔اردو میں مرنا سے م نکال دیجیے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ
آپ رو رہے ہیں۔ اور یہ رونا زندگی کی صداقت ہے۔ پیدائش سے موت تک
انسان روتا ہی ہے۔موت سے م نکال دیجیے تو بھوت کا تصور پیدا ہوتا ہے۔یعنی
انسان پیدائش سے موت تک بھوت رہتا ہے۔ ہندی میں بھوت ماضی کو کہتے
ہیں۔یعنی انسان زندگی نہیں گزارتا ہے بلکہ ایک طرح سے بھوت کال یا ماضی میں
ہوتا ہے جہاں تاریخ کے گڑے مردے ہوتے ہیں اور یہ مردے زندہ انسانوں کے
ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔

مسیح سپرا کو موت کا خیال کسی سایے کی طرح نظر آتا تھا، ایسا سایہ جو سفید لباس
میں معلق ہو یا نیلے آسمان پر چلتے سفید بادلوں میں وہ موت کا عکس دیکھا کرتا تھا۔اور
جب اس نے سوچ لیا کہ وہ مر چکا ہے تو سب سے پہلے اسے سرد خانے میں کام کرنے
والے ملازم مجومدار کا خیال آیا۔ایک زمانہ تھا جب وہ مجومدار سے کئی بار ملا۔اور مجومدار
سرد خانہ کے بارے میں بہت دلچسپ باتیں بتایا کرتا تھا۔جیسے مجومدار نے بتایا کہ
مردے خاموش رہ کر باتیں کرتے ہیں اور ان کی باتیں اتنی مزیدار ہوا کرتی ہیں کہ سرد
خانے کے آہنی گیٹ سے باہر نکل کر، باہر کی دنیا کو دیکھنے کا خیال بھی اسے ناگوار گزرتا
ہے۔یہ مجومدار نے ہی بتایا کہ سرد خانے کے آہنی گیٹ سے باہر جو دنیا ہے، وہ بھی ایک
مردہ خانہ ہے۔ وہاں شور ہے، سازشیں ہیں اور یہاں تنہائی۔ کوئی سازش نہیں۔
مجومدار نے ہنستے ہوئے بتایا.....دیکھو یہ سینگیں....'

'سر میں؟'

'لو، سینگیں کہاں ہوتی ہیں؟'

'لیکن سر میں سینگیں.... نظر تو نہیں آتیں۔'

'مجھے آتی ہے۔ سینگیں چیختی بھی ہیں۔'

'لیکن سینگیں کہاں سے آئیں۔؟'

'ٹھنڈ سے۔'

'ٹھنڈ سے؟'

'لاشوں سے اور ان کی باتوں سے۔'

مسیح سپرا کے لیے اس کی بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ بیسیوں بار وہ ایسی سینگیں اپنے سر پر بھی محسوس کر چکا تھا، جب اس کی بیوی زندہ تھی اور کسی بات پر غصہ ہوجاتی تھی تو اچانک اس کے سر پر بھی سینگیں پیدا ہوجاتی تھیں۔ وہ ہنستا تو مرحومہ کے سر کی سینگیں اور بڑی ہوجاتی تھیں۔ پھر کچھ دیر میں یہ سینگیں غائب ہوجاتی تھیں۔ سڑک پر آوارہ گردی کرتے ہوئے کتنے ہی لوگوں کے سروں پر اس نے یہ سینگیں دیکھی تھیں۔ اس لیے مسیح سپرا کو مجومدار کی سینگوں میں کوئی زیادہ دلچسپی نہیں تھی، مگر مجومدار نے مردہ خانے کے بارے میں جو کچھ بتایا، اس کے تجسس میں اضافہ کرنے کے لیے کافی تھا۔

'زندہ یہی لوگ ہیں۔ جو باہر ہیں، سب مرے ہوئے ہیں.....اور اسی لیے میں بھی زندہ ہوں، کیونکہ ان کے درمیان ہوں۔'

مجومدار ہمیشہ سفید کرتہ اور پائجامہ میں ہوتا تھا۔ سفید چادروں سے ڈھکی لاشوں کے درمیان ایک زندہ سفید لاش.....بقول مجومدار، دودھیا رنگ کے سفید جسم پانیوں میں تیرتے اجنبی سیاح....ایک کولڈ اسٹوریج....سنگ مرمر کا سفید



فرش۔ آہنی دروازہ کے کھلتے ہی ایک مختصر راہداری۔ رات میں مردے گفتگو کرتے ہوئے دروازے تک آ کر ٹہلتے رہتے ہیں....اور دلچسپ یہ کہ چلتی پھرتی لاشیں موسم بہار اور موسم خزاں دونوں پر گفتگو کرتی ہیں اور جیسا کہ اس نے سنا، موسم خزاں کا لطف یہ مردے زیادہ اٹھاتے ہیں۔ مجومدار نے یہ بھی بتایا کہ کئی بار اس کی ملاقات موت کے فرشتے سے بھی ہوچکی ہے۔ وہ کبھی بیل پر سواری کرتا ہوا آتا ہے کبھی عورت کی شکل میں جس کی آنکھیں بڑی بڑی اور چہرے پر سفید رنگ کا نقاب ہوتا ہے۔ سپرا کی دلچسپی ان باتوں میں اس لیے بھی نہیں تھی کہ اب وہ بھی خود کو مردہ سمجھ رہا تھا بلکہ اس کو یقین تھا کہ وہ مر چکا ہے اور گھر کو اصل مردہ خانے میں تبدیل کرنے کے لیے اسے کچھ انتظام بھی کرنے ہوں گے۔ گھر میں کل ملا کر چھ کمرے تھے۔ ہر کمرے میں دیوار پر گھڑیاں سجی تھیں۔ وقت رُک گیا تھا، اس لیے گھڑیاں بھی رُکی پڑی تھیں۔ مردوں کو وقت سے کیا کام۔ وقت سے کام تو زندوں کو ہوتا ہے اس لیے مسیح سپرا نے پہلا کام یہ کیا کہ ایک ہتھوڑا لیا اور گھڑیوں کے ٹکرے ٹکرے کردیے۔ پھر ان ٹکروں کو ڈسٹ بین میں ڈال آیا۔ مسیح سپرا نے گھر کی دیواروں کا جائزہ لیا۔ دیواریں بے رونق تھیں۔ سفیدی سیاہی میں تبدیل ہوچکی تھی۔ مردے چلتے ہیں، جیسا کہ مجومدار نے بتایا تھا اور اس لیے گھر سے باہر نکلنے میں اسے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ سپرا آرام سے باہر نکلا۔ سڑکوں پر ٹہلتا رہا۔ ٹریفک کو دیکھ کر اور سڑکوں پر چلتے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر اسے ہنسی آرہی تھی۔ یہ لوگ کل نہیں ہوں گے۔ ان میں سے کوئی بھی نہیں ہوگا اور یہ لوگ اپنی موت سے کس قدر بے خبر ہیں۔ سپرا نے شاپنگ کی اور گھر آگیا۔ سفید چادروں کا ایک بنڈل تھا، جو اس نے دیواروں پر سجانے کے لیے خریدا تھا۔ ایک ہالی ووڈ کی ہارر فلم میں اس نے مردہ خانہ کی یہ تصویر دیکھ رکھی تھی۔ پورے گھر کو سفید چادروں سے ڈھک دیا گیا

تھا۔ یہاں تک کہ کھڑکی، روزن کو بھی۔گھر کے چھ کمروں میں سفید چادریں
دیواروں پر چڑھاتے ہوئے اسے پانچ گھنٹے لگ گئے۔ایک بار تو اسے ایسا لگا جیسے
کوئی اور بھی ہے جو اس کے ساتھ کام میں شریک ہے۔ ہوسکتا ہے مرحومہ کی روح
ہو۔سفید سفید چادروں کے درمیان اب ایک دھندلکا طاری تھا۔اسے ایسا محسوس ہوا
جیسے ان سفید چادروں سے نکلنے والی دھند نے کمرے کو اپنے حصار میں لے لیا ہو۔
اس نے گھر کی ساری بتیاں بجھادیں۔ہوا میں لہراتے سفید پردے تھے جو دیواروں
پر جھول رہے تھے۔کچھ دیر کے لیے مسیح سپرا زمین پر لیٹ گیا۔اس نے آنکھیں بند
کرلیں اور اچانک اس نے محسوس کیا، ایک عورت نقاب لگائے ہوئے اس کے
کمرے میں داخل ہوئی۔مجومدار نے اس عورت کو موت کا فرشتہ کہا تھا۔سپرا کے
اندر کہیں بھی خوف کا احساس نہیں تھا۔بلکہ وہ آہستہ آہستہ بدبدا رہا تھا۔وہ مردہ گھر
میں ہے۔اور اب اسے اسی حال میں رہنا ہے۔موت ہر حال میں زندگی سے بہتر
ہے۔موت آپ کے اندر سے احساس اور جذبات کا سمندر لے جاتی ہے۔موت
آپ کو بے نیاز اور خوش رکھتی ہے۔مسیح سپرا کو کچھ ایسے جابر اور ظالم حکمراں بھی یاد
آئے جو خود کو زندہ رکھنے کے لیے اور عمر بڑھانے کے لیے عجیب عجیب طریقے اپنایا
کرتے تھے۔برما کا ایک سابق حکمراں ڈولفن مچھلی کا خون پیتا تھا۔ چنگیز خاں کو
جانوروں اور انسانوں کے خون کی مہک پسند تھی۔کچھ ایسے بھی حکمراں تھے جو جوان
اور کنواری لڑکی کو ہلاک کرکے، اس کے لہو سے غسل کیا کرتے تھے۔مسیح سپرا کو
حیرت تھی، ایک بے مقصد اور بدتر زندگی کے لیے خون پینا، غسل کرنا، عیاشی کرنا،
سفر کرنا، آوارہ گردی کرنا، ان مشاغل کی کیا ضرورت ہے....؟ اور اسی لیے پہلے دن
جب مردہ ہونے کا خیال آیا تو اس نے اپنی پرانی خادمہ کو، جو اہلیہ کے انتقال کے
بعد اس کی ضرورتوں کا پورا خیال رکھتی تھی، بلایا اور ڈرائنگ روم میں رکھا ہوا بڑا سا



ٹی وی اور کچھ روپے اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا، اب تم جاؤ اور آج سے، تم
سے جو بھی جسمانی رشتہ تھا، اس کو ختم کررہا ہوں۔ سپرا جانتا تھا کہ یہاں جسمانی
رشتے کا مفہوم وہ نہیں تھا، جو عام طور پر لیا جاتا ہے۔اب وہ ایک مردہ دنیا سے
وابستہ تھا، جہاں رشتے صرف روح کے ہوتے ہیں۔ برسوں پرانی خادمہ نے خوف
سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ جھک کر سر ہلایا۔ ایک آٹو والے کو بلایا اور ٹی وی کا
ڈبہ لے کر چلی گئی۔اب اس گھر میں تفریح کا کوئی سامان نہیں تھا۔ ویسے بھی مردوں
کو تفریح کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔اور سپرا کے لیے یہ خیال کافی تھا کہ وہ مرچکا
ہے اور اس کا زندگی سے ہر طرح کا تعلق ختم ہوچکا ہے۔

بقول مجومدار وہ ایک انجانے جزیرے کا سیاح ہے اور اس کے چہار اطراف
دودھیا نہر بہہ رہی ہے۔ اسے احساس ہوا، باہر کتے رو رہے ہیں اور بلّیاں بھی۔
رونے کی ان آوازوں کا تعلق بھی موت سے ہے اور جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ بلّیاں
اور کتے انسانوں سے زیادہ موت کی آہٹ کو محسوس کرنے کی حس رکھتے ہیں۔ مسیح
سپرا ہر انسانی کیفیات سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔مگر جس وقت وہ لیٹا ہوا تھا اور خود کو
موت کی آغوش میں محسوس کررہا تھا اور اس عورت کو جو موت کا فرشتہ تھی اور نقاب
میں تھی، اس کو بھی قریب سے دیکھ رہا تھا، ٹھیک اسی لمحہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی اور
اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی پرانی خادمہ کو موبائل دینا بھول گیا۔ یہ انسانی تحفہ اسے
آگے بھی پریشان کرسکتا ہے۔ کچھ دیر تک موبائل کی گھنٹی بجتی رہی۔ پھر گھنٹی خاموش
ہوگئی۔ مسیح سپرا کو موت کی ان وادیوں میں بس ایک ہی بات کا خطرہ تھا کہ ریحانہ
کے رشتے دار اس سے ملنے آسکتے ہیں۔ریحانہ، اس کی اہلیہ، جس کی موت ایک ماہ
قبل ہوئی تھی اور جس کے رشتے دار دور دراز علاقے میں کافی تھے۔ یہ رشتے دار کبھی
بھی آسکتے تھے اور اسے موت کی وادیوں سے الگ ایک بیزار، بدمزہ اور خوفناک

زندگی کے تجربوں میں واپس لا سکتے تھے۔ مسیح سپرا نے کروٹ بدلی۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ میز پر موبائل پڑا تھا اس نے موبائل پر یہ دیکھنا ضروری نہیں سمجھا کہ کس نے فون کیا تھا۔ موبائل آف کرنے کے بعد وہ ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گیا۔ سفید سفید چادروں کے درمیان اس وقت وہ ایک مجسمہ تھا اور ریوالونگ چیئر کو ہلانے کی کوشش کررہا تھا اور بلا مبالغہ، ایسا کرتے ہوئے اسے سکون مل رہا تھا، پھر اس نے دیکھا کہ سفید چادروں کے درمیان سے ایک عقاب نکلا اور کمرے میں رقص کرنے لگا۔ وہ جنگلی بھیڑیوں کی آوازیں سننا چاہتا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے کانوں میں بھیڑیوں کے چیخنے کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اب وہ خلا میں سفید گھوڑوں کو اڑتے اور قلابازیاں کھاتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا۔ سفید چادروں سے سفید گھوڑے برآمد ہوئے اور ہوا میں تیرنے لگے۔ اس نے ایک ہالی ووڈ کی فلم میں سفید پروں کو پھیلائے ایک راج ہنس کو دیکھا تھا جو بادلوں کے درمیان اڑ رہا تھا۔ یہ منظر بھی زندہ ہوگیا۔ مسیح سپرا کو خوشی تھی کہ وہ موت کے انجان جزیرے میں داخل ہو چکا ہے اور محیرالعقول واقعات کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے اس نے شیش ناگ کا تصور کیا اور اچھل کر شیش ناگ پر بیٹھ گیا۔ ٹھیک اسی وقت دروازے کی بیل بجی۔ سپرا کو غصہ تھا کہ یہ انسان 'موت' سے جینے بھی نہیں دیتے۔ وہ کرسی سے اٹھا۔ دروازہ کھولا....سامنے دودھ والا تھا۔ اس نے دودھ والے کا حساب برابر کیا۔ اور کہا۔

'اب یہاں کوئی نہیں رہتا۔'

'آپ جات ہو؟'

'اب یہاں کوئی نہیں رہتا۔'

مسیح سپرا نے چیخ کر کہا۔ دودھ والا گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹا پھر سائیکل چلاتا ہوا نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ مسیح سپرا نے دروازہ بند کیا اور دوبارہ ریوالونگ چیئر پر



آکر بیٹھ گیا۔ اسے احساس ہوا، کوئی چیز ہے جو چمک رہی ہے اور جس سے اس کا قریبی رشتہ بھی رہا ہے۔ اُف...اس نے دھیان سے دیکھا۔ پردے کے پاس اہلیہ کی ریڈیم کی تسبیح تھی، مرحومہ تسبیح ہمیشہ اسی جگہ رکھتی تھیں۔ اس سے ان کو سہولت ہوتی تھی۔ زندگی نہیں ہونے کے باوجود اپنی نشانیوں میں یاد رکھی جاتی ہے۔ جبکہ مسیح سپرا کی حقیقت یہ تھی کہ وہ زندگی سے وابستہ ہر شئے، پریشانی کو بھولنا چاہتا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور خود کو ایک نیلی جھیل کے درمیان پایا۔ جھیل میں بطخ تیر رہے تھے اور پھر مسیح سپرا نے کرنل سدھو کو دیکھا۔ کرنل سدھو، جو ایک زمانے میں ان کے ساتھ جاگنگ کیا کرتے تھے۔ فوج سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ گورے چٹے اور کیا جسم پایا تھا۔ لحیم شحیم۔ سب سے زیادہ دلچسپ ان کی باتیں ہوا کرتی تھیں وہ فوج کی بات کم ہی کرتے تھے۔ مستقبل کی باتیں زیادہ ہوا کرتی تھیں۔

مسیح سپرا نے خیال کیا کہ وہ کرنل سدھو کے ساتھ جاگنگ پر ہیں۔ کرنل ٹھہاکے لگا رہے ہیں۔

'ایک بیوی بہت دنوں تک ساتھ نہیں دیتی.... ہا... ہا...'

'پھر کیا کروگے کرنل۔؟'

'مرغابیوں کا شکار کریں گے۔'

'اس عمر میں مرغابیاں ملنے سے رہیں۔'

'ہاہا.... یہ عمر...اصل تو یہی عمر ہے سپرا۔ لڑکیاں اسی عمر پر فدا ہوتی ہیں۔ یہ بات تم کو کون سمجھائے۔'

'پھر شادی بھی کروگے۔؟'

'نہیں یار، لڑکیاں پٹاؤ، عشق لڑاؤ، پتنگیں کاٹو اور بھول جاؤ..... ہاہا...'

مسیح سپرا کو ایک دوسری ملاقات یاد آئی، جس میں کرنل سدھو نے ساتھ ساتھ جاگنگ کرتے ہوئے امرت کور کے بارے میں بتایا تھا۔

’اسے فوجی پسند ہیں۔‘

’یعنی کوئی مل ہی گئی۔‘

’تازہ انار کا جوس ہے۔تم کیا جانو ذائقہ۔‘

’پھر آگے کیا پروگرام ہے۔‘

’دو روز بعد ہم نینی تال جا رہے ہیں۔‘

’امرت کور کے ساتھ....؟‘

’ہاں.... ہاہا....‘

کرنل سدھو نے ٹھہاکہ لگایا۔ اور اس کے ٹھیک دوسرے دن، جب آسمان پر کہرا چھایا تھا۔ دس بجے تک دھوپ غائب تھی، سردی میں بستر چھوڑنا ظلم تھا، موبائل کی گھنٹی بجی اور مسیح سپرا کو فون پر سدھو کے بیٹے نے بتایا، کرنل نینی تال نہیں گئے، بہت دور نکل گئے۔ مسیح سپرا ٹھنڈک کے جان لیوا احساس کو بھول گیا۔ سدھو دو دن بعد نینی تال جانے والا تھا، یہ کیسے ممکن ہے۔؟ دو دن قبل جاگنگ کرتے ہوئے اس کے ٹھہاکے گونج رہے تھے۔ کرنل سدھو کا مسکراتا ہوا چہرہ یاد آ رہا تھا۔ اس عمر میں کہیں بوجھل پن یا تھکاوٹ نہیں تھی، بھرپور زندگی کا احساس تھا۔ بیمار بھی نہیں تھے۔ مگر اچانک... منصوبے دھرے رہ گئے۔ آسمان کی فلائٹ پکڑ لی۔ یہ چور دروازے سے موت کیوں آتی ہے؟ موت پیچھا کرتی ہے بلکہ موت دیکھ رہی ہوتی ہے۔ جاگنگ کرتے ہوئے کرنل سدھو نے بھی موت کو دیکھا ہوگا۔ موت نے ممکن ہے اشارے بھی کئے ہوں گے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ موت سال بھر سے اشارے کرنے شروع کر دیتی ہے۔



سپرا نے کرنل سدھو کے مردہ جسم کو دیکھا— سرد چہرے کو۔ چہرہ بولتا ہوا، جیسے کرنل ابھی ٹھہاکے لگائیں گے۔ سپرا کو پتہ نہیں، وہ ان کے بیٹے سے کیا کیا باتیں کرتا رہا۔ حیرت وخوف نے اس کے الفاظ کو برف بنا دیا تھا۔

’ہاں وہ تھا.....اور موت بھی تھی، جس وقت ہم جاگنگ کر رہے تھے اس نے سیاہ نقاب لگا رکھی تھی اور وہ ایک عورت تھی۔ وہ کرنل کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ لیکن کرنل اسے دیکھ نہیں رہے تھے.....جبکہ میں.....اور یقیناً میری آنکھیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں.....اور ذرا فاصلے پر مرغابیاں تھیں.....‘

کرنل سدھو کے بیٹے نے غصے سے سپرا کی طرف دیکھا۔ پھر وہ کسی کے ساتھ سیاست کی باتیں کرنے لگا۔ ’پنجاب میں ڈرگس کا کاروبار بڑھ گیا ہے۔ پنجاب کی سیاست میں اس کی دلچسپی ہے۔ ڈیڈی کو سیاست پسند نہیں تھی.....اور مرغابیاں.....‘

مرغابیاں کہتے ہوئے پلٹ کر اس نے سپرا کی طرف غصے سے دیکھا۔ سپرا کو دھویں سے بھرے آسمان میں کرنل سدھو کا چہرہ نظر آیا۔ وہ ٹھہاکے لگا رہا تھا۔

کمرے میں ایک چوہا آ گیا تھا.....اور سفید چادروں کے درمیان گھسنے کی تیاری کر رہا تھا۔ مسیح سپرا اٹھا لیکن اس نے چوہے کو بھگانے کی کوشش نہیں کی۔ اسے یقین تھا کہ وہ مرنے کی ریہرسل نہیں کر رہا ہے بلکہ وہ مر چکا ہے اور اس یقین کو پختہ کرنے کے لیے اس وقت اسے بازار کے لیے نکلنا ہوگا۔ یہ ضروری بھی ہے اور ایسا کرنا اس کے یقین کو مضبوط کرنے کے لیے اہم ہے۔ وہ بازار کے لیے نکلا۔ کافی دوڑ دھوپ کے بعد اس کو ایک عورت کا مجسمہ نظر آیا۔ عورت شان سے پتھروں میں لپٹی ہوئی اس طرح کھڑی تھی کہ زندہ معلوم ہو رہی تھی۔ وہ اس مجسمہ کو لے کر گھر آ گیا۔ چادروں کے درمیان اس نے مجسمہ کو رکھ دیا۔ مجسمہ پر سفید چادر لپیٹ دیا۔

سر پر سیاہ نقاب ڈال دیا۔ اب ایک چھڑی کی کمی تھی۔ برسوں قبل اس کا ایک دوست واشنگٹن سے آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ یہ چھڑی سانپ کی طرح آڑی ترچھی تھی اور دیکھنے میں خوبصورت لگتی تھی۔ سپرا وہ چھڑی لے آیا اور چھڑی کو عورت کے ہاتھ میں دے دیا۔ پھر ایک دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ دودھیا چاندنی میں اب وہ عورت موت کا فرشتہ معلوم ہو رہی تھی۔ سفید چادروں کے درمیان کھڑی، جیسے اسے لے جانے آئی ہو۔ وہ اس منظر سے خوش تھا۔ ایک لمحے کے لیے زمین پر لیٹے لیٹے اس نے موسم بہار کا تصور کیا۔ پھر وہ اپنے رفیقوں کی تلاش میں نکلا۔ اس نے چڑیوں کی چہچہاہٹ محسوس کی ....اور خیال کیا کہ جادوگر کے کرشمہ کی طرح آنکھیں بند کرتے ہی اس کا جسم ہوا میں معلق ہوسکتا ہے....اور یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ انجانے جزیرے پر، جہاں موت کے فرشتے کا ساتھ ہوگا، یہ مناظر اس کے ہمراہ ہوں گے اور جیسا کہ ڈاکٹر سدھا کر کہتا ہے، ہم ایک دھند میں رہتے ہیں اور ایک دن یہی دھند ہمارا شکار کر لیتی ہے۔

ڈاکٹر سدھا کر کو یاد کرنا مسیح سپرا کو خاصہ تقویت دے رہا تھا۔ ایک خوبصورت شخص، جس کی باتیں جسم میں گرمی پہنچانے کا کام کیا کرتی تھیں اور جب وہ اپنی آنکھوں سے حیرانیوں کا اعتراف کرتا تو ایک خاص قسم کا چمکتا ہوا ہیرا ہوتا، جو اس کی آنکھوں میں نظر آتا تھا اور اس ہیرے سے روشنی پھوٹتی تھی۔ ڈاکٹر سدھا کر مذہب کو نہیں مانتا تھا بلکہ کسی بھی طرح کے عقیدے کو نہیں مانتا تھا۔ وہ کہتا تھا، ہم ایک بے ڈھب گوشت کے لوتھڑوں کے ساتھ آنکھیں کھولتے ہیں۔ پھر یہ بے ڈھب گوشت کا لوتھڑہ ایک دن مردہ گھر میں کھو جاتا ہے۔

مگر اس دن، جیسا کہ مسیح سپرا کو یاد ہے، ڈاکٹر سدھا کر سیاست کی باتیں کر رہا



تھا۔ بدلتے ہوئے حالات پر اس کی ناراضگی تھی اور وہ ساری دنیا میں آگ لگانے کی باتیں کر رہا تھا۔ اس کی حیرانیوں میں وہ چمکتا ہوا ہیرا مسیح سپرا کو صاف نظر آ رہا تھا۔

’میں نے ایک خطرناک انجکشن تیار کیا ہے۔ یہ ڈرون اور میزائل کی شکل کا ہوگا اور یہ اس شخص کو ہلاک کرے گا جو سیاست کا بدترین مجرم ہے۔‘

’سیاست کا بدترین مجرم؟‘

’اس کے لیے جس نے ہندوستان کو ایک گندے میلے تالاب میں تبدیل کر دیا۔‘

ڈاکٹر سدھا کر ہنسا۔

’تم سائنسداں کب سے ہو گئے؟‘

’ڈاکٹر بھی سائنسداں ہوتا ہے۔‘

’سیاست میں کیوں نہیں جاتے؟‘

’یہی تو مشکل ہے۔ سیاست گندے ریس کا میدان بن چکی ہے۔ یہ ہم لوگوں کے لیے نہیں ہے۔‘

ڈاکٹر سدھا کر مسکرائے۔ ’اب دیکھو، کل کی فلائٹ سے لندن جا رہا ہوں۔ لندن میں ایڈز پر ایک سیمینار ہے۔ گندے لوگ اور گندی سیاست نے ہمیں ایڈز کا تحفہ دیا ہے۔ وہاں سے واپس آ کر تم سے ملتا ہوں۔‘

’کل کتنے بجے کی فلائٹ ہے۔؟‘

’شام کی۔‘

دھند میں سدھا کر کا چہرہ تیرتا ہے۔ سدھا کر لندن سیمینار کا حصہ نہیں بن سکا۔ صبح ہارٹ اٹیک ہوا۔ لندن کی جگہ عدم آباد پہنچ گیا۔ صبح ہی صبح ڈاکٹر کستوری نے موبائل پر یہ خوفزدہ کرنے والی خبر سنائی۔ وہ سنتا رہا۔ سپرا کی آواز کہیں کھو گئی تھی، چہرہ

سرد تھا، جسم بھی، کافی دیر تک وہ موبائل تھامے رہا۔ جب تک کستوری کی آواز گم نہیں ہوگئی۔ یہ کیسے منصوبے ہیں؟ کرنل ڈیٹس پر جانے والے تھے۔ ڈاکٹر سدھاکر لندن۔ منصوبے میں جھول آ گیا تھا۔ جھول میں نقاب والی عورت۔ ایک رات۔ کچھ لمحے۔ لیکن ڈاکٹر سدھاکر نہیں جانتا تھا کہ صرف کچھ گھنٹوں کے بعد کیا ہونے والا ہے۔

اس دن وہ آخری تماشے کا حصہ نہیں بنا....اس دن وہ دیر تک سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا۔ اسے یقین تھا کہ یہ گاڑیاں جو سڑکوں پر دوڑ رہی ہیں، ابھی اچھال لیں گی اور ایک دوسرے سے ٹکرا کر بکھر جائیں گی۔ یہ لوگ جو سڑکوں پر چل رہے ہیں، یہ گھر جانے سے قبل ہی موت کو پیارے ہو جائیں گے۔ اس دن وہ گھر لوٹا تو ریحانہ اور اپنے کاشف کو حیرت سے دیکھا۔ اس دن آخری بار اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ مثال کے لیے اس نے کاشف سے پوچھا....

’تو تم ہونا.....؟‘

’ہاں پاپا کیوں.....‘

’نہیں۔ کچھ نہیں۔ تم ہو اور یہ میرے لیے مزے کی بات ہے۔‘

یہی سوال اس نے ریحانہ سے کیا۔

’تو تم ہونا.....؟‘

’کیوں؟‘

’پتہ نہیں۔ میری تسلی نہیں ہوئی۔‘

’یعنی میں نہیں ہوں؟‘

’ہوسکتا ہے۔‘

ریحانہ نے مسیح سپرا کو عجیب نظروں سے دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ’تو آج تم نے پھر



سے بلڈ پریشر کی دوا نہیں لی۔‘

’بھول گیا۔‘

’بھولا مت کرو۔ اس دوا میں ایک جنگلی بلی ہوتی ہے، جو تمہیں تھپکیاں دے کر نارمل کر دیتی ہے۔‘

’جنگلی بلّی۔‘ سپرا زور سے ہنسا۔

ریحانہ دبلی پتلی سی عورت تھی۔ شادی کے بعد بھی اور کاشف کی پیدائش کے بعد بھی اس میں ذرا سی بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس کی آنکھیں گہری تھیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی ذات مکمل طور پر ریحانہ پر منحصر تھی۔ ناشتہ، کھانا، دوا، یہاں تک کہ باہری خرید وفروخت کے لیے بھی ریحانہ نے کبھی اس کو پریشانی میں نہیں ڈالا۔ عام طور پر اس کا چہرہ سپاٹ رہتا تھا اور اندازہ لگانا مشکل ہوتا تھا کہ کس وقت وہ کس فکر میں غوطہ زن ہے۔ کاشف اٹھارہ کا ہوگیا تھا اور اب سپرا کو کاشف کے کیریر کو لے کر فکر ہو رہی تھی۔ کاشف موٹر سائیکل تیز چلاتا تھا اور کئی بار سپرا نے کاشف کو تیز چلانے سے روکنے کی کوشش بھی کی تھی۔ ڈاکٹر سدھاکر کے جانے کے بعد ٹی وی اینکر سمیتا میں اس کی دلچسپی بڑھی تھی۔ یہ ملاقات بھی اچانک ہوئی تھی انڈیا انٹرنیشنل کیفے میں، جہاں وہ ہندوستانی سیاست کو لے کر ایک سابق سیاستداں سے کچھ سوال کر رہی تھی۔ سپرا، انڈیا انٹرنیشنل کا ممبر تھا۔ سمیتا میں اس کی دلچسپی پیدا ہوئی۔ اچانک سمیتا نے اس کی طرف دیکھا۔ پھر چونک گئی۔

’آپ......؟‘

’تو آپ مجھے جانتی ہیں؟‘

سمیتا کھلکھلا کر ہنسی۔ ’سیاست میں سو سال بھی کم ہوتے ہیں۔ یہاں سب کو جاننا ہوتا ہے۔ ایک چھوٹی سی بائٹ دیں گے؟‘

’کیوں نہیں۔‘

اب سمیتا نے مائک کا رخ سپرا کی طرف کردیا۔

’حکومت کے اچھے کاموں کی تعریف میں کچھ لوگ بخالت سے کیوں کام لیتے ہیں؟‘

سپرا کو ہنسی آئی۔’آپ نے جارج آرویل کا ۱۹۸۴ پڑھا ہے؟‘

’ہاں۔‘

’تعریف بدل دیجیے۔‘

’مطلب؟‘ سمیتا چونکی۔

’اچھے کو برا بنا دیجیے۔ بُرے کو اچھا۔مثال کے لیے چنگیز اور ہلاکو اچھے لوگ تھے،سمیتا مسکرائی۔’تعریف بدلنے سے کیا ہوگا؟‘

’پھر آپ یہ سوال نہیں پوچھیں گی۔‘

اس دن سمیتا نے ساتھ بیٹھ کر کافی شیئر کی۔دوبارہ ملنے کا وعدہ کیا اور انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں اس سے ملاقاتوں کا سلسلہ طویل ہوتا چلا گیا۔

سپرا نے ایک ملاقات کے دوران پوچھا۔

’تم نے شادی کیوں نہیں کی؟‘

’پہلے ایک فلیٹ خریدنا چاہتی ہوں۔‘

’اسی لیے حکومت کی چاپلوسی ہورہی ہے۔؟‘

’ہاں،‘ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔اس کے دانت موتیوں کی طرح سفید تھے اور سفید موتیوں سے الفاظ آبشار کی طرح بہتے تھے۔

’نہیں کروں گی۔تو پیسے تم دوگے؟‘

’سپرا مسکرایا۔‘



’دودن بعد ہی ایک فلیٹ بُک کررہی ہوں۔پھر شادی۔‘

’فلیٹ دیکھ لیا۔؟‘

’ہاں۔گریٹر نوئیڈا میں ہے۔ خوش ہوں کہ اب اپنے فلیٹ میں چلی جاؤں گی۔‘

سمیتا نے بتایا کہ ایک خبر کے لیے آج شام وہ دہرادون جاری ہے۔کل صبح واپس ہوگی۔ٹیم کے ساتھ جارہی ہے۔‘

’میں تمہارے نئے فلیٹ میں تم سے ملنے آؤں گا۔‘

’ضرور۔‘

سمیتا کے جانے کے بعد مسیح سپرا باہر آیا۔دیر تک دیواروں پر آویزاں پینٹنگس کو دیکھتا رہا۔آسمان پر پرندوں کا ایک ہجوم جارہا تھا۔ایسے مناظر اسے پسند تھے۔ اس نے ایک خوشحال زندگی گزاری تھی۔ باہر گاڑیاں مسافروں کو اتار کر آگے بڑھ رہی تھیں۔ سپرا کو آنکھوں کے آگے دھند کا احساس ہوا۔اسے یقین تھا، خالی وقت میں یہ لوگ موسیقی بھی سنتے ہوں گے، ہوٹل میں بیٹھ کر شراب بھی پیتے ہوں گے۔ عیاشیاں بھی کرتے ہوں گے۔معصوم لوگ، جو بہت زیادہ آگے یا مستقبل کی فکر کرتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ ایک دن دھند میں آسمان اور نہ ختم ہونے والی فصلیں بھی گم ہوجاتی ہیں۔کیا یہ ایک واہیات دن تھا یا خوشیوں بھرا دن کہ سمیتا کے ساتھ کچھ لمحے گزارنے کا موقع ملا تھا۔لیکن جس وقت سمیتا اس کے پاس سے اٹھ کر جارہی تھی، مسیح سپرا کو احساس ہوا کہ ہوا میں معلق ایک صلیب ہے،جس پر موٹی موٹی کیلیں ہیں اور ان کیلوں میں سمیتا جھول رہی ہے۔یہی لمحہ تھا جب اس کے چہرے پر جھریاں پیدا ہوئیں اور اسے اپنے چہرے کی جلد کے سرد ہونے کا احساس ہوا۔جہاں پر وہ کھڑا تھا، اس سے کچھ دوری پر دوعورتیں تھیں جو مچھلی کے شکار کی

باتیں کر رہی تھیں اور ایک بوڑھا شخص دیوار سے لگا کھڑا تھا جو ایک نوجوان کو اپنی عشق کی داستان سنا رہا تھا۔ مسیح سپرا کو احساس ہوا کہ عشق و محبت کی داستان کے درمیان صلیبیں آ جاتی ہیں اور مچھلیاں کیلوں میں پھنس جاتی ہیں۔ پھر یہی عورتیں نگاڑے ڈھول کے درمیان جنگل میں مناسب جگہ تلاش کر کے بھنی ہوئی مچھلیوں کا ذائقہ لیتی ہوں گی.....انڈیا انٹرنیشنل کے دروازے سے باہر نکل کر اس نے ایک پولیس والے کو دیکھا جو ہتھکڑیاں لگائے ایک قیدی کو ساتھ لیے جا رہا تھا اور مسکرا مسکرا کر اس سے بات بھی کر رہا تھا۔ کہیں نہ کہیں زندگی کی رمق موجود ہے۔ تنہائی میں، احساس جرم میں، قید خانے کی گھٹن میں اور جنگل کی وادیوں میں۔ اس دن گھر پہنچنے کے بعد ریحانہ نے اس کے چمکتے دمکتے چہرے کو دیکھ کر پوچھا تھا۔

'شکار کیا؟'

'کس کا؟'

'مچھلیوں کا۔؟'

'اب یہ عمر مچھلیوں کے شکار کی نہیں رہی۔'

'جھوٹ۔ مچھلیاں اس عمر میں بغیر کانٹے کے بھی پھنس جاتی ہیں۔'

'یہ تمہارا تجربہ ہے؟'

'تمہارے تجربے سے ایش ٹرے بناتی ہوں۔'

'پھر ایش ٹرے میں راکھ کس کی ہوتی ہے؟'

'تمہارے اندر کی خواہشوں کی۔ ان میں سگریٹ سے زیادہ کاربن ہوتا ہے۔'

'سگریٹ کی مہک آ رہی ہے۔؟'

'باہر کوئی قیدی پی رہا ہوگا۔ ایک تم بھی جلا لو اپنے لیے۔'



اس رات خواب میں صلیبیں دوبارہ روشن ہوئیں۔ پھر اس نے آگ کے بڑے بڑے تندور دیکھے جہاں مچھلیوں کو بھونا جا رہا تھا۔ اس نے اس بوڑھے کو بھی دیکھا جو اپنی خادمہ کے ساتھ ہم بستری کر رہا تھا.....اور جب صبح اس کی آنکھ کھلی تو کھڑکی کے باہر کا آسمان سیاہ تھا اور ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ بارش کی موسیقی کے مزے لیتا، موبائل کی گھنٹی نے خیالوں کے بنتے ابھرتے سلسلے کو روک دیا۔ اسے خبر ملی کہ دہرادون سے واپس آتے ہوئے کار ایکسیڈینٹ میں سمیتا اور تین لوگوں کی موت ہوگئی۔ سمیتا واپسی کے بعد اپنے فلیٹ میں جانا چاہتی تھی۔ شادی کرنا چاہتی تھی۔ وہ کل تک تھی مگر اب نہیں تھی... صلیبیں، کیلیں... بارش...اب وہ کچھ نہیں دیکھ سکتی۔

دھند میں اب ایک نورانی گھوڑا تھا جس کو کافی عرصہ پہلے مسیح سپرا نے ایک جیل کے برآمدے میں دیکھا تھا جب وہ بیرکوں اور کچھ قیدیوں کے معائنہ کے لیے گیا تھا۔ وہی اسپ نورانی اس وقت اس کی نگاہوں کے سامنے تھا اور نظروں میں وہ بزرگ قیدی تھے جو اب زندگی سے تھک چکے تھے۔ مسیح سپرا نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ کوئی جنبش نہیں۔ لیٹے لیٹے اس نے پاؤں اٹھانے کی کوشش کی مگر محسوس ہوا، پاؤں اکڑ چکے ہیں۔ اس نے سر ہلانے کی کوشش کی تو اس کوشش میں بھی ناکام رہا۔ دھند میں سفید چادروں کے درمیان نقاب والی عورت سامنے تھی۔ سپرا کو احساس ہوا، اس عورت نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا ہے.....اور اب وہ اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔

اور جب راتیں چاند پر مہربان تھیں کہ چاند ستاروں کے درمیان اٹکھیلیاں کرتا ہوا نیلگوں آسمان کے درمیان یوں تیر رہا تھا جیسے بدمست مجذوب ہو یا نشے کی حالت میں دنیا و مافیہا سے بےخبر شرابی یا پھر وجد کی وادیوں میں رقص کرتا ہوا صوفی یا پھر آسمانی چادر پر اڑتا ہوا پرندوں کا ہجوم اور مسیح سپرا نے دیکھا کہ ایک پرانی

عمارت ہے اور اس شہر میں ہے، جسے بندروں نے گھیر رکھا ہے۔وہ زیر لب بڑبڑایا۔شرارتی بندر—اوراس کے بعد اسے کچھ بھی یاد نہیں رہا۔

(3)

## خانہ بدوشوں کا مقدمہ

وہ تعداد میں کئی تھے اور انہیں جاننے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ الگ الگ شہروں سے جمع ہوئے تھے اوران میں ایک تھا جوخود کو مارخیز کے شہر کا خانہ بدوش کہتا تھا اور یہ بھی کہ سوسال کی تنہائی میں اس نے اس بوڑھے کوطوطے کا تحفہ دیا تھا جو انسانی آواز میں بولنا جانتا تھا—اور یہ وہ شخص تھا،جس کے سر کے بال نہیں تھے۔چہرے کا رنگ گورا تھا—اوراس وقت جوبھی خانہ بدوش تھے، وہ ان سب سے زیادہ پڑھا لکھا تھا اور زیادہ انسانوں جیسی باتیں کرسکتا تھا جبکہ ان میں وہ بھی تھے جوابھی بھی سرخ گرم آگ پرچھریاں تیز کررہے تھے۔ان میں وہ بھی تھے جن کے ہاتھوں میں ترشول تھے اور ان خانہ بدوشوں میں ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنے اپنے ہاتھوں میں ایک ایک اینٹ سنبھالی ہوئی تھی۔اینٹ کسی اچھی بھٹی سے نکالی ہوئی تھی۔اس لیے اینٹیں بھری بھری نہیں تھیں بلکہ سخت تھیں اور ان پر ہندی میں کچھ لکھا ہوا تھا،



جسے آسانی سے پڑھا جاسکتا تھا۔ان میں کوئی بھی قطار کا مطلب نہیں جانتا تھا اور یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ وحشت کی تہذیب کو لے کر اس ہال میں جمع ہوئے تھے،جس کی دیواریں بے رونق تھیں۔دروازہ ٹوٹا ہوا تھا اور دروازے کے بعد دور تک گھاس اُگی ہوئی تھی۔اور گھاس پر اس وقت بھی گائیں آرام سے گھوم رہی تھیں اور جس وقت مندر سے بھجن کی آواز آئی، خانہ بدوشوں میں سے پانچ شخص ایسے تھے جنہوں نے گردن میں لپٹے ہوئے رومال کو نکالا اور پیشانی پر باندھ لیا۔ اب وہ پوری طرح سے لچے اور شہدے نظر آرہے تھے اور کمال یہ کہ خود کو اس حالت میں محسوس کرکے وہ خوش تھے کہ زندگی کی بدلی ہوئی تعریف میں اب یہی تعریف ایسی تھی، جس کے ذریعہ خانہ بدوش کی زندگی کو ایک نئی سیاسی زندگی میں تبدیل کیا جاسکتا تھا۔ غارت ہو اس سیاہ روشنی کا کہ بھجن کے دوران ہی پاس کی کسی مسجد سے اذان کی آواز آنی شروع ہوئی۔بوڑھا، جوانسانی آواز میں بولنا جانتا تھا، اس وقت اس کے تیور بدل گئے تھے اور وہ ایسی آواز میں باتیں کررہا تھا، جیسے وہ بھیڑیوں کے منہ سے نکلی ہوئی آوازوں کے مطلب سمجھتا ہو۔اذان کی آواز ختم ہونے کے بعد اس نے بھیڑ کی طرف دیکھا۔اور مسکرایا۔اس کی باتوں کا جواب دینے والے کئی خانہ بدوش تھے۔ اس وقت جن کے ناموں کا جاننا ضروری نہیں۔جن کی شناخت خانہ بدوش کے طور پر ہی تھی اور جو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ یہاں کس لیے اکٹھا ہوئے ہیں۔مگر وہ خوش تھے کہ نئے موسم میں اوراس نئی صبح میں ایک نئے کھیل کی شروعات ہونے والی ہے اور ان سب کے پیچھے وہ بوڑھا ہے، جسے خود پر ضرورت سے زیادہ یقین ہے اور جوطوطے کی طرح اس بات کوفراموش کر گیا ہے کہ زیادہ یقین سے آپ کیڑے لگی ہوئی گیلی لکڑی کی طرح کھوکھلے ہوجاتے ہیں اور ایک ایسے خانہ بدوش میں تبدیل ہوجاتے ہیں جس کے لیے صرف رحم کے الفاظ رہ

جاتے ہیں۔ وہ خوش تھا کہ وہ اپنی ذات کے جنوں خانے سے نکل کر اس قبیلے کا حصہ بنا تھا، جسے ’گھومنتو‘ قبیلہ کہا جاتا ہے۔ اور اس قبیلے کو اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ شعوری فکر کے روزن میں روشنیوں کو آنے دیں۔ روشن خیال وافکار کی دھوپ جمع کریں۔ کیونکہ جب مرغابیاں گاتی ہیں تو سازندے اس گیت کے سُر میں سُر ملاتے ہیں۔ پھر جو نغمہ گونجتا ہے وہ کمزور ذہنوں کی آبیاری کرتا ہے اور اس لیے خانہ بدوشوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ مذہبی عبادت گاہوں پر چڑھ جائیں ۔ اینٹ سے اینٹ بجادیں اور خانہ بدوشی کی تعلیمات میں نئے علم کا اضافہ کریں کہ دو اور دو مل کر ایک سو بیس کروڑ بھی ہو سکتے ہیں۔اس وقت بوڑھا مارخیز کی سو سال کی اداسی کے صفحات سے نکل کر ان چراغوں کو دیکھ رہا تھا جن کی ٹمٹماہٹ وقت کے ساتھ کمزور پڑ گئی تھی اور ایک دن ایسا بھی آیا جب سیاسی دیے بجھ گئے۔ان دیوں میں روشنی کا فقدان تھا۔ان دیوں میں تیور نہیں تھے، خانہ بدوش نہیں تھے۔ پتھر پھینکنے والے اور پتھر سنبھال کر رکھنے والے اور غیض وغضب سے پیدا شدہ نسل کو ہر طرح کی فکر سے محروم کرنے والے اور خانہ بدوش نسل میں قبیلے کی قدیم لڑاکو تہذیب کے جراثیم رکھنے والے اور اپنی چنگیزی طبیعت سے ایک مخصوص طبقے کو غلام بنانے والے اور اسی لیے ۱۹۲۵ کے دھندلے آسمان سے، آسمانی اور دھارمک منتروں کے ذریعہ قبیلہ نے وِش کا پیالہ حاصل کیا تھا اور بوڑھے کو امید تھی کہ وِش کا پیالہ پیتے ہی طوطے کی جان چلی جائے گی مگر سمندر منتھن کی طرح اس بار فتح دیوتاؤں کے حصے میں نہیں آئے گی بلکہ فاتح راکشش ہوں گے کہ ایک طبقے کو غلام کرنے کے لیے کبھی کبھی راکشش کی پناہوں میں بھی جانا پڑتا ہے۔لہٰذا بنجاروں کو اجازت دی گئی کہ وہ مہینوں جانوروں کے ساتھ رہیں اور اپنا وقت جنگل میں گزاریں اور خطرناک جانوروں کی بولیوں کو ازبر کریں کہ مستقبل قریب میں ان آوازوں سے فائدہ اٹھانا



ہے۔ بانسری، طبلے، ہارمونیم، تنبورے کے سریلے راگوں میں درندگی کی موسیقی کا سُر پیدا کرنا ہے۔ اور اسروں (راکھشس) کی جماعت میں شامل ہو کر ملک کو آزاد کرنا ہے۔ اس لیے گھروں کو مقفل کر کے مذہبی عمارت سے اینٹیں لے کر قومی سلامتی کی راہ پر آگے بڑھنا ہے اور طوطے سے بچے وِش کو ساتوں سمندر، دریاؤں، پہاڑوں پر اچھال دینا ہے۔

بوڑھے کے دماغ میں اس وقت بھی سیٹیاں بج رہی تھیں جب سورج کا گولہ گرم ہونے کی تیاری کر رہا تھا اور اپنی اگنی شعاؤں سے دسمبر کی برف کو پگھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاریخ کے تناظر میں ہم قدیم خانہ بدوش ٹھہرے مگر ملا کیا؟ جب ملک کی ہوا سہ رنگی پرچم میں رنگ بھرنے کی تیاری کر رہی تھی کچھ سریلے فنکار، فلاسفر اور تاریخ داں بوسیدہ دیواروں پر بجھی ہوئی راکھ سے آزادی اور سیکولرزم کے نعرے کو لکھ رہے تھے۔ خانہ بدوش حیران کہ یہ رنگ مٹے نہیں تو جبر یہ طاقت اور ذہن کیسے پیدا ہوگا۔؟

ایک خانہ بدوش نے دریافت کیا۔’ماچس ہے۔؟‘

’نہیں۔مگر تیلیاں ہیں۔‘

’تیلیاں آگ پکڑیں گی؟‘

’تیلیاں نقشوں کو جلانے میں ماہر ہیں مگر تیلیوں کو گرم پتھروں سے رگڑ کر چنگاری پیدا کرنی ہوگی۔‘

’کیا چنگاری سے چھریاں تیز ہوں گی؟‘

’ترشول بھی؟‘

’کیا مذہبی عمارت پر چڑھنے میں مدد ملے گی؟‘

’اگر پیسے ملتے ہیں تو ہم خانہ بدوش پجاری بن جائیں گے۔‘

بوڑھے کو ہنسی آئی۔ وہ ان خانہ بدوشوں کی باتیں سن رہا تھا۔ اور یہ کہ اسے ماچس کی تیلیوں میں آگ کا سمندر نظر آرہا تھا اور وہ خوش تھا کہ آگ کے سمندر سے اس وقت چیخیں نمودار ہورہی تھیں اور وہ ان چیخوں میں موسیقی تلاش کررہا تھا۔ اس نے پھر ان خانہ بدوشوں کی طرف دیکھا جنہوں نے اپنی پیشانی کو سرخ رومال سے باندھ رکھا تھا اور ان کے کھلے دانت پیلے تھے اور ان میں کیڑے لگے ہوئے تھے۔

’کیا ہمارے رسم ورواج عجیب نہیں تھے؟‘

’تھے۔‘

’ہماری طرز زندگی، ہماری زبان.....؟‘

’ ن میں اخروٹ کی سختی شامل تھی اور چھریوں کی دھار۔‘

’ہم ننگے رہتے تھے اور جسم پر نقش ونگار بناتے تھے۔‘

’اور یہ باتیں ہمیں گندے تہذیبی لوگوں سے دور رکھتی تھیں۔‘

’لکڑی اور گھاس پھوس کے گھر ہوتے تھے۔ زمین میں بڑے بڑے کندے نصب کرتے اور دوسروں کی جھوپڑیوں میں رات کے وقت آگ لگادیتے۔‘

’خانہ بدوشی کا اپنا ذائقہ ہے۔‘

’کیا ہم دسمبر کے بارے میں سوچ سکتے تھے؟‘ ان میں سے ایک نے پوچھا جو ابھی تک ایک بڑے سے چھرے کو پتھر پر رگڑ رہا تھا۔

’دسمبر، جہاں آگ روشنی دیتی ہے۔ کدال اور پھاوڑے گنبدوں کو ڈھادیتے ہیں اور پرندے آسمانوں میں چھپ جاتے ہیں۔‘

’خوب......دسمبر‘ اور بوڑھے نے فرض کیا کہ اس کے ہاتھ میں بھی ایک اینٹ ہے، جس پر سنسکرت زبان میں کچھ لکھا ہوا ہے۔ کاش وہ سنسکرت کی سمجھ رکھتا۔ مگر اس نے اپنے لیے یاترائیں چنیں۔ تیرتھ یاترا۔ رتھ یاترا۔ رتھ یاترا اور دسمبر،



جب کہرے آسمان پر چھا جاتے ہیں اور رتھ یاترا کے ٹائر اس طرح گھومتے ہیں اور ناچتے ہیں جیسے سفید گھوڑے آسمانوں پر رقص کررہے ہوں۔ جب رات کو ٹمٹماتے دیے بجھ رہے تھے، وہ خانہ بدوشوں کو جمع کررہا تھا اور یہ خانہ بدوش پورے ملک کے جنگلوں سے آئے تھے۔ یہ مہذب دنیا کے بارے میں زیادہ تفصیلات نہیں جانتے تھے۔ یہ پتھروں سے آگ نکالنا، جھوپڑیوں کو جلانا بخوبی جانتے تھے۔ یہ ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہتے تھے اور انسانی رشتوں کی پہچان نہیں رکھتے تھے۔ ایسا قدیم زمانے سے چلا آرہا تھا اور بوڑھے نے ایک بار انڈومان کے جزیرے میں ان قبائلیوں کو دیکھا تھا جو ننگے رہتے تھے اور خوب ہنستے تھے۔ بوڑھے نے ان قبائلیوں کے ساتھ رقص بھی کیا تھا اور بتایا تھا کہ حضرت نوح کی طرح وہ بھی ایک کشتی کی تعمیر کررہا ہے مگر یہ رتھ ہوگا اور یہاں جنگلی سور ہوں گے جن کی چمڑیاں سخت ہوں گی اور جو گندے کیچڑوں میں لوٹتے ہوں گے۔ انڈومان کے روایتی قبیلے والوں نے بتایا کہ ایسے بے شمار سور ان کے پاس ہیں، جن کا شکار وہ تیر بھالوں سے کرتے ہیں۔ پھر پتھروں سے آگ جلا کر سوروں کو بھون کر جشن مناتے ہیں اور بوڑھے نے کہا تھا، اب ان سوروں کو جلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ انھیں بھی ہتھیار دینے کی ضرورت ہے۔ ہم تمہیں ان سوّروں کے لیے مناسب رقم دیں گے۔ بوڑھے کو یقین ہے کہ اس ہجوم میں انڈومان کے قبائلی بھی ہوں گے، کیونکہ ان خانہ بدوشوں میں بہت سوں کے پاس لباس نہیں تھے مگر ہاتھوں میں اینٹیں موجود تھیں۔

وہ عمارت کے سب سے بدنما کمرے میں کھڑے تھے اور ایک عجیب سی بدبو تھی جو ماحول میں پیدا ہورہی تھی اور ممکن ہے کہ یہ بدبو ان خانہ بدوشوں کے جسم سے آرہی ہو، جنہوں نے پسینہ بہا کر مذہبی عمارت کے گنبد کو زمین میں دفن کردیا تھا۔ آسمان سے پرندوں کا قافلہ اس طرح رخصت ہوا، جیسے اب کبھی واپس نہیں

آئے گا۔ بوڑھے کو تاہم اطمینان ہے کہ اسے تمام اختیارات حاصل ہیں اور اس وقت خانہ بدوشوں کے درمیان اس کی حیثیت کسی راجہ یا مکھیا کی ہے، جس کے آگے سب کو سر جھکانا ہے۔ اس نے کٹورے سے پانی پیا اور اس لیے پیا کہ چلّاتے شور کرتے ہوئے اس کی زبان بیٹھ گئی تھی۔ گلے سے گھڑگھڑانے کی آواز آرہی تھی اور مذہبی عمارت کی اونچی چوٹی پر دیر تک رہنے کی وجہ سے اس کے قدموں میں نقاہت آگئی تھی۔ اس نے خانہ بدوشوں کی گفتگو کا رُخ قدیم زمانے سے آج کی تاریخی فتح تک موڑنے کی کوشش کی مگر سب کے سب ایسے ترشول لہرا رہے تھے جیسے بھالو اور خنزیروں کا شکار کرنے آئے ہوں۔ ان کے جسم توانا تھے اور بوڑھے کو یقین تھا کہ آج کے بعد اس کی عظیم الشان کامیابی کے درمیان محض چند قدم کا فاصلہ رہ گیا ہے۔ اس کے بعد مرغابیاں جھیلوں پر اتریں گی اور روش کا نغمہ سنائیں گی۔ وہ اچانک چونکا، جب اس نے ایک خانہ بدوش کی آواز سنی۔ اس خانہ بدوش کے ساتھ کئی دوسرے خانہ بدوش بھی کھڑے تھے۔

'تو تم اس وقت رو رہے تھے۔'

'ہاں۔'

'مگر کیوں؟'

'میں نے پنکھوں والے ایک فرشتہ کو دیکھا جس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔'

'سب غارت۔ فرشتہ کہاں سے آگیا؟'

'اس کے دوسرے ہاتھ میں چاقو بھی تھا۔'

'....اور یقین ہے، تیسرا ہاتھ نہیں ہوگا۔'

'اور تم اس لیے روئے کہ فرشتہ کے ہاتھ کی لالٹین بجھ گئی تھی؟'

'نہیں۔ تیز ہوا کے باوجود جل رہی تھی۔ بلکہ لالٹین کے اندر سے شعلے نکل



رہے تھے۔'

پہلے نے گھور کر دیکھا۔ 'کیا تم اقبال جرم کر رہے ہو؟'

'نہیں۔ اس نے کندھے اُچکائے۔ اس وقت میرے ہاتھ میں ایک کدال تھی اور میں فرشتہ کا سر قلم کرنا چاہتا تھا۔'

'اوہ..... ویسے تم اس قابل نہیں تھے۔ تم نے چار گھنٹے میں صرف چار اینٹیں جمع کیں۔ اور پائجامہ کو بہت حد تک گیلا کر دیا۔

بوڑھے کو ہنسی آئی اور ہنسی اس بات پر آئی کہ جس وقت وہ گنبد تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا، ایک سیال اس کے پیٹ کے نیچے جمع ہو رہا تھا۔ اس نے چپ چپاہٹ محسوس کی اور یقین کیا کہ اس کا پیشاب رواں ہو گیا ہے جو اکثر جوش جوانی میں ہو جاتا ہے۔ جسم میں رتھ یاتراؤں کی تھکاوٹ اب بھی موجود تھی اور جشن مناتی وہ بھیڑ بھی اب بھی نظروں میں گھوم رہی تھی کہ بوڑھے نے اپنی زندگی میں ایسی کسی بھیڑ کا تصور نہیں کیا تھا۔ سارے ہندوستان میں گھومتے ہوئے رتھ کا پہیہ ایک ایسے علاقے میں جام ہوا، جس کے بارے میں وہ جانتا تھا کہ یہاں سوروں کے شکار ہوتے ہیں اور یہاں کی زمین پتھریلی ہے۔ یہاں گنوار، دیہاتی مگر پڑھے لکھے لوگ رہتے ہیں جو اب بھی تہذیبی زبان سے واقف ہیں اور اس خطے میں اتنے گڑھے ہیں کہ رتھ کا پہیہ کسی وقت بھی اچھل کر رتھ سے نکل سکتا ہے یا رتھ کے پہیے پتھریلی زمین پر جام ہو سکتے ہیں۔ اسے یہ بھی خیال تھا کہ اگر پہیے اس خطے یا علاقے میں جام نہیں ہوتے تو اسے کامیابی نہیں ملتی۔ کیونکہ خانہ بدوش جماعت ناراض تھی اور غصے میں ترشول لہراتی ہوئی اس بات کو فراموش کر گئی تھی کہ بوڑھا تھک چکا ہے اور واپس دارالسلطنت لوٹنا چاہتا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر خون کی پپڑیاں جمی تھیں کیونکہ دو بار رتھ کے پہیے

ایسے اچھلے کہ اس کا سر رتھ کی پشت سے ٹکرایا اور کمزور دانتوں نے ہونٹ کو زخمی
کر دیا۔ اس نے خفیف سی جھرجھری لی کہ وہ گر بھی سکتا تھا اور گرنے کی صورت
میں اس کی موت بھی ہو سکتی تھی۔ بوڑھے کو اس بات کا گمان تھا کہ وہ صفر سے
طلوع ہوا اور رتھ کی کمان تھام کر ان خانہ بدوشوں کا امیر کارواں بن گیا۔ اس
نے سنا۔ وہاں کچھ خانہ بدوش اور بھی تھے، جو اب سیاست کی اولادوں میں
سے تھے اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ پسند نہ کرنے کے باوجود یہ لوگ اس کے پیچھے
پیچھے چلنے پر مجبور تھے اس نے کان لگایا اور ان کی باتوں پر دھیان دیا۔

’کیا اینٹیں نرم تھیں؟‘

’نہیں۔ اس میں سے انسانی خون کی بو آ رہی تھی۔‘

’اور تم نے ڈھانچے پر چڑھتے ہوئے ایک گارڈ کو مکّا مارا تھا‘

’مجھے وہ عمارت کی نگرانی کرنے والا معلوم ہوا‘

’جبکہ وہ بھی خانہ بدوش تھا اور بوڑھے کا قریبی۔‘

’یہ بوڑھا ان خانہ بدوشوں سے کیا کام لے گا؟‘

’وہ اپنی سلطنت بنائے گا۔‘

’لیکن اس سے قبل گماں آباد کے خانہ بدوش اسے چپ کرا دیں گے۔‘

’کیا تم تقدیر کو مانتے ہو۔؟‘

’نہیں۔ رتھ کو۔ مذہبی عمارت کو اور وحشتوں کو۔‘

’وحشتوں نے ہر دور میں ہمارا ساتھ دیا ہے۔‘

’اور اس بار بھی وحشتیں ساتھ دیں گی۔‘

بوڑھے نے اطمینان سے ان کی باتیں سنیں اور اسے پہلے سے علم تھا کہ ان
میں اکثریت ایسے لوگوں کی بھی ہے، جو ابھی بستروں پر سیاہ حبشی کو بھی اپنے ساتھ



سلالیں۔ مگر ان میں آپس میں بھی اختلاف ہے اور یہ لوگ کسی حد تک اس کی
شہرت اور مقبولیت سے بدگمان بھی ہیں۔ مگر وہ رتھ لے کر کافی دور نکل چکا تھا اور
جہاں نکل آیا تھا، وہاں پتھر سخت تھے، دریا اونچائی پر تھا اور دسمبر کے زمانے میں
زمین برف سے ڈھک چکی تھی۔ مشرق سے نکلتے ہوئے سورج کا گولہ ٹھنڈا تھا اور
بوسیدہ دروازے کے باہر لوگوں کا ہجوم اس کا منتظر تھا۔ وہ تاریخ اور اپنے قریبی
دوستوں کا شکر گزار تھا جنہوں نے سنبھل کر، آگے بڑھ کر مذہبی عمارت کا قفل کھولا
تھا۔ پھر انہی دوستوں نے آگے بڑھ کر پتھر کے مجسمہ کو اس عمارت میں منتقل کیا
تھا۔ لیکن منتقل کرتے ہوئے اور قفل کھولتے ہوئے وہ اس فن سے واقف نہیں تھے،
جس سے وہ واقف تھا۔ اور اب آسمان سے زمین تک سارا نظارہ اسے سرخ نظر
آ رہا تھا۔ اس سرخی سے اسے زعفران پیدا کرنا تھا اور ملک بھر میں زعفران کی کھیتی
کرنی تھی۔ وہ ہجوم کے قریب آیا۔ چیختے چلاتے، جوشیلے قبائلیوں کو دیکھا۔ اس کے
کمزور ہاتھوں میں جنبش ہوئی اور اس نے نرم لہجہ اختیار کیا۔ اس نے وحشتوں سے
ہجوم کی طرف دیکھا اور اس ہجوم کے کسی گوشے میں بوڑھے کو لاٹھی ٹیکے ہوئے وہ ننگا
فقیر بھی نظر آیا، جس کا وہ منکر تھا اور سخت نفرت کرتا تھا۔ مگر یہ نظر آنا ایک چھلاوہ تھا۔
دراصل آہنی دروازے کے باہر رکھا ہوا رتھ کا پہیہ تھا، جو اس مقام تک آتے آتے
رتھ سے نکل گیا تھا۔ اس نے آنکھیں ملیں۔ دروازے کی بھربھری لکڑی کو دیکھا اور
نئی مہم کے لیے روانگی سے قبل اپنے الفاظ کو جنبش دی۔

’ وہ سفید فام نسل تھی، جو اس ملک میں آئے اور جن کے لیے ہم نے
فرمانبرداریاں پیش کیں۔ ان کی عظمت کو سلام کہ وہ ہمیں سمجھتے تھے مگر وہ ہمیں ایک
ایسی زمین دے کر گئے جہاں لاٹھی ٹیکنے والا ایک نیم برہنہ فقیر رہتا تھا، ہم نے
کوشش کی اور فقیر کو غائب کر دیا۔ لیکن غائب ہونے کے بعد فقیر دوبارہ زندہ ہو گیا

اور یہ اس کی تعلیمات کا جادو تھا کہ ہم رتھ کی لگام تھامے مستقل کھڑے رہے اور راستہ گم رہا۔ پھر میں آیا.....'

بوڑھے نے شان سے ہاتھ ہلایا....اس وقت چناروں کے درمیان بجلیاں کڑک رہی تھیں اور برفیلی چٹانیں پگھل رہی تھیں۔ خوبصورت دھماکوں کے شور بھی تھے جو ہم اپنے ساتھ لائے تھے اور پھر میں رتھ پر بیٹھ گیا... ممکن ہے.....'

بوڑھے نے ہجوم کی طرف دیکھا۔

' ممکن ہے، زنداں کا دروازہ کھل جائے۔ ممکن ہے، مذہبی عمارت کو گرانے کے عوض ہم پر مقدمہ چلایا جائے۔ مگر یہاں سب دوست ہیں جو زنداں کے پالنہار ہیں، وہ بھی، جو بیڑیوں میں بند ہیں وہ بھی، جو وحشتوں کے اسیر ہیں، وہ بھی، جو سیاست کے مزدور ہیں، وہ بھی، جو حکومت کے طرفدار ہیں، وہ بھی۔ اس لیے تماشہ ضرور ہوگا مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ کیونکہ سب اپنے ہیں اور ان کی تعداد بے حد کم ہے جو پرانی عمارت سے چپکے ہوئے ہیں۔'

بوڑھے نے ایک بار پھر ہجوم کی طرف دیکھا.....اسے احساس تھا کہ وہ ابھی اس وقت ایک مقدمے سے گزر رہا ہے.....اور دسمبر کی ٹھنڈک کے باوجود زمین گرم ہے۔ یہاں وہ لوگ ہیں، جن کو غسل کیے ہوئے کئی روز گزر چکے ہیں اور جن کے لباس سیاہ پڑ گئے ہیں۔ مگر اس کے باوجود دھوپ میں ان کے چہرے چمک رہے ہیں اور بندوق کی جگہ اینٹوں کا تحفہ لے کر یہ خوش ہیں کہ زندگی میں سب سے بڑا انعام یہ حاصل کر چکے ہیں۔ بوڑھا مسکرایا اور قیاس کیا کہ وہ اپنے لوگوں کی عدالت میں ہے اور یہ صحیح وقت ہے کہ اس ہجوم سے مکالمہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

' جب آسمان سرخ دھول سے غسل کر رہا تھا، کیا وہاں کوئی آبادی تھی، جہاں ایک پرانی عمارت کھڑی تھی؟'



'بالکل بھی نہیں۔'

بوڑھے کو یاد آیا، وہاں دور تک جنگل جھاڑ تھا۔ دھول بھری سڑک تھی۔ اور ٹیمپو والے مسافروں کو دھول بھری سڑک پر لا کر اتار دیتے تھے۔ اور جب بسوں، ٹرکوں میں بھر بھر کر لوگ اس مقام پر پہنچے تو فضا میں چاروں طرف دھول ہی دھول تھی اور عمارت کی جگہ ایک دلدل یا ملبہ نظر آ رہا تھا۔ چند قدموں کا فاصلہ اور مٹی کا ملبہ۔

'ہم پرانی کی جگہ نئی اور عالیشان عمارت کھڑی کریں گے اور ایک دن.....'

'کیا اس دن سوّروں کا گوشت تقسیم ہوگا۔؟'

'بالکل بھی نہیں۔'

'کیا اس دن مادہ کبوتروں کو حمل ٹھہرے گا؟'

بوڑھے نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک ننگا خانہ بدوش تھا — اور اس وقت اپنے برہنہ جسم کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

'کیا اس دن فاختائیں ہوں گی؟'

'اس دن ہم ہوں گے اور نئی عمارت ہوگی۔' بوڑھے نے جوش سے کہا۔

' — اور اس یقین کو گھنے میں کتنے برس لگ جائیں گے۔؟'

'جتنے دن جنگلی بلّیوں کے دانت نوکیلے ہونے میں لگتے ہیں۔'

'جنگلی بلیاں۔ کیا ان بلیوں کا رنگ زعفرانی ہوگا۔؟'

'ہاں۔ اور زمین کا رنگ بھی۔ اور ملک کے نقشے کا رنگ بھی۔ فصیلوں کا رنگ بھی۔ یہاں تک کہ ہمارے چہروں کا رنگ بھی۔'

'کیا ہمارے لیے زنداں کے دروازے بھی ہوں گے۔؟'

'ہاں ہوں گے۔ تب تک ہم اپنے گھوڑوں پر بہت آگے نکل چکے ہوں گے۔'

بوڑھے نے اشارہ کیا۔ دو برس قبل ہم نے اسی مقام پر گولیاں کھائی تھیں۔

اور اب پرندے اڑ گئے۔ گنبد ٹوٹ گیا۔ ملبہ میں حیرتیں دفن ہیں۔'

اس نے ہجوم کے درمیان سے آواز سنی، کوئی کہہ رہا تھا۔

'ایک دن تم بھی حیرتوں میں دفن ہو جاؤ گے۔'

بوڑھے نے اس مکالمے کو نظر انداز کیا۔ دسمبر فتح کے لیے آتا ہے اور دسمبر میں دھوپ کی کرنوں پر دھند کی حکومت رہتی ہے۔ کچھ لوگ ابھی بھی دھند میں ہیں اور یقیناً درختوں پر چڑھے ہوئے، بندر ایسے لوگوں کا راستہ تنگ کر دیں گے۔ بوڑھا جب ان اطراف میں آیا تھا تو اسے چاروں طرف بندر ہی بندر نظر آئے تھے۔ مگر خانہ بدوشوں کو دیکھ کر یہ بندر بھی بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

'کیا ابھی بھی ہم بندروں کے ساتھ ہیں۔؟'

'ہاں۔ وہ ہر چوراہے پر ہیں۔ درختوں پر بھی ہیں۔ ملبے کے آس پاس ہیں اور عمارتوں کی چھت پر بھی نظر آرہے ہیں۔'

'ہمیں ان بندروں کو بھی ساتھ لینا ہوگا۔؟'

بوڑھے نے ہاتھ ہلایا اور ٹھیک اسی لمحہ اس نے دیکھا، ایک شخص نے جھک کر اس کے ہاتھ کو تھاما ہوا ہے۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی داڑھی تھی۔ وہ دبلا پتلا تھا۔ کپڑے گندے اور دھول سے بھرے تھے۔ اور اس نے بوڑھے کے ہاتھوں کا بوسہ لیا اور عقیدت سے دریافت کیا۔

' آپ تھک گئے ہیں۔ میں آپ کے لیے چائے لے کر ابھی حاضر ہوتا ہوں۔



## (4)

## 1992—

دور تک پھیلی ہوئی دھند میں مسیح سپرا کو اس بوڑھے کا چہرہ یاد تھا، جس کا نام وشال کرشن ناتھانی تھا جو ایک سندھی تھا اور تقسیم کے وقت جس کا خاندان ہجرت کر کے دارالسلطنت میں آباد ہوا تھا۔ دھند میں اور کچھ تصویریں بھی تھیں، جو واضح نہیں تھیں، مگر مسیح سپرا خود کو اس دھند کے آئینہ میں دیکھ سکتا تھا۔ اس زمانے تک وہ ایک ڈٹیکٹیو رائٹر تھا اور مسیح سپرا کے نام سے ہی اس کے جاسوسی ناول شہرت یافتہ ادارہ پگھل سے شائع ہوا کرتے تھے۔ سراغ رسانی میں اس کی بچپن سے دلچسپی تھی مگر وہ سراغ رساں نہیں بن سکا۔ ہر چند کہ اس نے کوشش بہت کی مگر کامیابی نہیں ملی۔ پھر اسی زمانے میں اسے لکھنے کا شوق پیدا ہوا اور اس وقت اس کی عمر پچیس سال تھی۔ پہلا ہی ناول 'ناگن کا قاتل' نے کامیابی کے پرچم لہرائے تو پگھل کے ادارے سے باضابطہ پانچ برس کا معاہدہ ہوگیا۔ اس زمانے میں ٹی وی اور موبائل کا چلن نہیں تھا اور ایک بہت بڑی آبادی جاسوسی ناولوں میں دلچسپی رکھتی تھی۔ یہ بات سپرا جانتا تھا کہ تھکے ہوئے دماغ میں بہت زہر بھرا ہوتا ہے۔ زہر کی پوٹلی میں

سازشیں ہوا کرتی ہیں۔ لذت وصل، گناہ اور قتل جیسے واقعات میں لوگوں کی دلچسپی ہوا کرتی ہے۔ اس عمر میں اس نے سینکڑوں ناول پڑھ رکھے تھے۔ سر آرتھر کانن ڈائل اور اگاتھا کرسٹی میں اس کی خاص دلچسپی تھی۔ کرداروں کا ہجوم اس کے آس پاس ہی رہتا تھا۔ مسیح سپرا نے کرنل سوامی اور مس کرشنا کے کردار کو گڑھا اور یہ کردار اتنے دلچسپ تھے کہ اس کے ناولوں کی مانگ بڑھتی چلی گئی۔ پیسے آنے لگے تو شادی کرنے میں دیر نہیں کی۔ ریحانہ سے شادی ہوگئی۔ مگر ان سب کے باوجود مسیح سپرا کو احساس تھا کہ اسے کچھ اور چاہیے، جس کا تصور ابھی ذہن میں واضح نہیں ہے۔ اس کی دلچسپی سیاست میں تھی مگر اس بات پر اس کو ہنسی آتی تھی کہ کہاں ایک جاسوسی ناول نگار اور کہاں سیاست۔ پھر اس عہد میں اس پر کون سی پارٹی مہربان ہوسکتی ہے۔ اس نے کئی ناول لکھے— گنگا کنارے قتل، دوہرا قتل، قاتل عورت، قتل ایک چھلاوہ، قاتل کی واپسی، گنہگار کون، سیریل کلر— اس کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ سنجیدہ ادیبوں سے لے کر سیاستداں تک اس کے ناول پڑھتے تھے.... اور اس کا نام ایسے تمام لوگوں کے درمیان کسی تعارف کا محتاج نہیں تھا۔ اپنے ناول سیریل کلر میں اس نے ایک سیاستداں کی زندگی پر روشنی ڈالی تھی جو معصوم تھا مگر رات کے اندھیرے میں خاموشی سے لڑکیوں کا قتل کیا کرتا تھا۔ یہ ناول اس قدر مشہور ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس ناول کے کئی ایڈیشن آ گئے۔ اور اسی زمانے میں حکمراں پارٹی کے لیڈر مسٹر کمار سے ایک پارٹی میں اس کی ملاقات ہوئی۔ مسٹر کمار نے بتایا کہ وہ ان کے فین ہیں اور سپرا کے، اب تک کے تمام ناول انہوں نے پڑھ رکھے ہیں۔ مسٹر کمار نے حکمراں پارٹی کے کئی لیڈران سے اس کی ملاقات کرائی اور اس طرح جب پارٹی کا دعوت نامہ ملا تو سپرا انکار نہیں کرسکا۔ پارٹی میں پہنچ ہوئی تو راجیہ سبھا کے ایک ممبر کے فوت ہونے پر لاٹری سپرا کے نام کھلی.... اور اس طرح مسیح سپرا راجیہ



سبھا میں پہنچ گیا۔ یہ ایک لمبی چھلانگ تھی۔ مگر سپرا کی مجبوری تھی کہ وہ سیاست سے ناواقف تھا اور جذباتی آدمی تھا۔ اسے سیاست کے قاعدے قانون پسند نہیں آتے تھے۔ اس لیے راجیہ سبھا پہنچنے کے بعد جس ناول کے لکھنے کا آغاز اس نے کیا، وہ ایک جاسوسی ناول ضرور تھا، مگر سپرا اس ناول میں اپنے عہد کے المیہ کو بھی پیش کرنا چاہتا تھا.... اور اس لیے اس نے ناول میں سیاسی فضا پیدا کرتے ہوئے ایک اہم کردار کو، جس نے مذہبی عمارت کے ملبہ میں تبدیل ہونے کی کہانی کو آسان بنایا تھا، دلچسپ مکالمے کے ذریعہ عدالت میں پیش کردیا تھا۔ جرح کے دوران اس سے پوچھا جاتا ہے۔

تم سب سے اعلیٰ عہدے پر فائز ہو۔

'ہاں، ایسا ہے...'

اور تم ایک سیاسی آدمی ہو۔

'منظور۔'

'اور تم پر ذمہ داری تھی کہ پرانی عمارت.....'

'میں ایک مذہبی آدمی بھی ہوں۔'

'کیا مذہبی آدمی آئین اور دستور کا خیال نہیں رکھتا؟'

'مذہب کا دائرہ ان دائروں سے زیادہ بلند ہے۔'

'کیا تم کو معلوم ہے کہ افراتفری میں کتنے لوگوں کی جان گئی۔؟'

'تین سو چھیاسی۔'

'اور اس موقع پر کتنے شہروں میں فساد ہوا۔'

'ایک سو باون۔'

'ذمہ دار کون ہوا۔؟'

’سلطان۔‘
’کیا سلطان نے پرانی عمارت کی تعمیر کی تھی۔؟‘
’ایسا ہی ہے۔‘
’کیا پرانی عمارت سے پہلے بھی کوئی عمارت تھی، اس کا کوئی ثبوت ہے؟‘
’آستھا ہے۔‘
’آستھا اور آئین کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟‘
’جتنا فاصلہ آپ کے اور ہمارے درمیان۔‘
’کیا آپ کو پرانی عمارت کے ٹوٹنے کا غم ہے۔؟‘
’نہیں۔ حادثہ یہ ہے کہ آپ مجھے عدالت میں لے کر آئے اور اس ملک میں یہ پہلی بار ہو رہا ہے۔‘
’کیا پہلی بار ایسا نہیں ہوا کہ بغیر جواز یا ثبوت کے ایک پرانی عمارت محض اس قیاس پر ڈھا دی گئی کہ اس کے نیچے کوئی اور عمارت موجود تھی؟‘
’آستھا۔‘
’آستھا کا تعلق کن لوگوں سے ہے؟‘
’صرف اکثریت سے۔‘
’اور اقلیت؟‘
’حکومت اقلیتوں کے ووٹ سے تعمیر نہیں ہوتی۔‘
’اقلیتوں کا خیال رکھنا بھی ضروری نہیں ہے۔؟‘
’ہاں۔‘
’کیا آپ جانتے ہیں کہ پرانی عمارت اب جبکہ ایک تاریخ کا حصہ بن چکی ہے، یہ تاریخ آپ کے مرنے کے بعد بھی دہرائی جاتی رہے گی اور آپ کا نام.....؟‘



’زندہ رہے گا؟‘
’آخری سوال۔ آپ کی حکومت کا رنگ کیا ہے؟‘
’زعفرانی۔‘
’اور جو دوسری پارٹی سامنے آئی ہے۔؟‘
’اس وقت سب سے بڑی طاقت زعفران ہے۔ جس کا حصہ مضبوط ہوگا، بندر اسی کے ہوں گے۔‘
’بندر کیوں؟‘
’ڈارون نے کہا تھا۔ ہم سب بندر ہیں۔‘
’اور بندر پرانی عمارت پر چڑھ کر، عمارت کو ملبہ بنا سکتے ہیں؟‘
’آستھا۔ اب میری میٹنگ کا وقت ہے۔‘

●●

دھند بڑھ گئی تھی۔ سپرا کو احساس ہوا کہ اس کے پاس ریحانہ لیٹی ہوئی ہے اور اس کے ہاتھ ریحانہ کے پستانوں کو چھو رہے ہیں۔ اس نے جھینگا مچھلی کا تصور کیا اور گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گیا۔ سپرا کو احساس ہوا کہ وہ چیخنا چاہتا ہے مگر چیخ اس کے اندر اندر کہیں کھو گئی ہے۔ سفید سفید چادروں کے درمیان ایک نا معلوم جزیرہ آباد ہے اور وہ ایک ویران چوراہے پر کھڑا ہے، جہاں کچھ فاصلے پر تیزی سے گاڑیاں بھاگ رہی ہیں۔ موہن راؤ۔ یہ نام اسے یاد آیا۔ اور سپرا دوبارہ اپنی جگہ لیٹ گیا۔ یہ موہن راؤ تھا، حکمراں پارٹی کا سربراہ— اور وہ ناول جو اس نے لکھا، اس کا عنوان سیاسی قاتل تھا۔ آنکھوں کے آگے دھند کا سفر جاری تھا— اور اس سفر میں سپرا سیاسی قاتل کے صفحات کو کھول رہا تھا۔ کچھ اور بھی دلچسپ مکالمے تھے، جس کو لکھتے ہوئے راجیہ سبھا ممبر ہونے کے باوجود اس نے سکون محسوس کیا تھا۔

قومی صدر کے ذریعہ دریافت کیا جاتا ہے

’آپ نے پارٹی کے موقف کے خلاف کام کیا۔‘

’بالکل بھی نہیں۔‘

’پارٹی کا کام پرانی عمارت کو بچانا تھا نہ کہ مسمار کرنا۔‘

’جو اکثریت کو پسند تھا، میں نے وہی کیا۔‘

’کون سی اکثریت؟‘

’ہم، آپ اور کروڑوں۔‘

’لیکن یہ کروڑوں لباس کے اندر زعفران نہیں رکھتے۔‘

’یہ غلط فہمی ہے۔‘

’کیا میں بھی زعفرانی ہوں۔؟‘

’ہاں۔ کچھ اقلیتوں کو چھوڑ کر۔‘

’کیا ہم پہلے بھی یہی تھے۔‘

’آزادی کے بعد کی پہلی کابینہ سے لے کر اب تک۔‘

’پھر اقلیت ہمارے ساتھ کیوں ہیں۔؟‘

’ان کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں۔‘

’کیا پرانی عمارت کے ڈھانے کے بعد بھی وہ ہمارے ساتھ ہوں گے؟‘

’وہ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گے۔‘

’کیوں۔؟‘

’کیوں کہ ہم نے انھیں خوفزدہ کر رکھا ہے۔‘

’کس سے۔؟‘

’زعفران سے۔‘



’بقول آپ کے، زعفرانی آپ بھی ہیں۔‘

’اور آپ بھی۔‘

’تو اقلیتیں ہم سے خوفزدہ کیوں نہیں۔؟‘

’کیونکہ ہمارے اندر کا زعفران انہیں نظر نہیں آتا۔‘

’فرض کیجیے نظر آ گیا۔ اس کے بعد۔؟‘

’کچھ نہیں ہوگا۔‘

’کیوں۔؟‘

’کیونکہ ان کے پاس لڑنے کے لیے کچھ بھی نہیں۔‘

’ہماری اصلیت واضح ہو جانے کے بعد وہ کس کو ووٹ دیں گے؟‘

’ہم کو۔‘

’کیوں۔؟‘

’کیونکہ ان کو یقین ہے، تحفظ ہم ہی دے سکتے ہیں۔‘

’ہا... ہا... ہا.....‘

قومی صدر نے قہقہہ لگایا۔ اور اس طرح یہ میٹنگ مشترکہ قہقہوں کے ساتھ ختم ہوگئی۔

مسیح سپرا آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کے اب تک کے واقعات سے آگاہ تھا۔ اس کے پاس عمروعیار کی زنبیل ہوتی تو وہ تمام شاطر سیاست دانوں کا قتل کر چکا ہوتا۔ ریحانہ اسے خوب سمجھتی تھی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اسے قابو میں رکھتی تھی وہ کسی میٹنگ میں حصہ لینے کی تیاری کرتا تو ریحانہ پہلے اس کے ہاتھوں کو تھام لیتی اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھتا۔ ریحانہ اس کے ہاتھوں کو اپنے سر پر لے آتی۔‘

’میری قسم ہے.....‘

’کیا۔؟‘

’میٹنگ میں کسی سے بکواس نہیں کروگے۔‘

’میں بکواس کرتا ہوں؟‘

’جھگڑا تو کرتے ہو۔‘

’سچ بولنا گناہ ہے؟‘

’اب تم کرائم رائٹر نہیں ہو۔‘

’یعنی انسان بھی نہیں ہوں۔‘

’یہی سمجھو۔ اب تم سیاست داں ہو۔ ایک نمبر کے جھوٹے۔‘

وہ ریحانہ کی باتوں کا مزہ لیتا۔’ یعنی اب جھوٹا بھی ہوگیا۔؟‘

’تمہارا کوئی ساتھی سچ بولتا ہے کیا۔؟‘

’ہاں۔ یہ تو ہے۔‘

’اور سچ اب تم بھی نہیں بولتے، بہت ساری باتیں مجھ سے چھپالے جاتے ہو۔

’یہ بھی صحیح ہے۔‘

سپرا قہقہہ مار کر ہنسا۔ پھر نازک سی ریحانہ کو اپنی آغوش میں بھر لیتا۔

’ایک بات کہوں۔؟‘

’ہاں۔‘

’اب لگتا ہے۔ سیاست میں آکر اچھا نہیں کیا۔ پارٹی کا اس قدر پریشر رہتا ہے کہ ہم اپنی بات بھی نہیں کرپاتے۔‘

’تم ایک اقلیتی ڈنکی ہو۔



’اقلیت والے ڈنکی ہوتے ہیں۔؟‘

’ساری عمر بوجھ ڈھونے کے بعد ملتا کیا ہے، اقلیت والوں کو؟‘

’کیوں نہیں ملتا؟‘

’وہ ہمیشہ سے حاشیہ پر ہیں۔ اس لیے کہ تم جیسے لوگ بھی پریشر میں ہو۔‘

اسے پہلی بار احساس ہوا کہ ریحانہ سچ بول رہی ہے۔ ریحانہ اس دھند کو دیکھ چکی ہے، جس کے اس پار جھوٹ کے سمندر کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہاں آپ پارلیمنٹ میں ہیں تو اپنی مرضی سے تقریر بھی نہیں کرسکتے۔ کسی اخبار والے کو اپنے حساب سے بائٹ بھی نہیں دے سکتے۔ پارٹی کا پریشر۔ آپ کے منہ میں پارٹی کی زبان ڈالی جاتی ہے اور پارٹی کیا ہے؟ کیا حقیقت میں پارٹی نے سیکولرزم اور جمہوریت کا لباس پہنا ہوا ہے؟ یا یہ سیکولرزم محض فریب ہے جیسا کہ وہ اپنے ناول میں لکھ رہا ہے۔ پرانی عمارت شہید ہوگئی۔ آپ اس کو پرانی عمارت، مذہبی عمارت بھی نہیں کہہ سکتے۔ پارٹی کے اصولوں کے مطابق آپ کو ڈھانچہ کہنا ہے۔ پارٹی اگر سیکولرزم کے اصولوں پر چلتی تو کیا آزادی کے بعد ہزاروں فسادات ہوتے۔؟ کیا پارٹی فسادات کو روکنے میں ناکام رہتی؟ راجیہ سبھا کا ممبر بننے کے بعد سپرا صاف دیکھ رہا ہے کہ گندگی کہاں ہے؟ فرق کہاں ہے؟ بھید بھاؤ کہاں ہے؟ اور اس فرق کو چھپانے کے لیے وعدے کیے جاتے ہیں۔ سفارشات لائی جاتی ہیں۔ کمیٹی بیٹھائی جاتی ہے۔ بار بار اقلیت کا نام لیا جاتا ہے۔ لیکن پارٹی نے اقلیت کی سطح پر کیا کیا ہے؟ سارے واقعات نظروں کے سامنے تھے۔ کلیم پورہ، جہاں بندوق کے نشانہ پر حکمراں پارٹی کی پولیس اقلیتوں کو گولی چلانے کے لیے لے گئی تھی۔ حسن پور، جہاں فسادات کے بعد ایک برسوں پرانا کنواں جلیاں والا باغ بن گیا تھا۔ سپرا

کو احساس تھا کہ زعفران ہر جگہ ہے اور ملک میں بڑے پیمانے پر زعفران کی کھیتی
ہورہی ہے۔ اور سپرا کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ بار بار اقلیتوں کا نام لینے سے
ایک دن یہ اقلیت، اکثریت کے نشانے پر آجائیں گے اور وشال کرشن ناتھانی،
بانسری جوشی، شردھا بھارتی جیسے لوگ اس کا فائدہ اٹھائیں گے۔ ایک دن یہ چیخ
ایک بہت بڑے نقصان میں تبدیل ہوجائے گی۔ سپرا کو احساس ہوا، ریحانہ کچھ غلط
نہیں کہتی ہے۔ بلکہ ریحانہ اس سے کہیں زیادہ دور کی سوچتی ہے۔ اسے ریحانہ پر
پیار آیا۔ وہ دیر تک ریحانہ کو آغوش میں لیے رہا۔ ایک عجیب سی ٹھنڈک کا احساس
ہوا۔ نور کا جھروکہ کھلا، اسے احساس ہوا۔ وہ نور کے اس جھروکے میں داخل ہورہا
ہے۔ مگر اس جھروکے میں بھی زعفران کھلا ہے۔ وہ فوراً ریحانہ سے الگ ہوا۔

’کیا ہوا۔؟‘

سپرا ہنسا۔’ خوفزدہ ہوگیا۔‘

’کیا میری جگہ نتاشا کو دیکھ لیا؟‘

’نتاشا کون؟‘

’سیما کہہ لو...آصفہ کہہ لو...کچھ بھی۔ سیاستداں ہو....‘

’سیاستداں کیا پانی میں تیرتے ہیں۔؟‘

’اکیلے نہیں۔ مگر تیرتے ہیں۔‘

’کس کے ساتھ؟‘

’نتاشا، آصفہ اور سیما کے ساتھ۔‘

’تم پاگل ہو۔‘

ریحانہ ہنسی۔’ ایک شک تو رہتا ہے میرے اندر اور میرے اندر اس شک کو
رہنے دیا کرو۔‘



’اس سے کیا ہوگا۔؟‘

’شک کی کھیتی سے بادام نکلے گا۔ بادام جسم کو طاقت پہنچاتا ہے۔‘

’اچھا۔ چلو.....دروازہ بند کرو۔‘

بادام نکلے گا....وہ دیر تک اس محاورے پر غور کرتا رہا مگر آخر تک سپرا کسی نتیجے
تک نہیں پہنچ سکا۔ پرانی عمارت کا قصہ تمام ہونے کے بعد ملک میں بی مشن کی
تیاریاں شروع ہوچکی تھیں۔ اس مشن کے امام وشال کرشن ناتھانی تھے۔ لیکن پارٹی
کو مضبوطی دینے کے لیے گردھر باجپائی کو آگے رکھا گیا تھا۔ گردھر باجپائی پارٹی کا
سیکولر چہرہ تسلیم کیے جاتے تھے۔ پارلیمنٹ میں ان کی تقریر نپی تلی ہوتی تھی اور
حکمراں پارٹی کے لیڈران بھی ان کو پسند کرتے تھے۔ دھوتی اور کرتا پسندیدہ لباس
تھے۔ مشن کے پرانے ساتھی تھے اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان کے آنے سے مشن کے
نرم چہرے کو آگے رکھا جاسکتا ہے۔ جبکہ وشال کرشن ناتھانی کو آئرن مین کہا جارہا تھا
اور یہ پارٹی کا گرم چہرہ تھے۔ پرانی عمارت کا ٹوٹنا تاریخ کا ایک ایسا حصہ تھا، جس
کے بارے میں سپرا سوچتا تھا کہ ملک کی تقدیر اب اسی عمارت کے بھروسے لکھی
جائے گی اور سیاست میں تبدیلی یہی عمارت لے کر آئے گی۔ عمارت مسمار کرنے
کے بعد وہاں ایک چہار دیواری کے چاروں طرف زعفرانی کپڑوں کی ایک دیوار
کھڑی کردی گئی تھی۔ ملک کا موسم اس وقت سے بدترین ہونے لگا تھا جب اس
مقام پر دو سال قبل گولیاں چلائی گئی تھیں۔ ادھر چنار کے درختوں سے شعلے نکلنے
شروع ہوگئے تھے۔ سپرا سیاست میں ان موسموں کو قریب سے دیکھ رہا تھا....اور یہ
بھی محسوس کررہا تھا کہ ہوا بدل رہی ہے اور اس ہوا میں نفرت کے کیڑے لگنے
شروع ہوگئے ہیں۔

سیاسی قتل لکھنے کے دوران وہ حکمراں پارٹی کے ایک مسلم لیڈر سے ملا جو کبھی

وزیر رہ چکے تھے۔محمود خورشید۔حکمراں پارٹی کے پرانے آدمی۔ وکیل بھی تھے۔
شاندار شخصیت کے مالک۔ اکثر پارلیمانی اجلاس کے بعد محمود خورشید کا ساتھ ہوتا تو
گفتگو کا مزاج دلچسپ ہو جاتا۔ باہر سے تعلیم حاصل کر کے لوٹے تھے اور سیاست
میں بلند مقام حاصل کیا تھا۔ اقلیتوں کے رہنما بھی تھے۔مسیح سپرا نے محمود خورشید کو
سیاسی قتل کے بارے میں بتایا تو وہ اچھل پڑے۔

’پارٹی سے بغاوت کرنا چاہتے ہیں؟‘

’یہ بغاوت ہے۔؟‘

’سیدھے سیدھے بغاوت۔اور آپ کو اس کا اختیار نہیں ہے۔‘

’کیوں۔؟‘

’کیوں کہ ہم اس مہان آتما کے بندر ہیں۔آنکھ بند۔کان بند۔زبان بند۔‘

’کیا یہ زبان بندی آپ کو پسند ہے؟‘

’پسند ناپسند کا سوال نہیں۔سوال ہے کہ آپ پارٹی میں ہیں تو آپ کو پارٹی
کے اصولوں پر چلنا ہے۔‘

’کیا پارٹی اپنے اصولوں پر چل رہی ہے۔؟‘

’نہیں۔‘

’کیا پارٹی ملک کو دھوکہ نہیں دے رہی ہے۔‘

’ زبان بند۔‘

’کیا اقلیتوں کو نچایا نہیں جا رہا؟‘

’ زبان بند۔‘

’کیا زبان بندی پہلی بار ہو رہی ہے۔؟‘

’نہیں۔ یہ ہمیشہ سے ہے۔ہم سے پہلے جو آئے، انہوں نے بھی زبان بند



رکھی۔‘

’آپ کو کیا لگتا ہے؟‘

محمود خورشید نے سپرا کی طرف دیکھا۔’دو ناؤ پر سواری ہماری پارٹی کو مشکل
میں ڈال سکتی ہے۔‘

مسیح سپرا کو احساس تھا کہ پرانی عمارت کے ڈھانے کے بعد ملک کا موجودہ
ثقافتی، سماجی، معاشرتی ڈھانچہ بھی تبدیل ہوگا....اور اس تبدیلی کی آہٹ سیاست
سے سماج تک واضح تھی۔

اس رات ریحانہ کے برہنہ جسم سے کھیلتے ہوئے سپرا نے ریحانہ کے پستانوں
پر ہاتھ پھیرا تو نرم پستانوں میں گرمی کا احساس نہیں ہوا۔ اس نے ریحانہ کے
چہرے کو ہلایا۔

’تمہارے پستان بھی سیاسی ہو گئے ہیں۔‘

’مطلب؟‘ ریحانہ کھلکھلا کر ہنسی۔

’تمہارے مزاج و معیار سے چلتے ہیں۔میرے ہاتھوں کی پرواہ نہیں کرتے۔‘

ریحانہ نے قہقہہ لگایا۔’کرائم رائٹر بن گئے ہیں۔‘

’کون؟ پستان....؟‘

’ہاں۔جذبات کا پتہ لگنے نہیں دیتے۔‘

مسیح سپرا نے قہقہہ لگایا۔اور دوسرے ہی لمحے اس نے محسوس کیا کہ ریحانہ کا
جسم تندور بن چکا ہے اور پستانوں سے آگ کے شعلے نکل رہے ہیں۔

’سب سیاست۔‘

سپرا زور سے ہنسا اور سفید گھوڑے کی طرح ہوا میں اڑا اور ریحانہ کے جسم پر
چھا گیا۔

(5)

# قدیم شہر: زندگی یا ملبہ

پارلیمانی اجلاس میں، پرانی عمارت کو لے کر مختلف پارٹیوں کے لیڈران نے نہ صرف سوال اٹھائے بلکہ تخریبی عمل کی مخالفت بھی کی۔ کلال پاسبان جم کر گرجے۔ مسیح سپرا نے باہر نکل کر مبارکباد بھی دی۔ میڈیا نے بھی پرانی عمارت کا ساتھ دیا۔ اخبارات نے شرم کی سرخیاں لگا کر جمہوریت کی اہمیت کو واضح کیا۔ مگر محمود خورشید کا خیال تھا کہ یہ تمام باتیں پارلیمانی اجلاس تک محدود ہیں .....اور ایسے تمام مقررین کب چھلانگ لگا کر کہاں پہنچ جائیں، کوئی بھروسہ نہیں۔ مسیح سپرا نے اس قدیم شہر کا دیدار اس وقت بھی کیا تھا جب وہ پرانی عمارت موجود تھی۔ اور جب اس نے اس سرزمین پر قدم رکھا تھا، تو اس کا پہلا استقبال بندروں نے کیا تھا۔ اس وقت یہ تنازعہ ہنگامی شکل اختیار کر چکا تھا۔ جب اس نے اس سرزمین پر قدم رکھا۔ اس وقت بھی سردیوں کا موسم تھا۔ کچھ جگہوں پر الاؤ جل رہے تھے۔ سورج کے نمودار ہونے تک وہ اس مقام تک پہنچ جانا چاہتا تھا، جہاں پرانی عمارت واقع تھی۔ اب اس جگہ پر پولیس پہرہ دے رہی تھی۔ مگر پرانی عمارت شان سے کھڑی تھی۔ آس



پاس جنگلی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ عمارت بہت پرانی لگ رہی تھی اور جیسا کہ کہا جا رہا تھا کہ عمارت چار سو برس پرانی ہے۔ سپرا کو اس وقت بھی عمارت کے قریب جانے نہیں دیا گیا۔ مگر وہ اس تاریخی عمارت کو جی بھر کر دیکھنے کے بعد اپنی آنکھوں میں بسا لینا چاہتا تھا۔ درختوں کے جھرمٹ میں عمارت کے گنبد صاف کہتے نظر آئے کہ ابھی پولیس کا پہرہ ہے۔ مگر بھوکی نگاہیں اس کا مشاہدہ کر رہی تھیں۔ کرگس آئیں گے اور ساتھ میں چیتے بھی۔ اس وقت دریا کا پانی سرخ ہوگا اور درختوں سے پتے زرد ہو کر زمین پر گر رہے ہوں گے۔ سپرا نے ایک نظر پولیس والوں کو دیکھا اور پھر احساس ہوا کہ قدیم شہر کی یہ قدیم عمارت آثار قدیمہ میں تبدیل ہوگئی ہے۔ بہت سے مزدور ہیں جو کھدائی کر رہے ہیں اور عمارت سے خوفزدہ کرنے والی آوازیں آ رہی ہیں۔

وہ ادھر کچھ دنوں سے جن حقائق اور تجربوں سے گزر رہا تھا، وہ اس کے لیے خوفزدہ اور ناقابل یقین حد تک چونکانے والے تھے۔ کھدائی سے قبل محکمہ نے تفتیش وتحقیق کا سارا کام مکمل کر لیا تھا۔ تحقیق میں اس بات کی نشاندہی کی گئی تھی کہ یہاں صدیوں پرانی نشانیاں آج بھی محفوظ ہیں۔ اراضی کے اطراف میں کچھ میل کے فاصلے پر اس سے قبل بھی جو باقیات ملے تھے، ان کا تعلق قدیم تہذیب وثقافت سے تھا۔ اس لئے گمان غالب تھا کہ اس بار بھی باقیات سے عہد قدیم کی کوئی نہ کوئی نشانی تاریخ کے ساتھ تہذیب وثقافت کے باب میں اضافہ ضرور کرے گی۔ سات آٹھ مہینوں کی مسلسل کھدائی کے بعد کچھ بوسیدہ لکڑی اور پتھر کے ٹکرے برآمد ہوئے تھے، جن کو محکمہ میں وقت کا تعین کرنے کے لئے بھیج دیا گیا تھا۔ اور اس کے بعد ناقابل یقین حد تک چونکا دینے والی کچھ ایسی باتیں سامنے آئی تھیں، جس کی وضاحت کے لیے سپرا کو ادھر کا رُخ کرنا پڑا تھا۔ ان میں سب سے اہم بات کا تعلق آوازوں سے تھا۔ وہاں موجود

لوگوں نے اس تعلق سے کئی اہم انکشافات کئے۔

’آسمان کی فضاؤں سے آنے والی پُراسرار آوازیں کبھی کبھی محفوظ رہ جاتی ہیں۔ایسے بہت سے لوگ ہیں جنہوں نے مختلف اوقات میں حیرت انگیز اور پُراسرار آوازیں سنی ہیں۔ بلکہ کچھ سال قبل ہی بیلا روس کے ایک سنیما فوٹوگرافر نے ان آوازوں کو ریکارڈ کیا تھا، اس وقت تک یہ جدید ٹکنالوجی بھی نہیں آئی تھی۔ابھی حال میں کینیڈا کی ایک خاتون نے بھی ان آوازوں کو ریکارڈ کیا۔ پھر اسے پتہ چلا کہ آواز ایک عورت کی ہے، جس کا قتل کردیا گیا تھا۔ماہر ارضیات بھی بتاتے ہیں کہ ان آوازوں کو آسانی سے محفوظ کیا جاسکتا ہے۔‘

سپرانے ایک نوجوان کی طرف دیکھا۔’تم کبھی Schizophreni کے مریضوں سے ملے ہو؟‘

’نہیں۔‘

سپرانے کہا’ میں ایسے کئی مریضوں سے ملا۔ یہ مرض ایک ناکارہ کردینے والی ذہنی کیفیت ہے۔ مریض کے لئے حقیقی اور خیالی دنیا میں فرق کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔میں ایک بشپ سے ملا تھا۔ وہ غیر موجود کو دیکھ سکتا تھا۔ غیر مرئی آوازوں کو سن سکتا تھا۔ بلکہ وہ اکثر ایسی طاقتوں سے گفتگو کیا کرتا تھا۔‘

’ہاں میں نے ایسا سنا ہے۔‘ایک نوجوان ذرا توقف کے بعد بولا۔’’ چاند پر جانے والے خلا بازوں نے بھی ایسی آوازیں ریکارڈ کی تھیں۔ یہ سیٹی بجنے جیسی آواز تھی۔‘ اس نے اپنی فکر کا خلاصہ کیا......لیکن کیا ان آوازوں کو واقعی ریکارڈ کیا جاسکتا ہے؟‘‘

’ہاں۔کیوں نہیں۔سپرا کا مختصر جواب تھا۔

سپرااس جواب سے مطمئن نہیں تھا۔لیکن مزدوروں، انجینئر اور اطراف



میں رہنے والوں کی طرح اس کو بھی اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ آثار قدیمہ کی کھدائی سے کچھ ایسے باقیات ضرور حاصل ہوں گے، جو تاریخی اعتبار سے اہم ہوں گے...اور ممکن ہے، پرانی عمارت سے کچھ ایسا برآمد ہوجائے، جسے سننے اور دیکھنے کے بعد سیاسی زلزلہ آجائے۔

●●

کھدائی کا کام تین سال سے چل رہا تھا۔ یہاں سے ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر آج سے پانچ برس قبل کچھ ایسے باقیات حاصل ہوئے تھے،جن سے اس بات کی امید پیدا ہوئی تھی کہ یہاں ہزاروں سال پیشتر کسی بسے بسائے شہر کے ہونے کے امکان سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔کافی گہری کھدائی ہوجانے کے بعد مزدور یہ دیکھ کر چونک گئے کہ مٹی کا رنگ بادامی سے سیاہ ہوگیا تھا۔اس مٹی میں پودے کے ٹکرے بھی شامل تھے۔

یہ بھی اشارہ ملا کہ ہزاروں برس قبل یہاں کاشتکاری ہوتی ہوگی۔تحقیق سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ یہاں کی آبادی پانچ سے دس ہزار نفوس کے درمیان ہوگی۔ کچھ قدیم پتھروں کے زیورات ملے تھے جو اس بات کا اشارہ کرتے تھے کہ عورت کی عبادت ہوتی ہوگی۔اور یہاں کے شہر باضابطہ گلیوں سے منسلک ہوں گے۔ آس پاس ندی ہونے کے بھی امکانات تھے۔اسی کی بنیاد پر تحقیق کا کام مزید آگے بڑھا تو اس طرف کھدائی کا عمل شروع ہوگیا۔

کھدائی کا عمل شروع ہونے کے بعد ہی جیسا کہ مزدور اور آس پاس کی بستیوں کے کچھ پرانے لوگ، گھر میں کام کرنے والی کچھ عورتیں اور علی الصباح خچروں پر سامان لاد کر لے جانے والے گجروں کے منہ سے جو کچھ بھی سننے میں آیا، وہ نہ صرف حیرت انگیز بلکہ انسانی کھال کے اندر خون کو منجمد کرنے والے واقعات تھے اور یہ سلسلے

جو شروع ہوئے تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ صبح ادھر سے گجروں اور کچھ تاجر پیشہ لوگوں کا قافلہ گزرتا تھا، جو خچروں پر اور گھوڑوں پر سامان لادے دور بستیوں میں تجارت کے سامان فروخت کیا کرتے تھے۔ ایک صبح حیرت انگیز طور پر ان کے گھوڑے اور خچر رک گئے۔ آسمان میں بدلیاں چھائی تھیں۔ دور تک پھیلی ہوئی دھندلی سیاہ روشنی میں سامنے جو منظر تھا، وہ دل دہلا دینے والا تھا۔ دھند میں ہزاروں گھوڑوں کی تعداد تھی اور ان سواروں کے چہرے صاف نہیں تھے لیکن گھوڑوں کو ایڑ لگاتے ہوئے یہ برابر چیخ رہے تھے اور حملہ کرنے کے لئے کہہ رہے تھے۔ آواز میں ارتعاش تھا اور گھوڑوں کی ٹاپ سے اڑنے والی مٹی کا رنگ سفید تھا۔ گجر برادری کے کچھ تاجر پیشہ حضرات اس قدر خائف ہوئے کہ خچروں گھوڑوں کے ساتھ واپس لوٹنے میں ہی بھلائی سمجھی۔ ان میں سے کچھ بخار میں مبتلا ہوئے اور کچھ ہفتوں تک اس طرف آنے میں خوف محسوس کرتے رہے۔ اس کے بعد نہ وہ گھوڑوں کا ہجوم نظر آیا نہ گھوڑ سوار مگر چشم دید گواہوں کے مطابق فاصلہ چند قدموں کا تھا اور ایسا لگتا تھا گویا وہ شب خون مارنے کی تیاری سے آئے ہوں۔ اس اطراف میں جنگوں کی خونچکاں تاریخ کے قصے بھی عام ہیں۔ اس لئے بستی کے پرانے لوگوں نے جنگجو سواروں کے بارے میں وہی قصہ دہرایا کہ دراصل یہ وہ لوگ تھے جو جنگوں میں ہلاک ہوئے مگر ان کی چیخیں ابھی بھی سیاہ رات کے سینے کو چیرتی ہوئی کبھی کبھی سنائی دے جاتی ہیں۔

●●

اسی طرح گھروں میں کام کرنے والی کچھ عورتوں کو عقب میں کچھ سائے نظر آئے۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے پر وہ سائے غائب ہو جاتے تھے۔ ایک عورت کے مطابق غیر مرئی سائے جلدی سے جلدی گھر خالی کرنے کے بارے میں کہہ رہے تھے۔ ایک بزرگ خاتون نے بتایا کہ ایک سفید عورت اچانک سامنے آ گئی۔ اس عورت کے



چہرے پر خوفزدہ کرنے والی کیفیت تھی وہ بار بار یہی کہہ رہی تھی... سب کچھ ختم ہو گیا۔ اب یہاں سے تم لوگ بھی بھاگ چلو۔

ان آسیبی کہانیوں کے درمیان کھدائی کرنے والے مزدوروں کے بیانات بھی تھے جو اکثر دوپہر کے بعد کچھ عجیب عجیب آوازوں کو سن کر چونک جاتے تھے۔ ان آوازوں میں بچوں اور عورتوں تک کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ کبھی کبھی سپرا کو احساس ہوتا تھا کہ یہاں گمشدہ آوازوں کا ایک شہر آباد ہے۔ بستی کے زندہ لوگوں کے علاوہ ایک بستی اور بھی ہے۔ یہاں جنگجو گھوڑ سوار ہیں اور خوفزدہ عورتیں، مرد، بچے۔ یہ لوگ دن رات سائے کی طرح ساتھ ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ روحیں نظر نہیں آتیں۔ ہاں کبھی کبھی کسی کو دکھائی ضرور دے جاتی ہیں۔

کچھ دن اور اسی طرح گزارے۔ دوپہر کا سورج جب آسمان سے آگ برسا رہا تھا، کچھ مزدور بھاگتے ہوئے آئے۔ اس وقت وہاں ایک انجینئر کچھ لوگوں سے گھرا ہوا تھا اور اسی بات پر تبادلہ خیال کر رہا تھا کہ اکثر جن باتوں کو ہم واہمہ قرار دیتے ہیں، کیا حقیقت سے ان کا تعلق نہیں ہوتا؟ توہمات کی جڑوں کو حتمی اور کلی حد تک ذہن و دل سے ختم کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ قابل انجینئر کا خیال تھا کہ دراصل جسے ہم واہمہ کہتے ہیں، وہ علم نفسیات کی زبان میں تسلی ہے۔ یہ حقیقت ہم خود بھی جانتے ہیں کہ ان گنت ارواح ہمارے ساتھ چلتی پھرتی ہوتی ہیں۔ اس نے مردہ تہذیبوں کے ستارہ شناسوں اور کاہنوں کی پیشین گوئیوں کی ان گنت کہانیوں کو سناتے ہوئے بتایا کہ سائنس بھلے ان مشاہدات ونظریات کو رد کر دے، مگر ان کاہنوں کا خیال تھا کہ ہم مرنے کے بعد بھی زندہ رہیں گے اور یہیں آس پاس ہی سیر کرتے رہیں گے۔ ٹھیک یہی ساعت تھی جب بھاگتے ہوئے مزدوروں نے تیز سانسوں کے درمیان رُک رُک کر اور خوفزدہ انداز میں بتایا کہ وہ آوازیں اب صاف ہیں۔ اور آپ بھی سن

سکتے ہیں۔مزدوروں کے مطابق ایک سخت دیوار ہے۔ دیوار کے پیچھے یقیناً لوہے کا ایک دروازہ ہوگا۔ کیونکہ آوازوں کے ساتھ کبھی کبھی دروازے کو پیٹنے کی صدا بھی سنائی دے جاتی ہے۔ گہری سرنگ کے باوجود ہوا کا زور ہے۔اور آوازیں ہوا میں لہرا رہی ہیں۔خوفزدہ کرنے والے الفاظ میں مزدوروں نے بتایا کہ آگے کھدائی کا کام دشوار ہے۔ وہ اپنی جان نہیں دے سکتے۔ وہ بضد تھے اور اس وقت انہوں نے کام روک دیا تھا۔

●●

یقیناً یہ واہمہ نہیں تھا۔آوازیں تھیں بلکہ آوازوں کا ہجوم تھا۔ایک شور تھا جہاں بہت سی آوازیں ایک دوسرے میں خلط ملط ہوگئی تھیں۔آنکھیں بند کر کے بھی ان آوازوں کو محسوس کرنا مشکل نہیں تھا۔کہیں کوئی چیخ،کسی کے رونے کی صدا،کتوں کے بھونکنے کی آوازیں، بوٹوں کی ٹاپ،گھوڑوں کے ہنہنانے اور سناٹا بھری رات میں کہیں دور جنگل سے آنے والی بھیڑیوں کی خوفناک آوازیں۔ٹھہر ٹھہر کر کسی عورت کے رونے کی آواز۔ پھر تیز تیز بھاگنے کی آوازیں۔ اور یہ آوازیں اس دیوار سے بلند ہورہی تھیں جو اس وقت نظروں کے سامنے تھی۔ذرا ٹھہر کر سپرا نے وہ آواز بھی سنی، جس کے بارے میں مزدوروں کا بیان تھا کہ پس دیوار لوہے کا ایک دروازہ ہے۔لوہے کے دروازے پر پڑنے والی تھاپ مختلف ہوتی ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ کچھ لوگ باہر آنے کے لئے دروازہ پر دستک دے رہے ہوں۔اس دن سب اتنے خوفزدہ تھے کہ مزدوروں کو چھٹی دے دی گئی تاہم انہیں یہ ضرور کہا گیا کہ خوفزدہ ہونے کی بات نہیں ہے،کھدائی ضرور ہوگی۔مگر اس موقع پر ان کی زندگی اور تحفظ کا خیال رکھتے ہوئے سیکورٹی بحال کردی جائے گی۔ دوسری بات یہ کہ اس موقع پر سب لوگ موجود ہوں گے۔ضرورت پڑی تو حفاظتی دستہ بھی بلا لیا جائے گا۔



بعض توہمات،مفروضے وقت کا طویل سفر طے کر کے حقیقت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔اس رات کھانے کی میز پر ریحانہ نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور بتایا کہ وہ پچھلی تین راتوں سے خواب میں نوح کی کشتی کو دیکھ رہی ہے۔کوئی اسے آواز دے رہا ہے کہ دنیا ختم ہونے والی ہے۔بہتر ہے کہ وہ کشتی میں آجائے۔سپرا نے کہا۔یقیناً اسے کشتی میں چلا جانا چاہیے۔

سپرا خواب سے جاگا تو زندگی سرائے کا دروازہ بند تھا....اور کوئی اس سے دریافت کر رہا تھا کہ تاریخ کو فراموش کرنے میں کتنا وقت لگتا ہے؟ کیا تاریخ کی کوئی اہمیت ہے؟ کیا چار سو برس کی طویل مدت کے بعد بھی تاریخ بدل سکتی ہے؟ سپرا کو محمود خورشید کی باتیں یاد آئیں۔اس نے ہنس کر کہا تھا کہ تاریخ میں اتنے سوراخ ہیں کہ جیل کی سلاخوں میں بھی نہیں ہوں گے۔ان سوراخوں کے آر پار کچھ بھی نہیں ہے...اور ہے تو وہ تبدیل ہوجاتا ہے یا کر دیا جاتا ہے۔

سپرا کو مزدوروں کی آوازیں ابھی بھی پریشان کر رہی تھیں۔ ریحانہ کو اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

'وہ اس قدیم شہر کو ایک بار پھر دیکھنا چاہتا ہے۔'

'اس سے بہتر ہے کہ بھالو کا تماشہ دیکھ لو۔'

'کیوں؟'

'تم بھی جانتے ہو کہ موسم بدل چکا ہے۔'

'اب اتنا بھی نہیں بدلا۔'

'تمہاری فکر سے زیادہ بدل چکا ہے۔ بلکہ مجھے احساس ہے کہ تمہاری فکر میں بھی کیکٹس چبھ رہے ہوں گے۔'

'کیوں؟'

'یہ تو مجھ سے بہتر تم جانتے ہو۔اور کیوں جانا چاہتے ہو مجھے پتہ ہے۔'

'تم کچھ نہیں جانتی۔'

'تم اپنی حیرانیوں کو مزید موقع دینا چاہتے ہو۔'

'حیران ہونے کا۔'

'ہاں۔اور غمزدہ ہونے کا بھی۔'

مسیح سپرا نے مسکرا کر پوچھا تھا۔'مجھے اتنا کیوں جانتی ہو؟'

ریحانہ مسکرائی۔'اس لیے کہ میرے اندر کی جنگلی بلی زندہ رہے۔'

'جنگلی بلّی۔'

مسیح سپرا ریحانہ کی ان باتوں پر ہی فدا تھا۔اس نے ایک نرم گداز بوسہ ریحانہ کے حوالے کیا اور دوسرے دن قدیم شہر کی پرانی عمارت کو دیکھنے نکل گیا۔

کبھی یہ قدیم شہر اودھ کے نوابوں کی جاگیریں ہوا کرتی تھیں۔یہاں کی شان وشوکت اور تھی۔واجد علی شاہ اس قدیم شہر کے آخری نواب وزیر تھے۔جب واجد علی شاہ کا اودھ سے حقہ پانی ختم کیا گیا، بیگم حضرت محل نے اس جاگیر کی حفاظت کی۔ انگریز ۱۸۵۶ تک شہر پر شب خون مارنے سے گھبراتے رہے۔اس شہر کو لے کر صرف ایک مذہب کی کہانیاں روشن نہیں تھیں، بلکہ اس قدیم شہر پر جین، مسلمان، بودھ سب کی نشانیاں موجود تھیں۔ایک دفعہ اس قدیم شہر میں ایک گڑھی کو لے کر تنازع پیدا ہوا تو نواب واجد علی شاہ نے ہندوؤں کے حق میں فیصلہ سنایا۔

ہم عشق کے بندے ہیں، مذہب سے نہیں واقف

گر کعبہ ہوا تو کیا، بت خانہ ہوا تو کیا

عشق کے بندے، عشق سے دور ہو گئے، بت خانہ آباد ہوا اور پرانی عمارت



ملبہ میں تبدیل ہو گئی۔۱۲ ویں سے ۱۷ ویں صدی تک اس شہر پر مسلمانوں کی حکومت رہی۔شمال میں میلوں پھیلی ہوئی سرمئی زمین۔کچھ مٹی کے ٹیلے۔اسٹیشن پر وہی بندروں کا ہجوم۔اور اسٹیشن پر قدیم شہر کی سواری چیختے ہوئے ٹیمپو والے۔مغربی علاقے کی طرف کچھ کچے پکے مکانات۔مسیح سپرا کی آنکھیں اس پرانی عمارت کو تلاش کر رہی تھیں۔مگر اب وہاں ملبہ تھا اور ملبہ کا کچھ حصہ زعفرانی چادر سے گھرا ہوا تھا۔مزدور پسینہ بہاتے ہوئے کھدائی کر رہے تھے۔سپرا کو شہر کی فصیلیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ دوبارہ ان آوازوں کی زد میں تھا، جو اس نے پچھلی بار سنی تھیں۔ مزدوروں کو یہ آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔کافی تعداد میں پولیس والے تھے۔سپرا کو دور ہی روک دیا گیا۔رسّیوں کا ایک گھیرا بنایا گیا تھا۔گھیرے کے پاس کھڑے لوگ اب بھی چیخ رہے تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔مسیح سپرا کو اس وقت پہلی بار دورہ پڑا تھا۔

یہاں پرانی عمارت تھی۔

اب نہیں ہے...

ابّا حضور تھے...

اب نہیں ہیں...

امّاں حضور تھیں...

اب نہیں ہیں...

پرانی عمارت میں تین گنبد تھے...

اب کچھ بھی نہیں ہیں...

—اس کے بچپن کا ایک دوست رفیق تھا۔

—اب نہیں ہے۔

پرانی عمارت تھی۔ اور یہ نظروں کا دھوکہ نہیں ہے۔

— مگر اب نہیں ہے...

— صرف انسان نہیں گم ہوتے۔ نقشے گم ہوجاتے ہیں۔ عمارتیں گم ہوجاتی ہیں۔ مکاں گم ہوجاتے ہیں۔ مکیں گم ہوجاتے ہیں۔

مسیح سپرا ہے...

مسیح سپرا بھی نہیں رہے گا۔

یہ مردوں کی بستی ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کھنڈرات سے بلند ہونے والی آوازیں دوبارہ اس کے کانوں میں چنگھاڑنے لگیں۔ سپرا کو لگا، روحیں ہیں جو آثار قدیمہ میں بھٹک رہی ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھیرا بندی کرنے والی رسّی بوسیدہ دھاگے میں تبدیل ہوگئی اور اس نے الجھے دھاگوں کو ٹوٹتے ہوئے دیکھا۔ پھر اس نے دیکھا کہ جو لوگ رسّیوں کے پیچھے کھڑے تھے، وہ ارواح میں تبدیل ہوگئے۔ ان کے لباس سفید تھے۔ پاؤں ہوا میں معلق تھے۔ آسمان کا رنگ گیہواں تھا۔ ایک سفید گھوڑا تھا، جو آسمان پر اڑ رہا تھا اور بادلوں کے نرغے میں وہی عورت تھی، جو نقاب پہنے تھی۔ اس کی آنکھوں میں غصے کی چمک تھی۔ سپرا نے زیر لب بڑبڑانا جاری رکھا۔

وہ ہے...

وہ نہیں ہے...

پرانی عمارت تھی... پرانی عمارت اب نہیں ہے...

ملبے کو دیکھنے والے ابھی، یہیں رسّیوں کے قریب جھول رہے تھے...

اب یہ ارواح ہیں اور مر چکے ہیں۔

وہ مردوں کی بستی میں ہے اور مردوں کے ساتھ چل رہا ہے۔ سپرا کی سانسیں



گھٹ رہی تھیں وہ اضطرابی کیفیت میں تھا۔ گھر لوٹنے تک وہ اسی کیفیت میں رہا۔

ریحانہ نے اس کی طرف دیکھا۔ مگر بے آواز رہی اور خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

’ کیا میں ہوں ‘

’ ہاں تم ہو۔ اور میں بھی ہوں ‘

پھر اسے کچھ یاد نہیں۔ پرانی عمارت، ملبہ، ارواح جیسے کچھ الفاظ دہراتے ہوئے اس پر غشی طاری ہوگئی۔

ریحانہ کے مطابق وہ ۴ گھنٹے تک بے ہوش رہا۔

سپرا کو یقین ہے، یہ چار لمحے اس نے اس عورت کے ساتھ گزارے جو بادلوں کے درمیان نقاب لگائے کھڑی تھی اور اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

# (6)

پارلیمانی اجلاس کے ساتویں دن گاڑی سے اترتے ہی کلّا پاسبان سے دوبارہ ملاقات ہوگئی۔اس کی داڑھی بڑھی تھی۔ رنگ کالا تھا۔ لمبا تھا اور زیادہ تر سفاری سوٹ میں ہوتا تھا۔ وہ ان لیڈروں میں سے ایک تھا جو وقت کے ساتھ بھی تبدیل نہیں ہوتے۔ وہ اقلیتوں کے حقوق کی باتیں کرتا تھا۔ ملک کی سلمیت اور جمہوریت کی باتیں کرتا تھا اور ایک خاص طبقہ کے درمیان وہ مقبول ترین لیڈروں میں سے ایک تھا۔مسیح سپرا نے پاسبان کے ہاتھوں کو گرمجوشی سے اپنے ہاتھ میں لیا۔

’آپ نے کمال کر دیا۔‘

’کیسا کمال۔‘

’اس دن جوآپ نے تقریر کی۔‘

’ارے یار‘ پاسبان مسکرایا۔’ قیدیوں کی تکلیف سننے کے لیے کہاں جاؤ گے، ظاہر ہے جیل میں؟ وہاں ان کے پسینے کی بدبو بھی سونگھوگے۔ یہ اقلیت بھی قید میں ہیں اور صدیوں سے سسٹم انہیں قید کرتا رہا ہے۔ انہیں روشنی سے زیادہ پیار کی ضرورت ہے۔ یہ ہمارے اپنے ہیں۔ پرانی عمارت ڈھادی گئی؟ بنیاد کیا تھی؟ محافظ ہی دشمن بن جائیں تو.....‘



’آپ اتنا سوچتے ہیں۔‘

’سوچنا پڑتا ہے اور بولنا تو آپ کو بھی چاہیے۔ایک سسٹم لگاتار ان کو صاف کرنے پر مجبور ہے اور یہ سہارا چاہتے ہیں۔ سیاست میں آنے کا مطلب کیا ہے؟ سیاست میں ہمارے کون ہیں۔ یہی محدود اقلیت والے۔ان کے حقوق کے لیے لڑنا ہوگا۔اتنی زحمت تو اٹھانی ہوگی۔‘

’لیکن اقلیتوں کے بارے میں کون سوچتا ہے۔‘

’سوچنا تو ہوگا۔اقلیتیں محض ووٹ بینک بن کر رہ گئی ہیں۔ان کو اپنی مضبوطی کا احساس کرانا ہوگا۔مسیح سپرا کے لیے یہ ایک بے حد خاص دن تھا۔کلّا پاسبان کی باتوں نے اس پر اثر کیا تھا۔مگر مجبوری تھی کہ پارٹی لائن کو دیکھتے ہوئے وہ زبان بندی کے لیے مجبور تھا۔ اس رات سیاسی قتل کے لیے اس نے ایک اور منظر لکھا۔ ایک واقعہ پیش آیا تھا۔ ہائی کورٹ کے ایک جج نے پریس کانفرنس میں اس بات کا اعلان کیا تھا کہ اس کی آواز کو دبانے کی کوشش کی جارہی ہے۔عدلیہ اور حکمراں طبقہ میں میل جول نہیں ہوسکتا۔ پھر اسی جج نے ناظم پورہ کے ان پولیس والوں کی رہائی کا حکم دیا تھا، جن کے قتل کے شواہد موجود تھے۔ یہ ایک دلچسپ منظر تھا اور مسیح سپرا نے اس منظر کو اسی طرح لکھا جس طرح یہ پیش آیا تھا۔ناظم پورہ پولیس والوں کی رہائی کے بعد جب دوبارہ پریس کانفرنس ہوئی تو جج بھٹا چاریہ سے پریس والوں نے کئی طرح کے سوال پوچھے، لیکن بھٹا چاریہ کے پاس ہر سوال کا جواب موجود تھا۔

’جب پولیس والے بے گناہوں کو لیے جارہے تھے.....؟‘

’میں وہاں نہیں تھا۔‘

’وہ اقلیت تھے اور خوفزدہ اور اپنے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے.....‘

’میں وہاں نہیں تھا۔‘

'کچھ دن پہلے آپ نے ایک پریس کانفرنس کی تھی....'

'مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اور آپ بھی یاد رکھیے کہ آئین اور عدلیہ پر سوال اٹھانا بھی جرم ہے۔آپ کو اس کی سزا مل سکتی ہے۔'

'کیا پولیس والوں کا کوئی قصور نہیں تھا۔'

'پولیس مجرموں کو پکڑنے کے لیے ہوتی ہے۔'

'کیا وہ بےقصور تھے یا بے گناہ؟'

'وہ مجرم تھے۔'

'کیا اقلیت میں ہونا مجرم ہونا ہے۔؟'

'مجرم کوئی بھی ہوسکتا ہے۔'

'لیکن شواہد موجود ہیں۔۔فوٹیج موجود ہے۔تصاویر موجود ہیں۔'

'ثبوت کوئی بھی نہیں۔'

'ثبوت تو تصویریں ہیں۔'

'تصویروں کو ثبوت نہیں مانا جاسکتا۔'

'اچھا، ایک سوال اور......جو مجرم جیت کر پارلیمنٹ پہنچ جاتے ہیں۔'

'پھر وہ مجرم نہیں رہتے۔'

'سیاست بدل رہی ہے یا دنیا؟'

'دونوں طرف تبدیلی کا استقبال کرنا چاہیے۔'

●●

مسیح سپرا کو پرانی عمارت کا ڈھایا جانا ہندوستان اور سیاست کے لیے ایک ٹرننگ پوائنٹ لگتا ہے۔ اس موقع پر جشن منانے والوں کی کمی نہیں تھی۔ ایک بڑا طبقہ اسے فتح کے طور پر لے رہا تھا اور دوسرا طبقہ صدمے میں گم۔ مسیح سپرا جانتا تھا



کہ یہ سیاست آگے بھی چلتی رہے گی اور ایک مخصوص طبقے پر اپنا اثر ڈالے گی۔ اس کا ناول سیاسی قتل مکمل ہو چکا تھا۔ وہ اس ناول پر ہونے والے ہنگامے سے واقف تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ سیاست میں ایسا ہوتا رہتا ہے اور بہت سے راستے کھلے رہتے ہیں۔ سیاسی قتل پریس میں جا چکا تھا۔ ان دنوں ریحانہ امید سے تھی سپرا اس کا پورا خیال رکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس موقع پر عورت کیا چاہتی ہے۔ اس کو آرام سے زیادہ شوہر کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ایک اچھا شوہر بن کر دکھانا چاہتا تھا۔

پرانی عمارت گرنے کے بعد کئی شہروں میں فسادات ہوئے۔ نفرت کی آگ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس رات سپرا نے پھر ایک خوفزدہ کرنے والا خواب دیکھا۔ یہ خواب وہ مسلسل قدیم شہر سے لوٹنے کے بعد دیکھ رہا تھا۔ وہی، وحشیوں کا ہجوم جو پرانی عمارت کے گنبد پر چڑھ گئے ہیں اور پرندوں کا ہجوم واپس جا رہا ہے۔ پھر اس وحشی ہجوم کو اس نے اپنے گھر کے دروازے پر دیکھا۔ لیکن ایک بات عجیب تھی۔ وحشی ہجوم کے گھیرے میں ریحانہ تھی۔ اور ریحانہ کے ہاتھ خون سے لت پت تھے۔ خواب کی یہ تعبیر سپرا کو ایک ماہ بعد سمجھ میں آئی۔ جب رات کے پچھلے پہر ریحانہ کی تیز چیخ گونجی۔ سپرا خوفزدہ ہو کر اٹھ گیا۔ کمرے میں روشنی کی۔ ریحانہ کو دیکھا۔ وہ بستر پر تڑپ رہی تھی اور اس کے ہاتھ خون سے بھیگے تھے۔ رات کے وقت ہی سپرا ریحانہ کو لے کر مدرا سپتال گیا۔ وہاں کے معالج نے ریحانہ کو فوراً آپریشن تھیٹر بھیج دیا۔ کاریڈور میں کھڑا ہوا سپرا رب سے دعائیں مانگ رہا تھا۔

دھند....دھند میں کتنے چہرے کھو جاتے ہیں۔ عمارت کھوگئی۔ ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئی۔ کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹروں نے آکر بتایا کہ ۵ ماہ کا حمل تھا۔ سپرا زور سے چیخا۔ گوشت کا زندہ لوتھرا....؟

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ ریحانہ کے پیٹ میں تھا۔ پیٹ سے ہی چلا گیا.... اندھیرے سے اندھیرے کی طرف۔ تین دن تک ریحانہ اسپتال میں

رہی۔ وہ خود کو نارمل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر سپرا کو احساس تھا کہ وہ جلد نارمل نہیں ہو سکے گا۔ وہ پانچ ماہ کے گوشت کے لوتھڑے کو دیکھ بھی نہیں سکا۔ لوتھڑہ، جس میں اس کا خون بھی شامل تھا۔ ایسا بھی ہوتا ہے، جسم کے اندھیرے سے بھی ایک راستہ انجان جزیرے کی طرف جاتا ہے۔ ایک ایسے جزیرے کی طرف جہاں روشنی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ گھر آنے کے ایک ہفتہ کے اندر ریحانہ نے بہت حد تک خود کو نارمل کر لیا تھا مگر مسیح سپرا پر دورے پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ اور اس رات جب آسمان میں چاند روشن تھا، اس کا خیال تھا کہ شہر کی فصیلوں پر بھیڑیے دوڑ رہے ہوں گے۔ متواتر دوڑنے کے عمل سے دھول اڑ رہی ہوگی۔ گزرگاہوں سے بنجاروں کا قافلہ جا رہا ہوگا۔ بے نیاز۔ اور بھیڑیے اچانک بنجاروں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

تم نے آواز سنی.... سپرا کا چہرہ سپید پڑ گیا تھا

کیا؟ ریحانہ نے پوچھا...

وہ تھا.....

اب نہیں ہے....

مگر وہ تھا۔ گوشت کا لوتھڑہ.....

ریحانہ زور سے چیخی۔ میں بھول چکی ہوں۔ تم بھی بھول جاؤ۔

’کیسے؟ میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں۔ وہ تنہائی سے تنہائی میں گزر گیا۔ خیال سے خیال آباد میں، تاریکی سے نکل کر خوفناک تاریکی میں.....‘

’وہ نہیں ہے۔ اور تمہارے جذباتی ہونے سے.....‘

سپرا زور سے چیخا۔ میں جذباتی نہیں ہوں۔ اس سے رشتہ تھا میرا.... اور اس کو میں دیکھ بھی نہیں سکا۔‘

سپرا سسک رہا تھا۔ دھند میں بنجاروں کی تکا بوٹی کی ہوئی لاشیں پڑی تھیں۔ سپرا کو کب نیند آئی اسے پتہ بھی نہیں چلا۔



صبح آسمان زرد تھا۔ ریحانہ نے بتایا کہ آندھی آئی تھی مگر وقفہ کم تھا۔ کچھ دیر میں ہی آندھی گزر گئی۔ وہ ڈرائنگ روم میں آ کر کچھ دیر تک اخبار پڑھتا رہا۔ اسے احساس ہوا کہ تمام باتیں جھوٹی ہیں۔ سیاست جھوٹ کے راستے پر چل پڑی ہے۔ اس کی انتہا خطرناک ہو سکتی ہے۔ اس کی خاموشی میں اجنبیت کا عنصر قائم تھا۔ اس وقت وہ خود کی شناخت نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کی کتاب مارکیٹ میں آ چکی تھی۔ مگر وہ ابھی کتاب کے بارے میں کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا تھا وہ خود فراموشی کی کیفیت میں تھا مگر وہ لوتھڑہ بار بار اس کی نگاہوں کے سامنے آ کر اس کو زخمی کر رہا تھا۔

ریحانہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

’تم اس پورے ہفتے کہیں نہیں گئے۔‘

’ہاں۔‘

’سیاست میں ہو۔ سیاست میں گرگٹ بننا پڑتا ہے۔‘

’میں نہیں بن سکتا۔‘

’پھر لومڑی بن جاؤ۔‘

’وہ بھی نہیں۔‘

’پھر سیاست میں کیوں ہو۔؟‘

’میرا خیال ہے..... مسیح سپرا آہستہ سے بولا... سیاست مجھ سے اپنا رشتہ ختم کر رہی ہے۔ اور یہ بہت جلد ہوگا۔‘

’انتظام تم نے ہی کیا ہے۔‘

’ہاں۔ سیاسی قتل۔‘

’یہ قتل تمہارا بھی ہو سکتا ہے۔ سیاسی قتل.....‘

ریحانہ آہستہ سے بولی۔ اس کے بعد وہ رُکی نہیں۔ کمرے سے باہر نکل گئی۔

## (7)

سپرا کے سر میں تکلیف ہے۔ بہت کچھ گڈ مڈ ہو رہا ہے.... اور گڈ مڈ ہونے کا احساس کوئی نیا نہیں۔ مثال کے لیے اس وقت تیسری آنکھ سے وہ سب کچھ دیکھ سکتا ہے۔ وہ دیکھ سکتا ہے کہ اعلیٰ کمان تک اس کا ذکر ہو رہا ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ پارٹی میں اس کی موجودگی کو پسند نہیں کیا جا رہا ہے۔ اور وہ جانتا ہے کہ میٹنگ میں اس کے بارے میں کیا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ اس وقت وہ سب کچھ دیکھ سکتا ہے اور اس کی تیسری آنکھ کھلی ہے۔ ناستر ودومس اس تیسری آنکھ میں خود آ کر بیٹھ گیا ہے۔ اور وہ اسے اس منظر کو دکھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ جو وہ دیکھنا نہیں چاہتا۔ ایک ہال ہے۔ ایک بڑی سی میز ہے۔ محمود خورشید اور پارٹی کے دوسرے ممبرز خاموش بیٹھے ہیں۔ محمود خورشید انہیں ناول کے کچھ الگ الگ حصے پڑھ کر سنا رہا ہے۔ اس منظر میں اعلیٰ کمان اور قومی صدر کی موجودگی نہیں ہے۔ ذمہ داری کچھ ممبرز پر ڈالی گئی ہے۔ محمود خورشید کچھ الگ الگ حصے سنانے کے بعد خاموش ہو جاتے ہیں۔

سنیتا میڈم کی آواز ابھرتی ہے۔ ویری بیڈ

اعظم قریشی کہتے ہیں۔ باسٹرڈ..... اور چپ ہو جاتے ہیں۔



محمود خورشید کا بیان آتا ہے۔ زیادہ توجہ دینے کی ضرورت نہیں۔ تیسرے درجے کا ادیب ہے۔'

اعظم قریشی کہتے ہیں۔ مگر عوام میں مقبولیت تو ہے۔

رنجن ریڈی کہتے ہیں۔ اقلیتوں کا ووٹ بینک ختم ہو جائے گا۔

محمود خورشید جواب دیتے ہیں۔ کم ہو سکتا ہے ختم تو نہیں ہوگا۔

نیل سریواستو کے چہرے پر الجھن ہے۔ سپرا کو سمجھنا تو چاہیے تھا کہ وہ پارٹی میں ہے۔ پارٹی کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ اس نے تو صاف صاف لکھ دیا کہ سب کچھ راؤ کی نگرانی میں ہوا۔ ذمہ دار راؤ ہے۔

محمود خورشید مسکرائے۔ سب کچھ صاف۔ بی مشن کی ذمہ داری کم۔ حکومت کی زیادہ۔ قاتل ہم ہیں۔ یہی پیغام دیا گیا۔

'یہ پیغام دور تک جائے گا۔'

'ضرور جائے گا۔' رنجن ریڈی نے کہا، وہ عوام میں پسند کیا جاتا ہے۔ اس کی باتوں کو سنجیدگی سے لیا جائے گا۔

نیل سریواستو نے کہا۔ یہ سیدھے سیدھے بغاوت ہے۔

رجنی سنگھ نے ایک نظر سب کی طرف دیکھا۔ پھر کہا۔ لیکن کیا یہ غلط ہے۔ ایسا تو ہوا ہے۔ اس سے ایک اور پہلو سامنے آتا ہے کہ پارٹی میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو صرف کٹھ پتلی نہیں ہیں۔

'یہ پیغام کتنے لوگ سمجھیں گے۔؟'

رجنی نے نیل سریواستو کی طرف دیکھا۔ کیا راؤ کی مرضی کے بغیر پرانی عمارت کو ڈھایا جانا آسان تھا؟'

'آپ بھی سیدھے سیدھے بغاوت کر رہی ہیں۔'

'ابھی بغاوت کئی لوگ کریں گے،' رجنی کی آواز گونجی۔ میں بھولی نہیں ہوں۔ جب امرتسر گولڈن ٹیمپل میں گولیاں چلی تھیں۔ اب یہ حادثہ۔ کیا اس حادثہ کو روکا نہیں جاسکتا تھا۔؟

نورپٹیل نے لقمہ دیا۔' کیا آپ بھی راؤ پر الزام لگا رہی ہیں۔؟'

'میں پوچھ رہی ہوں۔'

'کیا اس طرح کی باتیں ان حالات میں پوچھنا مناسب ہے۔؟'

محمود خورشید نے کہا۔' ہم یہاں مسیح سپرا پر فیصلہ لینے آئے ہیں۔'

نورپٹیل نے سختی سے کہا۔اعلیٰ کمان ناراض ہیں۔بہتر ہوگا کہ اسے پارٹی سے بغاوت کرنے کے جرم میں.....'

'یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ پارٹی مسیح سپرا کے خیال سے اتفاق نہیں کرتی۔'

'یہ معاملہ طول پکڑ چکا ہے۔'

'ہر معاملہ طول پکڑتا ہے۔'

'یہ آزادی کے بعد کا سب سے اہم معاملہ ہے۔'

'اور ہماری ہی پارٹی کو قصوروار کہا جارہا ہے۔'

رجنی نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔' پارٹی میں بولنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ پھر تو میں بھی جلد نکال دی جاؤں گی۔'

نورپٹیل بولے۔' پھر تو آہستہ آہستہ سب بغاوت کرنے لگیں گے۔'

' کبھی بغاوت کے بارے میں سوچا ہے۔؟' نورپٹیل نے مسکرا کر پوچھا۔ 'پارٹی کے لیے مشکل یہ ہوگا کہ ریاستی سطح کی پارٹیاں کامیابی کے ساتھ کھڑی ہوجائیں گی اور دوسرا راستہ بی مشن بن جائے گا۔بی مشن کو کم نہ سمجھئے۔'

'حالات کچھ ایسے ہی ہیں۔'



'میں نہیں مانتا۔' نورپٹیل نے لقمہ دیا۔ وہ سنجیدہ تھے۔ ہماری پارٹی......'

'اب وقت بدل رہا ہے نورپٹیل صاحب۔'

'ہندوستان میں اکیلی ہماری پارٹی ہے.....'

' میں سوچتی ہوں،' رجنی نے بات آگے بڑھائی۔ ریاستی سطح پر ہمارا زوال شروع ہوچکا ہے۔ ہمیں سوچ سمجھ کر فیصلہ لینا ہے۔ یہاں سے بغاوت ہوگی تو ریاستی پارٹیاں اور بی مشن کا راستہ کھلے گا۔ پارٹی کو گمان وغرور سے باہر نکلنا چاہیے۔

'پھر کیا کرنا چاہیے؟' محمود خورشید کی آواز کمزور تھی۔

' ہم ایک بار اعلیٰ کمان سے بات کریں۔ پھر کوئی مناسب فیصلہ لیں۔' رنجن ریڈی بولے

'بہتر۔'

اعلیٰ کمان سے بات اور اگلی میٹنگ پر سب کی مہر لگ گئی — اور میٹنگ برخاست ہوگئی۔

سپرا کا خیال تھا کہ ابھی طوفان کا زور ختم نہیں ہوا ہے۔ایک سلسلہ ہے، جو ابھی ختم نہیں ہوگا۔ابھی ان طوفانوں کو آنا بھی باقی ہے جو ملک کی تقدیر کا نیا صفحہ لکھیں گے۔

سپرا کھڑکی کھولتا ہے تو سامنے عمارتیں نظر آتی ہیں۔ وہ کھڑکی کی سلاخوں کو تھامے سامنے اُگی ہوئی جھاڑیوں کو دیکھتا ہے۔کچھ دیر بے بسی کے عالم میں یونہی باہر کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ واپس اپنے کمرے میں لوٹتا ہے تو دیوار سے لگے ریک پر سجی ہوئی اپنی کتابوں کو دیکھتا ہے۔سرائے میں قتل....قاتل عورت، موت ہے دروازے پر....وہ اپنی ہی کتابوں سے خوفزدہ ہوجاتا ہے۔اس کا دل کرتا ہے

کہ وہ کچھ دیر کے لیے باہر نکل جائے، اس وقت اس کو کھلی اور خوشگوار ہوا کی ضرورت ہے.... اور بند بند فلیٹ سے اس کو گھٹن ہو رہی ہے۔ دروازہ کھول کر وہ کچھ دیر کے لیے باہر نکلتا ہے۔ مخالف سمت میں جامن کے درخت ہیں۔ ایک چھوٹا سا پارک ہے پھر ایک قطار سے کچھ دکانیں بنی ہوئی ہیں۔ کچھ لوگ اسے پہچانتے بھی ہیں۔ مگر اس وقت وہ خود کو لوگوں کی نظروں سے چھپانا چاہتا ہے۔ اسے ایک بڑی تبدیلی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ پرانی عمارت کے ڈھائے جانے سے اخلاق اور کردار دونوں متاثر ہوئے ہیں۔ اب ایک نئی بحث چل پڑی ہے۔ اسے شدت سے احساس ہے کہ وہ حاشیہ پر آ گیا ہے۔ اسے ریحانہ کی لہو سے تر انگلیاں نظر آتی ہیں۔ اس وقت وہ پریشان ہے۔ اس لیے ذہن ودماغ کی اسکرین پر ایک کے بعد ایک منظر تبدیل ہو رہا ہے۔ اور شاید یہ سب بہت ڈراؤنا ہے۔ آنے والے وقت میں بہت کچھ تیزی سے بدل جائے گا۔ سامنے کے فلیٹ سے ایک لڑکی اترتی ہے۔ وہ اس لڑکی کو جانتا ہے۔ عام دنوں میں یہ لڑکی سپرا کی طرف دیکھ کر ہیلو انکل ضرور کہتی تھی۔ پھر یہ بھی پوچھتی تھی کہ ان دنوں آپ کیا لکھ رہے ہیں۔ اسے یقین ہے، لڑکی نے اسے دیکھا ہے۔ مگر وہ خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔ ممکن ہے وہ جلدی میں ہو۔ مگر ایک پہلو اور بھی ہے کہ نظریں بدل رہی ہیں۔ اس وقت وہ شکست خوردہ ہے۔ اور اس لیے اس کے خلاف پارٹی کوئی بھی فیصلہ سنا سکتی ہے—

اس کے پاس میڈیا والوں کے کئی فون آئے۔ اخبارات سے فون آئے۔ مگر وہ ایک خوفزدہ شخص ہے۔ اس لیے سپرا نے کسی سے گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ گھر کے فون بجتے رہے۔ اس نے ریحانہ کو بھی ہدایت کر رکھی تھی کہ فون نہ اٹھایا جائے۔ اسے کسی سے بات نہیں کرنی ہے۔ پبلشر کا فون آیا تھا کہ یہ کتاب سابقہ کتابوں سے زیادہ مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ بلکہ ریکارڈ بنا رہی ہے۔ سپرا کو



یقین ہے کہ معاوضہ اس بار زیادہ ملے گا۔ اگر پارٹی سے الگ ہوتا ہے تو وہ دوبارہ لکھنے کی طرف لوٹ آئے گا اور اس دفعہ پبلشر سے بڑی قیمت وصول کر لے گا اور نیا معاہدہ تیار کرے گا۔

سپرا اچانک ٹھہرتا ہے۔ وہی خانہ بدوشوں کی ٹولی۔ یہ خانہ بدوش دور سے اپنے لباس میں نظر آ جاتے ہیں۔ سپرا کو احساس ہوتا ہے، پہلے یہ خانہ بدوش ملک میں نظر نہیں آتے تھے اب بہت تیزی سے ان کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے.... اور اسے یقین تھا کہ ایسے خانہ بدوشوں کے گھر بار نہیں ہیں۔ وحشیوں کے پاس احساس وجذبات نہیں ہوتے۔ یہ خانہ بدوش دراصل وحشیوں کے قبیلے سے ہیں اور یہ ہر وقت ہتھیار سے لیس رہتے ہیں... اور اب یہ ملک کے چپّے چپّے پر پھیل رہے ہیں۔

وہ دیر تک ان وحشیوں کو دیکھتا رہا جو نعرے لگاتے ہوئے سڑک سے گزر رہے تھے۔ سپرا کو خبر ملی تھی کہ رجنی سنگھ نے پارٹی چھوڑ دی اور خاموشی سے بی مشن کو جوائن کر لیا۔ جوائن کرتے ہوئے اس نے بیان دیا کہ پارٹی اپنے اصولوں سے الگ ہو کر کمزور پڑ گئی ہے.... اور آہستہ آہستہ پارٹی کمزور ہو جائے گی۔ کلا پاسبان نے بیان دیا تھا کہ ملک کی جمہوریت اور ملت کو قائم رکھنے کے لیے سب کو ایک ساتھ ہو کر چلنا ضروری ہے۔ سپرا ان بیانوں کی حقیقت جانتا تھا۔ مگر اس وقت اس کے ذہن میں وحشی ناچ رہے تھے۔ کچھ دیر کی آوارہ گردی کے بعد وہ گھر آ گیا۔

ریحانہ نے خاموشی سے پوچھا۔

’تمھارے چہرے پر تین طرح کے تاثرات ملتے ہیں۔‘

سپرا ایکدم سے چونک گیا۔ ’وہ کیا۔؟‘

’پہلا تاثر۔ بغیر ہتھیار کے خود سے جنگ کر رہے ہو۔

’دوسرا؟‘

’خرگوش اور لومڑی میں فرق کرنا بھول گئے ہو۔‘

’مطلب۔؟‘

’کنفیوژ ہو۔‘

’اور تیسرا؟‘

’ٹھگ بننے جا رہے ہو۔‘

’ٹھگ...امیر علی جیسا....‘ سپرا نے چونک کر دیکھا۔

’امیر علی کیوں۔ دنیا میں صرف ایک ہی ٹھگ ہے کیا....؟‘

’میں ٹھگ کیسے ہو گیا؟‘

ریحانہ زور سے ہنسی.... ’تمھارے اندر جو کشمکش چل رہی ہے، اس کو مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جان سکتا.....اور کشمکش یہ ہے کہ سیاست سے الگ ہوتے ہو تو پبلشر کو ٹھگو گے....‘

’مائی گاڈ۔‘

سپرا اداس موسم سے ایک لمحے میں باہر نکل آیا۔ یہ عورت؟ یہ عورت پاگل ہے یا ناسترودومس؟ یہ کتنا پہچانتی ہے اس کو۔ یہ اس کی آنکھوں کو پڑھتی ہے۔ اور دل کے تمام راز جان لیتی ہے۔ سپرا نے قہقہہ لگایا۔ کتنے دنوں بعد وہ کھل کر ہنسا تھا۔ اس کی چوری پکڑی گئی تھی۔ ریحانہ نے مسکراتی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

’چاند کو زیادہ مت دیکھا کرو۔ تمھارے لیے چائے لاتی ہوں۔‘

سپرا کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

’یہ تم ہی ہو جو مجھے قدیم شہر کے ملبے سے صاف نکال لیتی ہو۔‘

سپرا کو نہیں پتہ کہ ریحانہ تک اس کی آواز پہنچی یا نہیں پہنچی۔ کافی دنوں بعد گھر کا ماحول بدلا تھا۔ وہ ابھی کچھ اور سوچنے کی کیفیت میں نہیں تھا۔ سیاست سے اس



کی نفرت بڑھتی جا رہی تھی۔

## (8)

# پھر وہی خانہ بدوش

وہ ہتھیاروں سے لیس آسمان سے ٹپکے اور زمین پر چھا گئے۔ وہ زمانۂ قدیم کی تہذیبوں کو زندہ کرانے آئے تھے اور اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ پہلے بھی وہ خانہ بدوش تھے۔ صحرا صحرا بھٹکتے تھے۔ اور پتھروں سے آگ نکالتے تھے۔ چھریاں چاقو بناتے تھے اور خانہ بدوشوں کو زمین کا ہر خطہ اپنا لگتا تھا۔۔ وہ ایک بار پھر نئی تاریخ کے روبرو کھڑے تھے۔ جب پتھر نرم تھے اور ہاتھ کھردرے، وہ لہو کی نمائش دیکھنے آئے تھے...اور ان خانہ بدوشوں میں سے کچھ نے مہذب دنیا کو اختیار کیا ہوا تھا اور ان کے ارادے بلند تھے، ان کے گھوڑے ہوا سے باتیں کرتے تھے۔

وشال کرشن ناتھانی قدما کی کتابیں پڑھتا تھا اور نرم اسلحے جمع کرتا تھا۔ اسے یقین تھا، اس نے موجوں کا رُخ تبدیل کر دیا ہے۔ ہوا اس کے اشارے کی محتاج ہے۔ زمین پر خانہ بدوشوں کے قدم جم چکے ہیں اور اب لال قلعہ کی فصیلوں سے

پرچم لہرانے کا وقت آچکا ہے۔ اس وقت بانسری جوشی اس کے ساتھ تھے۔ موسم بہار کا تھا مگر گفتگو میں سنجیدگی تھی۔

— ملبے سے زلزلے کی آوازیں آرہی ہیں۔

وہم ہے، بانسری جوشی نے کہا۔

— ہم ملبہ سے اٹھیں گے۔

’اور چاروں طرف پھیل جائیں گے۔‘

’مگر کچھ خانہ بدوش.....‘ بانسری جوشی کے لہجہ میں شک کے جراثیم تھے۔

’کچھ لوگ۔‘ وشال کرشن ناتھانی دیر تک کمرے میں ٹہلتے رہے۔ پھر بانسری جوشی سے مخاطب ہوئے۔ یہ کچھ لوگ ہمیشہ سے ہیں۔ ان خانہ بدوشوں کو ساتھ لے کر چلنا کبھی کبھی دشوار ہوجاتا ہے۔

’ان میں باغی بھی ہیں۔‘

’اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کون ہمارے ہیں اور کون باغی۔‘ وشال کرشن ناتھانی نے عینک اتاری۔ آنکھوں کو صاف کیا۔ بانسری جوشی کی طرف دیکھا۔

’کیا جمنا کا پانی مختلف سمت بہہ رہا ہے۔؟‘

’اس کا رخ ہماری طرف ہے۔‘

’یہاں سے لال قلعہ کی فصیلیں کتنی دور ہیں۔؟‘

’فاصلہ زیادہ نہیں۔‘

’کیا ان فاصلوں کو اور کم نہیں کیا جاسکتا۔؟‘

’ابھی اتنا بہت ہے کہ ہوا نے رُخ تبدیل کردیا ہے۔‘

ناتھانی ہنسے.....’ اور ہمارے گھوڑے ہوا میں اچھل رہے ہیں۔ قلابازیاں کھا رہے ہیں۔‘



’کیا ہماری سلطنت قائم ہوگی؟‘ بانسری جوشی نے آہستہ سے پوچھا۔

’اب دلّی چار قدم ہے۔‘ ناتھانی نے کہا۔

’یہ چار قدم بہت زیادہ نہیں۔؟‘

’مزید شرارتوں کے صفحے کھولے جاسکتے ہیں۔‘

’نقصان۔‘

’دھند میں سیکولرزم ہے۔‘

’آپ سیکولرزم کو دھند میں دفن نہیں کرسکتے؟‘

’ابھی مشکل ہے۔‘

بانسی جوشی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔’ یہ مت بھولیے کہ ہمارا رتھ بیل گاڑی سے زیادہ کمزور تھا اور رتھ کی چال بھی دھیمی تھی۔‘

’مجھے احساس ہے۔‘

’کل کوئی میزائل لے آئے تو.....؟‘

’دیکھا جائے گا۔ ابھی سرور ونغمہ کا وقت ہے اور گھوڑے ہوا میں اڑ رہے ہیں۔‘

’ان گھوڑوں پر لگام لگایئے....‘

’بانسری.....‘ ناتھانی نے بانسری کو غور سے دیکھا۔ انعام تو تمہیں بھی برابر کا ملے گا۔‘

’مگر تاج کسی اور کا ہوگا۔‘

’مجھے احساس ہے۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ ہم نے ملک کا نقشہ تبدیل کردیا۔‘

’تاریخ بے رحم ہوتی ہے۔‘

’مجھے احساس ہے۔‘ اس بار ناتھانی کا لہجہ کمزور تھا۔’ مگر حکمراں جماعت کے

حوصلے ٹوٹ چکے ہیں۔ انہیں خبر ہے کہ آندھی آسکتی ہے۔'

'وہاں ہمارے لوگ بھی ہیں۔'

'حکمراں جماعت یہ بات بھی جانتی ہے۔'

'اب گھوڑے دوڑانے کا وقت ہے۔' ناتھانی نے گھڑی کی طرف دیکھا، جو دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ 'وقت ضائع کیے بغیر ہمیں ایک اہم میٹنگ میں شامل ہونا ہے۔ انتخابات نزدیک ہیں۔ رتھ کے پہیے مضبوط کرنے ہوں گے۔'

'میں کوشش کرتا ہوں۔' بانسری جوشی جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

●●

ایک اور بغاوت ہوئی تھی۔ کلا پاسبان نے اپنی الگ پارٹی بنالی تھی۔

۱۹۹۱ کے بعد آنے والی ہر تبدیلی پر سپرا کی نگاہ تھی۔ وہ سیاست کا کوئی ماہر کھلاڑی نہیں تھا، مگر آہستہ آہستہ سیاسی چہروں کو قریب سے شناخت کرنے لگا تھا۔ پارٹی دفتر میں اس کی طلبی ہوئی تھی اور سپرا جانتا تھا کہ کوئی بھی فیصلہ سنایا جاسکتا ہے۔ سپرا کو میجر جوجو کی یاد آئی جو کہا کرتے تھے کہ زندگی کے ہر فیصلے کو قبول کرنا چاہیے۔ شروع میں لگتا ہے کہ یہ فیصلہ زندگی کو ناکام بنادے گا۔ پھر ہزار نئے راستے کامیابی کے کھل جاتے ہیں۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ وہاں اسے میجر جوجو کا چہرہ نظر آیا..... یہ کون لوگ ہیں۔ کہاں سے آتے ہیں اور پھر کہاں چلے جاتے ہیں۔

'ذرا سی تفریح چاہیے تمہیں۔ چلو شاپنگ کے لیے چلتے ہیں۔'

اس دن ریحانہ کے ساتھ اس نے شاپنگ بھی کی۔ ریحانہ نے اپنے اور اس کے لیے کچھ نئے کپڑے خریدے۔ ریحانہ کے مطابق شاپنگ کا مطلب تفریح ہے۔ ذہن بوجھل ہوتو تفریح کرلو۔ وہ اس تفریح کے بعد گھر آیا تو اسے پارٹی میٹنگ کا خیال آیا۔ شام میں نور پٹیل اور محمود خورشید کے ساتھ اس کی میٹنگ تھی....



اور اس میٹنگ میں اس کی سیاسی تقدیر کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ وہ اس کے لیے تیار تھا اور اس لیے ذہنی طور پر اسے کوئی پریشانی نہیں تھی۔

میٹنگ آدھے گھنٹے تاخیر سے شروع ہوئی۔ نور پٹیل ٹریفک میں پھنس گئے تھے۔ پہلے مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا۔ چائے پی گئی۔ کسی فیصلے پر پہنچنے تک اس طرح کی فارملٹی کا خیال رکھا جاتا ہے۔ نور پٹیل نے سپرا کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ پھر پوچھا۔

'کسی نئی پارٹی سے آفر تو نہیں۔؟'

'کیوں؟ سب چھوڑ کر جارہے ہیں اس لیے....؟'

'ایسا نہیں ہے۔ جو جارہے ہیں، وہ نقصان میں رہیں گے'

'یہ فیصلہ کون کرے گا، وقت؟' مسیح سپرا نے مسکرا کر پوچھا۔

'پہلے آپ یہ بتائیے کہ ہمارے علاوہ کوئی مستحکم پارٹی ہے؟' محمود خورشید نے اس بار مسکرا کر پوچھا۔

سپرا زور سے ہنسا۔ 'یہی خوش فہمی ہے۔ دروازہ بند کرلیجیے، آندھی آنے والی ہے۔'

'آندھی۔' نور پٹیل چونک گئے۔

مسیح سپرا کا لہجہ اس بار تلخ تھا۔ 'چیل اڑ رہی ہے۔ سامنے عقاب دیکھ رہا ہے۔ گدھ منڈرا رہے ہیں۔ اگر سچ مچ ایسا ہے تو آپ اسے کیا کہیں گے؟ میں دیکھ رہا ہوں اور اس لیے میں مطمئن ہوں۔ آسمان گدھوں سے بھر گیا ہے...اور پارٹی کو اطمینان ہے کہ کوئی مصیبت اس پر نہیں آئے گی۔'

'آپ کہنا کیا چاہتے ہیں مسٹر سپرا؟' نور پٹیل کے تیور سخت تھے۔ 'آپ جانتے ہیں، آپ کی کتاب نے راؤ کا کتنا مذاق اڑایا ہے۔ اپوزیشن کے لوگ لطف لے

رہے ہیں۔'

'اس قدر سنجیدگی سے ناول کو پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ بھی لطف لیجیے۔ ایک مرڈر ہوتا ہے اور آخر میں مرڈر ایک سیاسی قتل ثابت ہوتا ہے۔ اب اس کے درمیان کیا کیا واقعات ہیں، اس پر خاک ڈالیے۔'

'خاک ہی تو نہیں ڈالی جاسکتی۔ آپ راجیہ سبھا کے ممبر بھی ہیں۔'

مسیح سپرا نے اس بار دونوں کی آنکھوں کو غور سے دیکھا۔ کمرے کی سفید دیواروں میں بے شمار چہرے پیدا ہوگئے تھے۔ ہر چہرے کی ایک تاریخ تھی۔ وقت کے ساتھ کتنے ہی چہروں پر گرد پڑ چکی تھی۔ ہال کے باہر سے آوازیں آرہی تھیں۔ میجر جوجو کا چہرہ اب نظروں کے سامنے تھا۔ سپرا کو احساس ہوتا ہے، وہ دھول اور طوفان کی سمت دوڑ رہا ہے۔ اس کے پیچھے کچھ لوگ ہیں۔ دوڑتے ہوئے ایک دروازہ نظر آتا ہے۔ ایک پرانی عمارت ہے۔ یہاں ہوا کا گزر نہیں۔ ایک لیمپ ہے جو ٹمٹما رہا ہے۔ کوئی آہستہ سے کہتا ہے، اٹھارہویں صدی..... کچھ لوگ ہیں، جن کے چہرے گھٹنوں کے درمیان چھپے ہوئے ہیں۔ ایک چہرہ سر اٹھاتا ہے تو یہ محمود خورشید کا چہرہ ہوتا ہے.... مسیح سپرا کو اس خاموشی میں بھی خفت ہوتی ہے کہ وہ کن خیالوں کے درمیان ہے۔ یہاں اس کی سیاسی تقدیر پر مہر لگنے والی ہے اور وہ آندھیوں کا تعاقب کر رہا ہے۔

'آپ کیا سوچتے ہیں۔' نور پٹیل کی آنکھیں اس بار جھکی تھیں۔

'میرا سوچنا ضروری نہیں ہے۔ سوال ہے کہ آپ کیا سوچتے ہیں۔'

'اعلیٰ کمان ناراض ہیں۔' محمود خورشید کی آواز ابھرتی ہے۔

'کیا آپ اس ہال کے باہر دیکھ رہے ہیں؟' مسیح سپرا دونوں کی آنکھوں میں جھانکتا ہے۔



'ہال کے باہر.....؟'

'خانہ بدوش ہیں۔ ان کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اور ایک طوفان ہے۔'

'آپ مستقبل کی بات تو نہیں کر رہے؟' نور پٹیل کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

'ہال کے باہر ایک دھند ہے۔ ریاستی سطح کی پارٹیوں کے قد میں اضافہ ہوا ہے۔ اور بی مشن مضبوط۔ کھیلنے کا وقت پہلے بھی نہیں تھا مسٹر نور پٹیل۔ آزادی کے گواہ سب تھے لیکن مسلمان لٹو تھے۔ لٹو؟ لٹو جانتے ہیں آپ؟ میں نے نچایا ہے لٹو۔ مسلمان لٹو کی طرح ناچ رہے تھے۔ آپ ان کے ہاتھوں میں تسبیح تھما رہے تھے۔ پانچ وقت کی نماز اور پارٹی۔ آپ جانتے ہیں، اس راگ کا مطلب کیا ہے؟ آنے والے وقت میں مسلمانوں کے ہزار برس کا حساب لیا جائے گا اور آزادی کے بعد کے برسوں کا بھی۔ آپ کے پاس ایک ڈگڈگی تھی۔ جمہوریت کی۔ پرانی عمارت نے وہ ڈگڈگی چھین لی۔ پھر بھی آپ کو کرگس نظر نہیں آرہے۔ نہ چیل نہ گدھ۔ میں تو بس یہی دیکھ رہا ہوں کہ پارٹی کی بنیاد رکھنے والا بھی ایک فرنگی تھا.... اور پارٹی ایک خوبصورت یوٹو پیا میں جیتی رہی۔ مگر اب.....'

'اب کیا؟' محمود خورشید کا چہرہ سرخ تھا۔

'اخروٹ توڑنے میں کبھی کبھی ہاتھ زخمی ہوجاتے ہیں۔'

'یہاں اخروٹ کا ذکر کیسے آگیا؟' نور پٹیل کے چہرے پر ناراضگی تھی۔

'اخروٹ۔' مسیح سپرا نے قہقہہ لگایا۔ خانہ بدوشوں کو اخروٹ پسند ہیں۔ اور اب اخروٹ کا موسم آنے والا ہے۔'

'واہیات۔'

'بے بنیاد باتیں۔'

'اخروٹ کا ذکر بے بنیاد ہے مگر راؤ کا نہیں۔ جبکہ پورا ملک یہ جانتا ہے کہ راؤ

چاہتے تو پرانی عمارت محفوظ رہتی۔'

'یعنی کھلی بغاوت۔'

'ہم گلے میں پھندا ڈالے بیٹھے ہیں۔ ناتھانی اور جوشی ریس لگا رہے ہیں۔'

'اس سے کیا ہوگا۔'

'ایک دن تاریخ زرد پتے کی طرح جھڑ جائے گی۔ پھر آپ بھی حاشیہ پر ہوں گے۔'

'بالکل بھی نہیں۔ غلط فہمی ہے آپ کی۔' محمود خورشید ذرا زور سے بولے۔

'جب تاریخ بدل رہی تھی ہماری لیڈرشپ یا تو قبرستانوں میں اونگھ رہی تھی یا دفن ہونے کی تیاری کر رہی تھی۔'

مسیح سپرا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب اس کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ہال کے باہر بہت سے لوگ کھڑے تھے۔ وہ سیڑھیاں اتر کر لان میں آ گیا۔ اسے یقین تھا، اب وہ آزاد ہے۔ اور وہ کسی قبرستان میں نہیں ہے۔ اس کو یاد آیا، اسے شاپنگ کرنی ہے۔ پبلشر سے ملاقات طے ہے۔ وہ کسی ریستوراں میں کھانا کھائے گا۔ اور اپنی آزادی کا جشن منائے گا۔ اس درمیان سپرا خاموشی سے اپنا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی گول گول پتلیاں حرکت میں تھیں۔ پاؤں تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ ہتھیلیاں گرم تھیں۔ کچھ چھوٹ رہا ہے۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ وہ پلٹا اور ایک بار پھر سے اس کمرے میں تھا، جس کی دیواریں سفید تھیں۔ زمین پر بھی سفید ٹائلس بچھے تھے۔ دیواروں پر کوئی پینٹنگس نہیں تھی اور چھت سے دو پنکھے جھول رہے تھے۔ نورپٹیل اور محمود خورشید نے چونک کر، پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔



سپرا مسکرایا۔ 'ایک بات رہ گئی تھی.....' وہ پھر مسکرایا... 'ان کمروں میں چھپکلی نہیں ہے۔ ہونی چاہیے.... چھپکلی کیڑوں کا صفایا کر دیتی ہے۔' وہ مسکرا رہا تھا۔

'تو تم یہی کہنے آئے ہو....' نورپٹیل نے پوچھا۔

'نہیں۔ پارٹی کی سب سے بڑی غلطی تھی کہ آزادی کے صرف دو برس بعد پرانی عمارت کا قفل کھول دیا۔ یہ قفل ذرا سی عقل اور رضامندی کے ساتھ بند کیا جاسکتا تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا.....'

'ہونہہ۔' محمود خورشید کا چہرہ فق تھا۔

'پھر آج جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کی ضرورت پیش نہیں آتی... اور بہتر ہے کہ....'

'کیا بہتر ہے؟' نورپٹیل کا چہرہ بھی زرد تھا۔

'ایسے تمام کمروں میں دو ایک چھپکلیاں ضرور ہونی چاہئیں۔'

سپرا مسکرایا۔ اس کے بعد وہ ٹھہرا نہیں۔ گاڑی میں بیٹھا اور گھر کی طرف چل دیا۔ اسے ریحانہ کو ساتھ لے کر شاپنگ کے لیے جانا تھا۔ پروگرام میں تبدیلی آ گئی تھی۔ اس کے بعد اسے پبلشر سے ملنا تھا۔ اس نے کچھ اور بھی سوچ رکھا تھا۔ جیسے اسے کتّے پسند تھے۔ اس نے جنگلی کتّوں کے بارے میں کافی پڑھا تھا۔ کچھ کتے بھیڑیے کی نسل سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ایک بل ڈوگ پالنا چاہتا تھا۔ مگر کتے ریحانہ کو پسند نہیں ہیں۔ ریحانہ کہتی ہے، گھر ناپاک ہو جاتا ہے۔ کتوں کی موجودگی سے گھر میں فرشتے نہیں آتے۔ مسیح سپرا اب خود کو آزاد محسوس کر رہا تھا، جبکہ ابھی تک فیصلہ نہیں آیا تھا اور اسے علم نہیں تھا کہ اس کی سیاسی تقدیر کا فیصلہ کیا آنے والا ہے۔

آگے ٹریفک جام تھا۔ کوئی حادثہ ہو گیا تھا۔ سپرا نے دیکھا، ایک موٹر سائیکل والا تھا۔ وہ بری طرح زخمی تھا اور پولیس اسے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کچھ دیر

میں ٹریفک صاف ہوگیا۔ اب سپرا کی گاڑی ہائی وے پر دوڑ رہی تھی۔

وہ اپنی آزادی کا جشن منانا چاہتا تھا۔ نئے ناول کا پلاٹ بھی اس نے سوچ رکھا تھا۔ مستقبل کی موت... اسے احساس تھا، خانہ بدوش اب مستقبل پر گولیاں چلا رہے ہیں۔ سارے خانہ بدوش ایک جیسے نہیں ہوتے۔ مگر کچھ..... اسے ان جنگلی خانہ بدوشوں سے شکایت تھی جو ملک کی تقدیر بدلنا چاہتے تھے۔ اور اس کے لیے انسانی لہو سے کھیلنا ضروری تھا۔



# باب دوم

## نئی دنیا، پرانی عمارت اور مردہ گھر

ایک دن
جب زمینیں کھودی جائیں گی ،صرف مردہ گھر نکلیں گے
لیکن ہم



ان مردہ گھروں کی شناخت نہیں کر پائیں گے

(1)

سڑکوں ، چوراہوں پر ترشول اٹھائے اب ان خانہ بدوشوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ سپرا نے ان خانہ بدوشوں کو ہالی ووڈ کی فلموں میں دیکھا تھا۔ مارخیز کے ناول میں یہ بھلے خانہ بدوش تھے جو ہر دن نئی دنیا سے ٹکرا رہے تھے۔ ان کا ایک سماج تھا اور اس سماج میں محبت جیسی شے بھی قائم تھی۔ مگر ان خانہ بدوشوں کے چہرے سے زہریلے پوسٹر جھولتے تھے اور ان کے پیچھے وہ لوگ تھے جو تعلیم یافتہ تھے، مہذب معاشرے کے ٹھیکیدار تھے مگر ان کا تعلق اس کیمپ سے تھا، جس کی بنیاد پر نفرت کی فصیلیں قائم کر کے ہی یہ اپنی سلطنت کی بنیاد رکھ سکتے تھے۔

گلیشیرس پگھل رہے تھے۔ سائبریا میں گھاس اُگ رہی تھی۔ سائنس کی تجربہ گاہ میں انسان بنائے جا رہے تھے اور نا سا نئی دنیاؤں کی دریافت کے لیے تجربے کر رہا تھا۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد بھی جنگوں کے دروازے کھلے تھے۔ اب ایٹمی ہتھیاروں کی باتیں پہلے سے کہیں زیادہ ہونے لگی تھیں۔ دنیا کے چھوٹے چھوٹے ممالک بھی ایٹمی ہتھیار بنانے پر زور دے رہے تھے۔ اور جیسا کہ ہرمن

ہیسے نے اپنے ایک ناول میں لکھا تھا، ایک نئی دنیا، مرغی کے انڈے سے باہر نکلنے والی ہے....اور یہ دنیا ان لوگوں کے لیے خطرناک ہوگی جو پرانی دنیاؤں سے ابھی بھی چپکے ہوئے ہیں۔

سپرا کی آنکھوں میں ایک ٹائم مشین فٹ تھی، جس سے ہوکر وہ اکثر ماضی کی وادیوں میں نکل جاتا تھا۔ اسے شدت سے احساس تھا کہ بچپن سے اب تک کافی حدتک تبدیلی آچکی ہے۔مگر اس تبدیلی کو بہتر ماننے سے وہ انکار کرتا تھا۔ جب کوئی سہولت یا آسانیاں نہیں تھیں، جب گرمی کے موسم میں پنکھے بھی نہیں ہوتے تھے اور جسم پسینے سے تر بتر ہوا کرتا تھا تب ایک آزادی تھی۔ دوڑنے کی آزادی....خوش رہنے کی آزادی۔ اپنی بات کہنے کی آزادی۔ وقت کے چھلانگ لگاتے ہی آزادی کا تصور بہت حدتک ختم ہوگیا تھا۔

یہ دوسرے دن کی خوشنما صبح تھی۔

وہ باہر لان میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ریحانہ چائے کا طشت لے کر آگئی۔وہ آہستہ آہستہ چائے کا لطف لیتا رہا۔اس نے ریحانہ کی طرف دیکھا جو اپنی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔

’کیا تم مانتی ہو کہ نئی دنیا کا کوئی خیال ہے جو ہمارے ساتھ چلتا ہے۔‘

’نہیں، میں نہیں مانتی۔ دراصل یہ پرانی دنیا ہے، جس میں ہم زندہ ہیں۔‘

ریحانہ سپرا کی طرف دیکھ رہی تھی۔

’یعنی نئی دنیا کا کوئی تصور؟‘

’ایسا کوئی تصور نہیں۔ یہ وقت ہے جو آگے بڑھتا ہے اور اپنے حساب سے بڑھتا ہے۔کبھی کبھی ہم یہ بھی کہہ دیتے ہیں، وقت تیزی سے بھاگ رہا ہے۔ یہ



کیسے ممکن ہے۔ وقت تیزی سے کیسے بھاگ سکتا ہے۔؟ ہم بچے ہوتے ہیں۔ پھر ایک دن بوڑھے ہوجاتے ہیں۔صد ہا سال سے ایک ہی دنیا ہے جو ہمارا تعاقب کررہی ہے۔‘

’سائنس، گلوبل تبدیلی.....اور‘

’یہ سب نئی اصطلاحیں ہیں۔ ہم ہمیشہ پرانی دنیا کے تعاقب میں رہتے ہیں... اور نئی دنیا کے احساس کو قائم رکھنے کے لیے نئی اصطلاحیں گڑھتے رہتے ہیں۔‘

لیکن ایک نئی دنیا تھی اور اس دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو سپرا نے اس سے قبل محسوس نہیں کی تھیں۔ نئی پرانی دنیا کے تصور میں وقت کا پیمانہ رہ جاتا ہے۔ ایک درزی ہے جو لباس کے لیے جسم کا ناپ لے رہا ہے۔ ایک وقت ہے جو کبھی پیچھے چلا جاتا ہے اور کھسک کر پاس آجاتا ہے۔ ریحانہ اس تصور کو نہیں مانتی تھی مگر اس کے باوجود ایک نئی دنیا برآمد ہورہی تھی۔اس درمیان بغاوت کے جرم میں، سپرا کو پارٹی سے نکال دیا گیا۔ راجیہ سبھا سے استعفیٰ دینا پڑا۔ سپرا اپنی کرائم کی دنیا میں واپس آگیا۔

۱۹۹۵ تک سیاست کی دنیا میں کئی طوفان آچکے تھے۔ پرانی عمارت کا معاملہ گرم تھا۔ ایک نئی دنیا اور بھی سامنے تھی۔ اب ٹی وی گھر گھر پہنچ چکا تھا اور کتابیں پڑھنے کی روایت بہت حدتک کم ہوچکی تھی۔ جاسوسی، رومانی کتابوں کا مارکیٹ بھی زد میں آیا تھا۔ پبلشر نے کئی بار شکایت کی۔ اب ڈیمانڈ کم سے کم ہوتی جارہی ہے۔ پتہ نہیں آنے والے برسوں میں کیا ہوگا۔ سپرا پر کئی سیاسی پارٹیوں کا دباؤ تھا مگر اس نے خود کو سیاست سے الگ رکھا۔ وہ اب اس دنیا سے خود کو علیحدہ کرچکا تھا۔ اس درمیان کاشف کی پیدائش ہوئی۔ اب ایک ننھے سے لوتھڑے کو چہرہ اور جسم مل چکا

تھا۔ ریحانہ خوش تھی۔ سپرا کو بھی باپ بننے کی خوشی تھی۔ یہ خون کا رشتہ بھی کیسا عجیب ہوتا ہے۔ پہلے وہ کسی نوزائیدہ بچے کو دیکھتا تو چھونے سے بھی گھبراتا تھا اور اب۔ سارا دن وہ کاشف کے اردگرد گھومتا رہتا۔ سپرا زمانے کی چال کو دیکھ رہا تھا۔ مصروف ترین دنیا کے لوگ کتابوں سے کٹ گئے تھے۔ اب ٹی وی کی دنیا تھی اور نئے نئے سیریل۔ کچھ ایسے بھی سیریل تھے کہ دکانیں بند ہوجاتیں۔ سڑکوں پر سناٹا چھا جاتا۔ ہر شخص اپنا پسندیدہ سیریل دیکھنے کے لیے گھر میں وقت گزارنا چاہتا تھا۔ پھر ٹی وی پر فلمیں دکھانے کا رواج شروع ہوا تو کتابیں پڑھنے والوں کی تعداد اور کم ہوگئی۔ سپرا کو پبلشر نے بلوایا تھا۔ سپرا کو یاد ہے۔ پبلشر اداس تھا۔ وہاں کام کرنے والوں کی تعداد بھی کم ہوچکی تھی۔ پہلے بہت سے لوگ ہوا کرتے تھے۔ خاص کر رامیشور سے اس کی بہت بنتی تھی۔ رامیشور سیلس دیکھتا تھا اور اس کا قاری بھی تھا۔ پبلشر نے رامیشور کو بھی نکال دیا تھا۔ سپرا کو احساس ہوا کہ اب ایک ایسی دنیا سامنے ہے جہاں ہر طرح کی کتابوں کی ضرورت کم ہوچکی ہے۔ پہلے ٹرین، ہوائی جہاز ہر جگہ کتابیں پڑھتے ہوئے لوگ ملتے تھے۔ مگر اب، گلیشیرس پگھل رہے تھے اور کتابیں پانیوں میں تیر رہی تھیں۔

پبلشر نے ذرا ٹھہر کر کہا۔ ’سوچتا ہوں، کوئی اور پیشہ اختیار کروں۔‘

سپرا نے کچھ بھی نہیں کہا۔

’اب کتابیں نہیں بکتیں۔ پہلے لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوتی تھیں۔ اب پڑھنے والے نہیں رہے۔‘

سپرا نے اس بار بھی خاموشی سے کام لیا۔

’آپ کیا سوچتے ہیں۔؟ ‘

سپرا مسکرایا۔ ’جب مارکیٹ نہیں۔ تو ہم بھی نہیں۔ ہم تو مارکیٹ کا حصہ



ہیں۔ جب پڑھنے والے نہیں تو آپ بھی نہیں۔‘

’اب نیا بازار ہے۔‘ پبلشر کی آواز کمزور تھی۔

’بہتر ہے، آپ ماڈرن جوتوں کی ایک بڑی دکان کھول لیں۔‘

’ماڈرن جوتے....؟‘

’کتابوں میں اور جوتوں میں فرق یہ ہے کہ جوتے ہمیشہ بکیں گے اور ایک دن ایک کتاب کا فروخت ہونا بھی بند ہوجائے گا۔‘

پبلشر مسکرایا۔ ’مجھ سے زیادہ آپ حالات کو سمجھ رہے ہیں۔‘

’میں بھی سوچ رہا ہوں......‘

’کیا۔؟‘

’جب آپ جوتوں کی شاپ کھولیں گے تو وہاں نوکری کرلوں گا۔‘

مسیح سپرا باہر آیا تو اس کا سر گھوم رہا تھا۔ وہ سیاست سے پہلے ہی الگ ہوچکا تھا۔ اب کرائم بڑھ رہے تھے۔ مگر کرائم اسٹوری کوئی پڑھنا نہیں چاہتا تھا۔ ٹی وی پر کئی کرائم اسٹوری سیریز دکھائی جارہی تھی۔ یہ بھی ایک تبدیلی تھی۔ سپرا نے خیال کیا، اس کے ساتھ کے لکھنے والے اچانک زمین پر آگئے۔ ایسے لوگ جو کتابوں کی بدولت زندہ تھے اور جن کے فرضی ناموں کو ایک دنیا جانتی تھی، اب یہ فرضی چہرے وقت کی دھند میں گم ہونے کی تیاری کررہے تھے۔ ایسا ہی ایک چہرہ اس کا بھی تھا۔ ایک فرضی چہرہ۔ لیکن سیاست میں اس نے کچھ پیسے بنائے تھے اور کچھ دولت کتابوں کی مارکیٹ سے بھی اس کے حصے میں آئی تھی۔ آگے کیا کرنا ہے، وہ زیادہ اس بارے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر یہ خیال ضرور تھا کہ اس کو وقت کے ساتھ چلنا ہے۔ بدلے ہوئے

موسم میں کبھی کبھی آسمان پر آنسوؤں کی جھلملاہٹ نظر آتی، جو بارش کی صورت
برس تو جاتے لیکن اس سے ماحول پر زیادہ کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ کبھی کبھی آگ
کی لپٹیں دکھائی دیتیں۔ شمال میں انگریزوں کا ایک پرانا چرچ تھا، جس کے بند
دروازے کے اندر اکثر وہ چمگادڑوں کو الٹا لٹکے ہوئے اور کبھی کبھی اڑتے ہوئے
دیکھتا تھا۔ وقت کی زد میں اب اقلیتی طبقہ بھی آچکا تھا۔ گرمیاں شروع ہوگئی
تھیں۔ اندھیری راتوں میں جب آسمان زمین پر جھکا نظر آتا تو تاحد نظر اسے
کیکٹس کے درخت نظر آتے۔ یہ اس کا وہم تھا لیکن کیکٹس کے درختوں کو مسلسل
دیکھنا اسے اچھا لگتا تھا۔ کیکٹس سے نکلے ہوئے کانٹے سیدھے اس کی روح کو
زخمی کرتے تھے اور ان کی چبھن کا احساس پرانے گڑے مردوں کی یاد دلاتا تھا۔
دلی والے ویسے بھی اب دیر تک جاگنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ مگر سپرا کو یقین
ہے، وہ ان شعلوں کو ضرور دیکھتے ہوں گے، جو کبھی کبھی آسمان سے اٹھتے ہوئے
نظر آتے تھے۔

خانہ بدوش مطمئن تھے کہ بغاوت اب زیادہ دور نہیں۔ اور اسی طرح پارٹی
مطمئن تھی کہ ۱۹۲۵ سے اب تک یہ سرد الاؤ تو جلاتے رہے مگر حاصل کچھ نہیں ہوا
اور اس لیے پرانی عمارت کا غم یا حادثہ دلوں سے جلد نکل جائے گا۔ وشال کرشن
ناتھانی کو وہ شخص عزیز تھا جو اکثر ان کا خیال رکھتا تھا اور انہیں چائے پلایا کرتا تھا۔
جبکہ نانبائی نے کئی بار انہیں ہدایت دی تھی کہ لوگوں کے چہرے کو پڑھنا سیکھیں ورنہ
آئندہ مشکل ہو سکتی ہے۔ اور ناتھانی اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے مطمئن تھے
کہ فضا اب ان کے حق میں ہے۔ اور بدلتے ماحول میں نئی پارٹی کو اس کا فائدہ مل
سکتا ہے۔

سپرا کاشف اور ریحانہ کو لے کر اب دوسرے فلیٹ میں آ چکے تھے۔ راجیہ سبھا



والا مکان اب کسی اور ممبر کے حوالے کیا جا چکا تھا۔ اس بات سے سپرا کو کوئی زیادہ
فرق نہیں پڑتا تھا۔ ہاں، اب وہ اپنے ناول کی تیاری کر رہا تھا اور اس ناول میں
پرانی عمارت کا ذکر بھی تھا۔ پرانی عمارت کو مسمار کرنے کے درمیان ایودھیا میں
ایک شخص کا قتل ہوا تھا اور تفتیش کا مرحلہ ایسا دلچسپ مرحلہ تھا کہ نئے نئے انکشافات
سامنے آرہے تھے۔ سپرا کو یہ بھی یقین تھا کہ بہت جلد پبلشر اپنی کتابوں کی دوکان
بند کر دے گا اور دوکان کی جگہ بھلے جوتوں کی دکان نہ کھولے، کوئی دوسرا کاروبار تو
شروع کر ہی دے گا۔ ایسا کاروبار جس میں منافع ہو۔

اس میں شک نہیں کہ سن ۲۰۰۰ء آتے آتے یہ پوری دنیا بہت حد تک تبدیل
ہو چکی تھی۔ سیاست میں اخلاقیات کے معنی بدل چکے تھے۔ زندگی بدل چکی تھی۔ اور
بدلنے کی رفتار اتنی تیز تھی کہ ہر دوسرے دن سائنس اور تکنالوجی کے نئے نئے
کارنامے اور کرشمے سامنے آجاتے تھے۔ سن ۲۰۰۰ء تک بچوں کی دنیا بدل چکی تھی۔
پہلے جہاں صرف دوردرشن دکھایا جاتا تھا، اب بہت سے ٹی وی چینلز آ چکے تھے۔
اب کوئی سرکاری بھونپو کی طرف توجہ بھی نہیں دیتا تھا۔ کاشف پانچ برس کا ہو گیا تھا۔
ریحانہ شوگر اور دیگر امراض میں گرفتار ہو کر پریشان رہنے لگی تھی ... اور آسمان پر
عقاب اڑ رہے تھے۔ بی مشن نے حکومت بنالی تھی۔ پارٹی کا غرور خاک میں مل گیا
تھا مگر پارٹی کو اس کا علم تھا کہ ان کی واپسی ضرور ہوگی۔ مگر یہ علم نہیں تھا کہ ان کی
واپسی کا کتنا اثر ملک کے عوام پر پڑے گا۔ کیونکہ عوام کے فکر میں بہت تیزی کے
ساتھ تبدیلی آئی تھی۔ سب سے بڑی تبدیلی یہ تھی کہ نئے بچوں کے کھان پان کا
تصور بدل گیا تھا۔ اب فاسٹ فوڈ کا زمانہ تھا۔ بچے فاسٹ فوڈ کی دنیا میں، خود کو نئی
زندگی میں محسوس کر رہے تھے۔ ماں باپ کے ساتھ یا خاندان کے ساتھ رشتوں کی

ڈور بہت حد تک کمزور پڑ چکی تھی۔ یہ بدلا ہوا ہندوستان تھا۔ جبکہ صبح کی کرنوں میں ابھی بھی اس پرانے ہندوستان کی جھلک دیکھنے والوں کو نظر آتی تھی۔ گلابی دھوپ کا پیغام پڑھنے والوں کی کمی تھی۔ مگر زندگی تیز رفتار ہوگئی تھی۔ سن ۲۰۰۰ء کی شروعات نے سب سے بڑا حملہ اقتصادیات پر کیا۔ کئی ملکوں میں چیخ وپکار مچ گئی۔

ہندوستان میں کمرشیل نائٹ سروس کا آغاز ہوا۔ نوجوان بچے غیر ملکی اداروں سے وابستہ ہونے لگے جہاں پیسے بہت زیادہ تھے اور زندگی آپ کو زیادہ غور وفکر کرنے کا موقع نہیں دیتی تھی۔

۲۰۰۵ء تک کاشف دس برس کا ہو چکا تھا۔ سپرا کو اب کاشف کی فکر ہو رہی تھی۔ اس درمیان کئی ملکوں میں آنے والی سونامی نے بھی معیشت پر حملہ کیا تھا اور اس بات کا احساس دلایا تھا کہ ارنیسٹ ہیمنگ وے کا بوڑھا آدمی ہر مورچے پر کامیاب نہیں رہتا۔ سمندری غصے کے آگے انسان بے بس اور لاچار ہے۔ اور یہ لاچاری اس ملک میں اس وقت دیکھنے میں آئی جب گجرات میں ہونے والے فسادات نے ہندو اور مسلمانوں کو دو زہریلے حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

اور اس میں شک نہیں کہ ریاست کے سربراہ نے معصوموں پر گولیاں چلوائی تھیں اور اس شخص کو یہ عہدہ کرشن ناتھانی کی خدمت سے ملا تھا۔ کرشن ناتھانی کا ایک خواب تو پورا ہوا لیکن جس خواب کے لیے انھوں نے رتھ یاترا سے سماج کو تقسیم کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا، وہ خواب ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ مگر سیاست میں ناتھانی کی حیثیت مضبوط تھی۔ اور یہ وہی زمانہ تھا جب گاڑیوں کی زیادہ آمد ورفت کی وجہ سے جمنا کا پل کمزور ہو گیا تھا۔ ابھی فلائی اوورس کے جال نہیں بچھے تھے۔ ریاستی سطح کی نئی پارٹیاں سر نکال رہی تھیں اور سب سے بڑا خطرہ اس پارٹی کو تھا، جو اب تک خوش فہمی میں تھی کہ آئندہ بھی اسی کی حکومت قائم رہے گی، جبکہ عوام کی نفسیات،



تبدیلیاں، ہوا کا رُخ، بدلتے موسم کو دیکھنے میں پارٹی پوری طرح ناکام رہی تھی۔ اس درمیان کئی سیاسی قائد آئے اور گئے۔ ملک ایک کھلونا تھا، جس سے کھیلنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ پارٹی کو یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ ایک دن پارٹی میں روح پھونکنے والے قائد بھی حاشیے پر ڈالے جا سکتے ہیں اور یہی پارٹی کی سب سے بڑی کمی تھی کہ ان کے کسی بھی لیڈر کے پاس مستقبل کی پلاننگ یا دور اندیشی نہیں تھی۔

کاشف اب اسکول جانے لگا تھا۔ اور دس برس کی عمر میں ہی اس کی ڈیمانڈ یہ تھی کہ اس کو ایک موٹر سائیکل چاہیے۔ ریحانہ سے زیادہ سپرا خائف تھا۔ دس برس کا بچہ موٹر سائیکل کیسے چلائے گا مگر کاشف کا بچپن یہ تھا کہ وہ پستول، راکٹ لانچرس اور ایسے ویڈیو گیمس میں پناہ لیتا تھا، جو سپرا کے نزدیک بہتر نہیں تھے۔ دس برس کی عمر سے ہی اس نے گھر کے کھانوں سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے لیے میک ڈونالڈ جیسی کمپنیوں سے پزا اور برگر کے آرڈر دیے جاتے تھے۔ اس کو چاؤمین پسند تھا۔ ریحانہ ناراض ہوتی تھی کہ اس کا اثر کاشف کی صحت پر پڑے گا۔ یوں تو کاشف دس برس کی عمر میں بھی متوازن شخصیت کا مالک تھا۔ مگر آہستہ آہستہ اس میں ایک خاص قسم کی بغاوت بھی پیدا ہو رہی تھی۔ دوسرے بچوں کو دیکھ کر اس کی فرمائشوں کے انداز بھی تبدیل ہو رہے تھے۔ سپرا نے سوچ رکھا تھا کہ ہر ممکن وہ کاشف کی مدد کرے گا۔ کیونکہ کاشف اور ریحانہ اس کی زندگی کے لیے سب سے زیادہ معنی رکھتے ہیں اور ان دونوں کو الگ کر کے وہ اپنی زندگی کے بارے میں کوئی تصور نہیں کر سکتا۔

لیکن کچھ باتیں تھیں جو سپرا کو ناگوار بھی گزرتی تھیں۔

’میرے دوست کے پاپا منسٹر ہیں۔‘

‘ہوں گے۔’

‘وہ پوری فوج کے ساتھ آتا ہے۔’

‘آتا ہوگا۔’

‘اس کے پاس بہت مہنگی گاڑی ہے۔’

‘گاڑیاں سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔’

‘وہ بہت تیز موٹر سائیکل چلاتا ہے۔’

‘اور میں ابھی تم کو موٹر سائیکل چلانے نہیں دے سکتا۔’

‘کیوں؟’

‘کیونکہ میرا ایک ہی بیٹا ہے کاشف۔’

‘یہ کیا بات ہوئی۔ وہ بھی اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔’

‘ان کی بات ہم سے مختلف ہے۔’

‘وہ زیادہ پیسے والے ہیں اس لیے۔’

‘یہ دنیا پیسے والوں سے نہیں چلتی۔’

‘پھر کس سے چلتی ہیں۔’

‘یہ بات آہستہ آہستہ تمہاری سمجھ میں آئے گی۔’

‘اور نہیں آئی تو؟’

‘اس کے ذمہ دار تم ہوگے۔’

کاشف میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ زیادہ بحث نہیں کرتا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ اس میں تبدیلی آرہی تھی۔ پندرہ برس کی عمر میں اس نے اچھا خاصہ ہاتھ پاؤں نکالا تھا۔ ہلکی سی مونچھ بھی آگئی تھی۔ وہ ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ ریحانہ کا عالم یہ تھا کہ کاشف کہیں بھی جاتا، وہ اس کے لیے صدقہ نکالتی۔ دعائیں پڑھ کر پھونکتی، پھر



اسے جانے دیتی۔ اور جب تک کاشف گھر نہیں لوٹتا، وہ پریشان رہتی تھی۔

۲۰۱۰ تک ہماری دنیا لینڈ لائن اور سرکاری فون سے باہر نکل آئی تھی۔ اب موبائل کا زمانہ تھا اور دنیا کے اڑنے کی رفتار بہت تیز تھی۔ ہم جس قدر سہولتوں کے عادی ہوتے ہیں، اسی سطح پر ہم ایک زمانے سے کٹ بھی جاتے ہیں۔ پریوں کی کہانیاں گم ہوگئیں۔ شہزادی شہزادے وقت کے اندھیرے میں کھو گئے۔ بادشاہوں کے قصے پرانے پڑ گئے۔ نصاب نئے ہوگئے، فکر بدل گئی، کمپیوٹر، موبائل اور لیپ ٹاپ نے بچوں کی زندگی کے مزاج اور معیار کو تبدیل کر ڈالا۔ سپرا کو احساس تھا، اسی تبدیلی سے ایک مردہ گھر پیدا ہو رہا ہے اور وہ اب مردہ خانے کے احساس سے خوفزدہ ہونے لگا ہے....

‘رجنی چلی گئی۔ مگر کیسے؟’

‘شارو چلا گیا۔ کیا بات؟’

‘مہندرو کی ابھی عمر ہی کیا تھی..’

‘بڑی باجی کو کیا ہوا تھا؟’

‘منجھلی باجی کا بیٹا تو اب کاشف کے ساتھ کا تھا....ایسا کیسے ہوگیا...؟’

‘ناظر میاں کے ساتھ تو کل اس نے شطرنج کھیلا تھا۔’

‘واصف بھائی کے ساتھ کل صبح جاگنگ کی تھی۔’

‘نارائن کیسے جا سکتا ہے...؟’

‘رشمی کو کیا ہوا تھا....؟’

ہر دن ایک موت....اور اس میں شک نہیں کہ موت سپرا کے احساس کو قید کر لیتی ہے۔ سپرا کئی دنوں تک موت کے احساس سے باہر نہیں نکل پاتا۔ یہ

قریبی لوگ.....دوست، رشتے دار..... یہ سارے گم ہو کیسے سکتے ہیں؟ جیسے جیسے عمر بڑھ رہی تھی، جانے والوں کا قافلہ تیز تھا۔ ہر دوسرے دن کسی نہ کسی کے بارے میں کوئی خوفزدہ کرنے والی خبر آجاتی۔ کسی کو ہارٹ اٹیک، کسی کو ہیمرج، کسی کو کینسر.....ایک بیمار دنیا، جہاں موت کا اندھیرا بڑھ چکا تھا اور کچھ لوگ اس بیمار دنیا میں نفرت کے پوسٹر لے کر کھڑے تھے۔ یہ تضاد اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

پزا اور برگر کی دنیا کا ہر دن اب اسے تکلیف پہنچانے لگا تھا اور کاشف کی کچھ باتیں بھی ایسی تھیں، جو اسے پسند نہیں تھیں۔

— میں چھٹیوں میں گوا جا رہا ہوں

— اسکول کے بچوں کے ساتھ دبئی جانا ہے۔

— فٹ بال کی پریکٹس کرنی ہے

— کرکٹ کے لیے جا رہا ہوں۔

'چوٹ مت لگانا' ریحانہ ہمیشہ ایک ہی بات کہتی۔ صدقہ اتارتی۔ دعا پڑھ کر پھونکتی پھر کاشف کو جانے دیتی۔ وہ کچھ سوال کرتا تو جواب ملتا، کاشف کو اب باندھ کر نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ وہ بڑا ہو رہا ہے۔ باندھ کر رکھیں گے تو احساس کمتری میں مبتلا ہو جائے گا۔'

'ہاں یہ تو ہے۔ کیونکہ ہم سے زیادہ بچے تبدیل ہو گئے ہیں۔'

سپرا کو احساس تھا، یہ نوجوان بچے جس سمت نظریں دوڑائیں گے، وہاں منزل نما گرد کا غبار ہوگا۔ منزل نہیں۔ لاکھوں بچے اسی سمت دوڑ پڑتے ہیں اور ایک دن گرد و غبار میں کھو جاتے ہیں۔

ملک کے مختلف حصوں میں خانہ جنگی جیسا ماحول تھا۔ اس ماحول کو پیدا ہونا ہی



تھا۔ سپرا جانتا تھا کہ سیاست نئی قدروں اور نئی اخلاقیات سے گزر رہی ہے۔ ۲۰۱۰ تک کتنی ہی آندھیاں آئیں۔ اس درمیان پبلشنگ ادارے بہت حد تک بند ہو چکے تھے۔ جاسوسی اور رومانی کتابیں اب کوئی نئی پڑھتا تھا۔ اس نے بھی لکھنا بند کر دیا تھا۔ اب وہ لائزننگ کا کام کرتا تھا۔ سیاست میں رہنے کا ایک فائدہ یہ تھا کہ نئے پرانے تمام چہروں سے ملاقات تھی۔ کئی چہرے تو اس کے دیکھتے ہی دیکھتے سیاست کے اُفق پر چھا گئے۔ لیکن یہ دوستی اب کام آرہی تھی۔ بہت سے ایسے جاننے والے تھے، جن کا کام حکومت سے رہتا تھا۔ کسی کو پٹرول پمپ چاہیے۔ کسی کو ایڈمیشن۔ کچھ ایسے تھے جو منسٹر سے مل کر ہی خوش ہو جاتے تھے۔ سپرا جانتا تھا کہ لائزننگ کے ذریعہ زندگی آسانی سے گزاری جا سکتی ہے۔ ایک برس میں تین لوگوں کا بھی کام ہو گیا تو کافی پیسے مل جائیں گے۔ کبھی کبھی سپرا سوچتا ہے اور ہنستا ہے کہ زندگی کے بھی کیا رنگ ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب وہ مسخرہ تھا۔ پھر جاسوس بننے کا خیال آیا۔ پھر کرائم اسٹوری لکھنے لگا اور یہاں سے چھلانگ لگا کر راجیہ سبھا پہنچ گیا اور اب یہ دلالی کا کام۔ لیکن اس کام میں کوئی برائی نہیں ہے، وہ اپنا حصہ لیتا ہے بس۔ اور اس لیے لیتا ہے کہ زندگی گزارنی ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ کاشف نے اب سوال کرنا شروع کر دیا تھا۔ سپرا خاموشی سے اپنے بیٹے کے چہرے کے تاثرات پڑھتا تھا۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ پر فدا ہوتا تھا۔ اس کے گلے شکوے کا حل نکالتا تھا اور جواب دیتا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو کسی صورت ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر کاشف اپنا مقابلہ اب اپنے دوستوں سے کرنے لگا تھا۔

آپ نے راجیہ سبھا کیوں چھوڑ دیا؟

وہاں ہوتے تو ہم منسٹروں جیسے ہوتے۔

مجھے آپ پر فخر ہوتا۔

’اب فخر نہیں؟‘ سپرا نے پوچھا۔

’کیا بتاؤں دوستوں کو کہ کیا کرتا ہے میرا باپ۔‘

’کہہ دینا کہ فروٹس بیچتا ہے۔‘

’نہیں۔ میں کہہ دیتا ہوں کہ وہ راجیہ سبھا کے ممبر تھے۔‘

’ماضی سے کھیلتے ہو؟‘

’کھیلنا پڑتا ہے ڈیڈ۔‘

ماضی.... سپرا کو احساس تھا کہ ماضی سے کھیلنا پڑتا ہے کیونکہ ماضی ہر جگہ، ہر قدم آپ کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ ایک مہیب راستہ نکال کر آپ کے ذہن میں داخل ہوجاتا ہے۔ وہ پھر چور دروازے سے داخل ہوکر اور آپ کو اداس کر جاتا ہے۔ اور خاص کر جب آپ پریشان ہوتے ہیں، ماضی ذہن ودماغ میں وسیع مقام حاصل کر نے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ یعنی ڈپریشن۔ اس کے اوپر ڈپریشن۔ یہ ماضی کی تلوار ہمیشہ لٹکتی رہتی ہے۔ وہ اکثر تنہائی میں ماضی کی کتابیں کھول کر بیٹھ جاتا ہے۔ ابا حضور، اماں حضور، لئیق چاچا، شمو ماموں، حلیمہ نانی.... کیسے کیسے چہرے.... آئس کریم والا آیا نہیں کہ حلیمہ نانی کی آواز ابھرتی.... ارے آئس کریم لے لو... لئیق چاچا شعر وادب کا ذوق رکھتے تھے۔۔ خوبصورت آدمی تھے۔ شموں ماموں داستان گو تھے۔ ساری دنیا کی رامائن سن لیجیے۔ یہ احساس اس وقت کہاں تھا کہ یہ لوگ اوجھل ہوجائیں گے۔ پھر نظر نہیں آئیں گے۔ داستانیں گم ہوجائیں گی۔ کمرے خالی ہوجائیں گے۔ صحن ویران ہوجائے گا۔ ایک آواز آتی ہے۔ میرے لیے آئس کریم لے آؤ۔ آواز کے ساتھ ایک جسم ہوتا ہے۔ جسم جگہ گھیرتا ہے۔ پلنگ پر، مسہری پر، کہیں بھی۔ ایک دن آواز خاموش۔ جسموں کا گھیرا ختم۔ سب کچھ ختم۔



اس نے ریحانہ سے پوچھا.... ہم کہاں ملیں گے؟

وہ بری طرح چونک گئی۔ کہاں ملیں گے؟

’جب نہیں ہوں گے۔‘

’فاسفورس کے ڈھیر میں چمک رہے ہوں گے۔‘

’نہیں۔ سچ بتاؤ۔ کیا جنت جیسی کوئی جگہ ہے؟‘

’مردہ خانہ تو ہے....‘

مسیح سپرا پہلی بار چونکا تھا.... مردہ خانہ؟

’چونکے کیوں؟‘

’تم نے مردہ خانہ کہا؟‘

’کیا جنت میں زندہ لوگ ہوں گے؟‘

’پتہ نہیں۔‘

’اور ہماری دنیا میں؟‘ ریحانہ زور سے ہنسی۔

’پتہ نہیں۔‘

’آدھے سے زیادہ مردے ہیں۔ چھپکلی۔‘

’چھپکلی کیوں؟‘

’دیواروں پر اس طرح تیرتے ہیں کہ کوئی بھی چھپکلی کی طرح مار سکتا ہے۔‘

ٹھیک اسی وقت سپرا نے ایک چھپکلی کو دیکھا جو روشنی کے ارد گرد منڈرا رہی تھی۔ مردہ خانہ.... اس کے کانوں میں یہ لفظ دیر تک گونجتا رہا۔

## (2)

مردہ خانہ۔دوسری بار یہ لفظ ۲۰۱۳ میں سنا۔ سیاست نئی کڑوٹ لے رہی تھی۔پارٹی ملک کی کئی ریاستوں سے غائب ہورہی تھی۔ بی مشن کا قبضہ ہرجگہ ہورہا تھا۔ پرانی مذہبی عمارت کی گونج میں اضافہ ہو چکا تھا۔ سپرا کو وہ گنبد یاد تھا۔ پرانی عمارت کی یاد تازہ تھی ۔پھر وہ عمارت کا ملبہ بھی ،جس کے چاروں طرف پولیس کا پہرہ تھا۔ پرانی عمارت کی جگہ نئی عمارت کی تعمیر نے اب سیاست پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان محض ووٹ بینک بن گئے تھے اوراس بات سے سہمے ہوئے تھے کہ ان کا مستقبل کیا ہوگا۔ جبکہ پارٹی بھی مستقبل کو لے کر خوفزدہ تھی۔عوام میں بگ مین کے نعرے گونج رہے تھے اور یہ نعرے اثر دکھارہے تھے۔ اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ بگ مین کے آتے ہی ملک کی تقدیر بدل جائے گی۔دستور بدل جائیں گے۔مسلمان بدل جائیں گے۔اقلیتیں بدل جائیں گی۔ ان حالات میں پارٹی بے حد کمزور نظر آرہی تھی اوراس بات کا شدت سے احساس ہورہا تھا کہ اگلے انتخابات کے لیے پارٹی نے ابھی سے اپنی شکست تسلیم کرلی ہے۔



اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پارٹی اور پارٹی سے وابستہ لوگوں میں جوش وخروش کی کمی تھی۔اپوزیشن نے کرپشن اورقومیت کے معاملے کواٹھا کرعوام کو متنبہ کردیا تھا کہ یہ کمزور لوگ ہیں اور کمزور لوگ حکومت کے قابل نہیں ہوتے۔

سیاست سے الگ ایک حادثہ ہوا تھا۔ایسا حادثہ جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ کاشف اٹھارہ کا ہو چکا تھا۔ایک بالغ نو جوان۔اب اس کے پاس نئی موٹر سائیکل بھی تھی۔وہ لمبا تھا۔چہرہ پرکشش اوراس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی ریحانہ کو ہمیشہ کاشف کو لے کر خوف کا احساس ہوتا رہتا تھا اوراس خوف کا کوئی علاج نہیں تھا۔

'وہ کبھی کبھی میٹھے سروں میں اپنے کمرے میں گاتا ہے۔'

'اچھا'

'موبائل پر گھنٹوں بات کرتا ہے۔'

'بیٹا جوان ہوگیا ہے۔'

سپرا ریحانہ کو دیکھتا ہے۔ریحانہ اسے ایک پریشان ماں کے طور پر نظر آتی ہے۔سپرا کا قیاس ہے کہ ماں کہیں نہ کہیں بیٹے کی مصروفیت میں خود کو تقسیم ہوتے ہوئے دیکھتی ہے۔کاشف نے اب اپنا وقت اپنے دوستوں کو دینا شروع کردیا ہے۔

یہ ایک بڑا سا کمرہ ہے، جہاں دونوں صوفے پر بیٹھے ہیں۔ دیوار پر ایک پینٹنگ ہے،جس میں درخت کی شاخ پر دو کبوتر خاموش بیٹھے ہیں۔ پینٹنگ کے قریب ہی ایک کھڑکی ہے۔ریحانہ اس وقت کھڑکی کے باہر دیکھ رہی ہے۔سپرا اس کی کشمکش کو پڑھ سکتا ہے۔ماں ہمیشہ کمزور نہیں رہتی مگر وہ بیٹے کے لیے اکثر کمزور ہوجاتی ہے۔ ریحانہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس جاکر کھڑی ہوجاتی ہے۔سپرا کو یقین ہے کہ اس وقت وہ باہر کے مناظر کی جگہ کاشف کو دیکھ رہی ہوگی اور یہ خیال کررہی

ہوگی کہ اس وقت وہ کہاں ہوگا۔ وہ اکثر تشویش میں مبتلا ہوجاتی ہے اور جیسا کہ دو روز قبل ہوا، کاشف رات کو تاخیر سے آیا۔ وہ دوستوں کے ساتھ پکچر دیکھنے چلا گیا تھا۔ ریحانہ دیر تک ٹہلتی رہی پھر کاشف کے آنے کے بعد اس کے صبر کا باندھ ٹوٹ گیا۔

'تم مجھے مار ڈالوگے۔'

'کیوں؟'

' ایک فون نہیں کر سکتے تھے؟'

'سنیما ہال میں تھا۔ فون سائلنٹ پر تھا۔'

'ایک فون تو کر سکتے تھے کہ دیر سے آؤ گے۔'

'غلطی ہوگئی ممی۔'

کاشف کے معافی مانگنے کے باوجود ریحانہ غصے میں رہی اور اب وہ اس بات پر پریشان ہے کہ کاشف جوان ہوگیا ہے۔ یعنی وقت کو اس تیزی کے ساتھ اڑنا نہیں چاہیے تھا۔ اس تیزی کے ساتھ پھڑ پھڑانا نہیں چاہیے تھا۔

اسی دن چار بجے کے آس پاس سنگیت سوامی کا فون آیا۔ سنگیت سوامی داڑھی رکھتے تھے۔ کرتا پائجامہ پہنتے تھے۔ راجیہ سبھا کے ممبر بھی تھے۔ اب بزرگ ہوگئے ہیں۔ گھر پر دوستوں کو بلا کر خود کو زندہ رکھنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ سنگیت سوامی نے کہا تھا، وقت ہوتو آجاؤ۔ کچھ دیر عیش کریں گے۔ سوامی بولنے والے لوگوں میں تھے اور سپرا کا خیال تھا کہ سوامی کو راجیہ سبھا میں دوسرا ٹرم ملنا چاہیے تھا، جو انہیں نہیں مل سکا۔ شام کے وقت سپرا سنگیت سوامی سے ملنے گیا۔ کچھ دیر کی گفتگو کے بعد سنگیت سوامی نے گفتگو کا رخ پرانی عمارت کی طرف موڑ دیا۔ وہ اداس تھے اور پارلیمنٹ میں بھی دلیل کے ساتھ اپنی بات رکھا کرتے تھے۔



'ایک غیر محفوظ مستقبل تمہاری قوم کے لیے.....'

'شاید....'

'شاید نہیں اب قبول کرلو۔ پرانی عمارت کو مرکز بنا کر ایک راستہ پکڑ لو....اور دیکھو، یہ راستہ کہاں تک جاتا ہے۔ یہ راستہ بی مشن کی حکومت تک جاتا ہے اور صرف دو برس بعد پارٹی نہیں ہوگی، بی مشن ہوگا۔ ان کے دستور ہوں گے۔ ان کے قاعدے قانون ہوں گے۔ میڈیا پہلے ہی فروخت ہوچکا ہے۔ کیا تمہاری پارٹی میڈیا کو خرید نہیں سکتی تھی؟ سکتی تھی۔ مگر تمہاری پارٹی کے پاس تجربے اور مشاہدے کی کمی تھی۔ بی مشن نے میڈیا پر قبضہ کرلیا۔ اب تمام ایجنسی پر وہ قبضہ کریں گے....اور وہی چاہیں گے، جو ان کے دل میں ہوگا۔'

'کیا یہ آسان ہوگا۔؟'

'صبح سورج نکلنے کی طرح آسان۔ وہ بہت آسانی سے تمہاری پارٹی کو ختم کردیں گے اور پھر ہر جگہ وہ ہوں گے اور پرانی عمارت کا راستہ بھی آسان ہوجائے گا۔'

'ناتھانی اور جوشی کا کیا ہوگا؟'

'ان کے ہاتھ کا پراجیکٹ ہائی جیک کرلیا گیا ہے۔ اب ایسے لوگ کسی ڈارک بنگلے میں ڈال دیے جائیں گے۔'

'کیا یہ لوگ جلد بازی میں ہیں؟'

'جلد بازی میں ہوں گے تو اپنا بیڑا غرق کریں گے مگر مسٹر سپرا، کھیل مزیدار ہوگا۔'

'مزیدار.....'

'تم نے چوہوں کی کہانی سنی ہے۔ جب جہاز میں پانی آنے لگتا ہے.....؟'

’چوہے اچھل اچھل کر بھاگتے ہیں۔‘

’یہ کہاں جاتے ہیں۔؟‘

سوامی ہنسے۔’بی مشن کے پاس۔ دیکھ لینا۔تمام چوہے بی مشن کو اپنا لیں گے۔ اس وقت نہ کوئی اصول ہوگا اور نہ قانون۔ نہ سیاست کی اخلاقیات۔تمام جرائم پیشہ افراد بڑے عہدوں پر ہوں گے اور میڈیا ایسے تمام لوگوں کو ہیرو بتا رہی ہوگی۔‘

’کیا آپ سورج کے پار دیکھ رہے ہیں؟‘

’تمہیں بھی دیکھنا چاہیے مسیح سپرا۔ بلکہ تمہیں زیادہ دیکھنا چاہیے۔‘

’ہونہہ۔‘

’اقلیتوں سے زیادہ نشانے پر تم ہوگے....اور تم کچھ نہیں کر پاؤ گے۔

’اس کے آگے.....‘

سوامی ہنسے۔’کھلا کھیل فرخ آبادی۔جیت کو ممکن بنانے کے لیے وہ کچھ بھی کریں گے اور تمہاری پارٹی دیکھتی رہ جائے گی۔جانتے ہو فرق کیا پڑے گا۔؟‘

سوامی کی نگاہیں خلا میں دیکھ رہی تھیں۔’برسوں کی ملّت کو شراپ ملے گا۔ جمہوریت نہیں ہوگی۔ سیکولرزم کی باتیں کرنے والے غدار ہوں گے۔راشٹر واد کا موضوع اٹھایا جائے گا...اور تمام سیکولر ذہن کو حاشیہ پر ڈال دیا جائے گا۔‘

سوامی ٹھہر کر بولے۔’مجھے سیاست کا پرانا تجربہ ہے مسیح سپرا۔اس لیے اس وقت جو میں دیکھ رہا ہوں، تم نہیں دیکھ رہے ہو۔سیاست تم لوگوں کو بھی اتنے حصوں میں تقسیم کردے گی کہ شمار کرنا مشکل ہوگا کہ مشرق سے آئے ہو یا مغرب سے۔‘

سوامی ہنسے۔’مجھے خوف اس بات کا ہے کہ ملک کی حالت کیا ہوگی۔لو چائے آگئی۔‘

اس درمیان خادم چائے کی پلیٹ لاکر رکھ گیا۔کچھ ڈرائی فروٹس بھی تھے۔

’حل کیا ہے؟‘



’ابھی حل کی مت سوچو۔اپنے تحفظ کے بارے میں سوچو۔‘

’تحفظ۔‘

’جو پہلے ہوا، اب اس سے کہیں زیادہ بھیانک ہوگا۔‘

چائے پینے کے بعد سنگیت سوامی سے اجازت لے کر سپرا گھر کی طرف چل پڑا۔سوامی نے مستقبل کا ذکر کرکے ان وحشتوں کو جگا دیا تھا، جس کے بارے میں سپرا ابھی سوچنا نہیں چاہتا تھا۔خانہ بدوش یہ لفظ دوبارہ اس کی زبان پر آیا۔اور وہ بگ مین بھی جو کبھی ناتھانی کے لیے چائے لایا کرتا تھا۔ وقت کے ساتھ ناتھانی، جوشی حاشیہ پر چلے گئے تھے۔گھوڑا جو ہوا میں اڑتا ہے، اسے زمین پر بھی اپنے پاؤں رکھنے ہوتے ہیں۔

پیچھے چھوٹی چھوٹی عمارتیں ہیں۔سڑک اچھی ہے۔سڑک کے دوسری طرف درختوں کی قطار ہے۔سوامی جس جگہ رہتے ہیں وہاں کئی فلیٹ سابق فوجی افسروں کے ہیں۔ یہ فوجی افسر بھی اس مسخرے سے خوش نہیں جو آخری حد تک اقتدار پر قابض ہونے کے خواب دیکھتا ہے۔سپرا، سوامی کی گفتگو کے بارے میں سوچتا ہے تو آسمان سے اترتی ہوئی ایک دھند نظر آتی ہے۔چھوٹی چھوٹی عمارتیں چھپ گئی ہیں۔درختوں کی قطار بھی۔اپنی گاڑی تک پہنچنے میں سپرا کو وقت لگتا ہے۔ یہ دھند کیوں پیدا ہوئی؟

اب دھند نہیں ہے۔مگر دوسرے دن دھند کے اچانک پیدا ہونے کا جواز مل گیا۔فون پر خبر ملی۔سنگیت سوامی چلے گئے۔ رشتہ داروں کو شک ہے کہ کسی نے زہر دیا۔ پوسٹ مارٹم ہوگا۔لاش مردہ خانے میں رکھی جائے گی۔گھر نہیں آئے گی۔ وہیں سے شمشان لے جایا جائے گا۔ دنیا احمق انسان پر خرچ نہیں کرنا چاہتی۔ سوامی راجیہ سبھا میں ابھی بھی ہوتے تو شان کے ساتھ انہیں آخری آرام گاہ تک

پہنچایا جاتا۔مگر اب.....

سوامی کل تھے..... پرانی عمارت کی باتیں کررہے تھے۔ملک کے مستقبل کی۔ کتنے گھنٹے گزرے ہیں؟ زیادہ نہیں۔کل وہ زندہ تھے۔اس کی طرف کاجو کی پلیٹ بڑھائی۔ دوبارا اٹھ کر اندر گئے۔کل تک گوشت پوست کے انسان تھے۔ کچھ گھنٹے پہلے تک مگر اب.....سپرا موت سے ہمکلام تھا۔اس پر وحشت طاری تھی وہ کافی دیر تک بستر پر لیٹا رہا۔سوامی کا چہرہ یاد آتا رہا۔سوامی کی آنکھیں، سوامی کے ہونٹ، سوامی کے لباس، مگر اب سوامی نہیں ہے۔ پوسٹ مارٹم کے بعد مردہ گھر۔مردہ گھر سے شمشان۔ایک زندہ انسان دیکھتے ہی دیکھتے غائب...

شام کا وقت ہے۔سپرا اسپتال کے مردہ گھر کے سامنے کھڑا ہے۔کنارے گاڑیاں لگی ہوئی ہیں۔سوامی کے دو چار رشتے دار کھڑے ہیں۔ وہ اسپتال کے چاروں طرف دیکھتا ہے۔سامنے ایک چھوٹا سا دروازہ ہے۔ دروازے کے آس پاس بدبو ہے۔ یہ بدبو کہاں سے آرہی ہے؟ وہ دیر تک مردہ گھر کے پیچھے کھڑا رہتا ہے۔ایک سگریٹ جلاتا ہے۔ بدبو ابھی بھی ہے۔ اور یہ طے ہے کہ بدبو مردہ گھر سے نہیں آرہی، پھر کہاں سے آرہی ہے؟

وہ مریضوں اور رشتے داروں کو دیکھتا ہے۔کچھ فاصلے پر ایک نئی عمارت بنی ہوئی ہے۔اور ایسا خیال آتا ہے، جیسے دنیا کے سارے مریض ایک ہی اسپتال میں جمع ہوئے ہوں۔کوئی رو رہا ہے۔ کچھ لوگ ایک خاتون کو چپ کرانے میں لگے ہیں۔بدبو؟ سپرا کو پھر بدبو کا خیال آتا ہے۔یہ بدبو زندہ لوگوں کے جسم سے تو نہیں آرہی؟ زندہ لوگ جو سوامی کی طرح غائب ہونے والے ہیں۔

اب وہ مردہ گھر کے گیٹ پر ہے۔ دروازے پرانے ہیں۔اس وقت



دروازے پر کوئی نہیں۔وہ دروازے سے اندر جاتا ہے۔اندر جاتے ہی احساس ہوتا ہے وہ کسی اور دنیا میں آگیا ہے۔اس دنیا کا تعلق باہری دنیا سے نہیں ہے۔ یہ خاموش لوگوں کی بستی ہے۔ یہاں جو لائے جاتے ہیں وہ ہر برائیوں سے پاک ہوجاتے ہیں۔سفید ٹائلس لگے ہیں۔دیواریں بھی سفید اور ٹھنڈی ہیں۔یہاں کئی کمرے ہیں۔ایک شخص نظر آتا ہے، جو ایک اسٹریچر لیے جارہا ہے.....وہ غور سے مردہ گھر کا جائزہ لیتا ہے۔یہاں ٹھنڈ کافی ہے۔مردہ جسم کی حفاظت کے لیے کمرے کو زیادہ سرد رکھا گیا ہے۔پاس والے کمرے میں سفید چادریں رکھی ہیں۔یہ اسٹور روم ہے۔سامانوں سے بھرا ہوا— اس کے آگے ایک کمرہ ہے اور کمرے میں کئی اسٹریچر ہیں، جن پر مردے رکھے ہیں اور مردوں کے جسم پر سفید چادریں پڑی ہیں۔ایک، دو، تین، چار......اسے ایک جسم میں حرکت نظر آئی۔ممکن ہے یہ وہم ہو لیکن سپرا خوفزدہ ہوکر باہر نکل آیا۔

سات بجے سوامی کے مردہ جسم کو آگ کے حوالے کردیا گیا۔ ایک جسم اب آگ کے شعلوں کے درمیان جھلس رہا تھا۔

'شکر یہ کہ تم مرگئے ہو۔ہم سب بھی بہت جلد مرکھپ جائیں گے۔'

مسیح سپرا باہر نکل آیا.....اور قیاس ہے کہ سڑک پر چلتے لوگوں کے درمیان اس نے موت کو دیکھا تھا اور اسے اس بات کا احساس ہورہا تھا کہ موت اس کے تعاقب میں ہے۔ کچھ دور جانے کے بعد وہ مڑا تو سپرا کو اس کا قیاس صحیح معلوم ہوا۔کوئی اس کا پیچھا کررہا تھا اور یہ یقیناً موت کا فرشتہ ہوگا۔اب اسے اس بات سے کوئی الجھن نہیں تھی۔

(3)

۲۰۱۳ کی سردیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔اس درمیان دوبار اس نے مورچری کے چکّر لگائے۔ کیوں؟ وہ نہیں جانتا۔ اس نے مورچری اور مردہ گھروں کے بارے میں بہت ساری کہانیاں پڑھ ڈالیں۔ کچھ کہانیاں ہیبت ناک تھیں۔لاش پر کیمیائی عمل کے بعد کسی مردہ کو گھر کے ڈرائنگ روم میں اس طرح رکھا جاتا جیسے وہ کرسی پر بیٹھا ہے یا صبح کا اخبار پڑھ رہا ہے۔لیکن اب ان کہانیوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نہ کوئی پیدا ہوتا ہے نہ مرتا ہے۔ یہ سب وہم ہے۔جیسے بچے کرکٹ یا فٹ بال کھیلتے ہیں، ایک زمین یا ایک گھر مل جاتا ہے۔ کچھ دن کھیلئے پھر مردہ گھر— پھر مردہ گھر آجایئے اور زندگی کی مدت کس قدر کم ہوتی ہے۔ دنیا میں آنے والا وہ شخص خود کو سمجھتا ہے کہ وہ زندہ ہے اور سانس لے رہا ہے اور باہر کمانے جارہا ہے۔اس نے گھر تعمیر کیا ہے۔ وہ صبح کو اخبار پڑھتا ہے۔جسم کو تروتازہ رکھنے کے لیے جاگنگ کرتا ہے۔ وہ کھانے کے لیے منہ میں نوالے ڈالتا ہے اور سارا دن گھر سے باہر بھاگتا رہتا ہے۔گھر میں ایک بیوی لے آتا ہے۔ پھر بچے آجاتے ہیں اور پھر ایک



بچوں کی پرورش کے بعد سیر کرتا ہوا وہ شمشان یا قبرستان میں نکل جاتا ہے۔پھر وہاں سے واپس نہیں آتا۔

اس درمیان ریحانہ کی طبیعت بھی خراب رہنے لگی تھی۔ سپرا پر بھی بزرگی چڑھنے لگی تھی۔سردی کا موسم اس کے لیے خاصہ تکلیف دہ ثابت ہوتا۔ وہ جرابیں، دستانے نکال لیتا۔ رات اور دن میں بندروں والا کیپ لگائے رہتا۔جسم کی بنیاد کمزور ہو چکی تھی۔سردی سے بچنے کے لیے وہ دو دو سویٹر اندر ڈال دیتا۔گرم لباسوں کے باوجود سارا دن اس کے بدن میں درد رہتا۔ اب یہ درد روز کا معمول بن گیا تھا۔کبھی کبھی لگتا کہ پاؤں میں خون جم گیا ہے۔گھٹنوں کا درد لاعلاج ہو چکا تھا۔کبھی کبھی اچانک اٹھنے میں بھی تکلیف ہوتی تھی اور اسے احساس تھا کہ موت کا فرشتہ اسے دیکھ رہا ہے۔

ریحانہ کے پاس اب کاشف کے لیے زیادہ باتیں تھیں۔ وہ کاشف کو لے کر فکر مند رہتی تھی۔

’وہ گھر سے باہر کیا کرتا ہے؟‘

’اس کے دوست کیسے ہیں؟‘

’گھر کے باہر وہ کچھ کھاتا پیتا تو نہیں؟‘

’تم اس سے کچھ پوچھتے کیوں نہیں؟‘

کاشف کے پاس ہر بات کا ایک ہی جواب تھا۔

’اتنے سوال مت پوچھا کرو ممی....‘

’اب میں بڑا ہو گیا ہوں‘

’بس مجھے ڈرایا مت کرو‘ کاشف غصے میں، اپنے کمرے میں چلا جاتا۔

ریحانہ چونک کر بولی ابھی کیا کہا اس نے؟‘

'کچھ نہیں کہا۔'

'نہیں۔ کچھ کہا ہے۔'

'کچھ کہا ہوتا تو میں نے بھی سنا ہوتا۔'

ریحانہ کا چہرہ سپید تھا۔ بچے بڑے ہوجائیں تو خوف ہوتا ہے۔ وہ کہاں جارہے ہیں۔ کس کے ساتھ ہیں، یہ سب سوچنا پڑتا ہے۔ مگر کاشف کسی کی سنتا کہاں ہے۔ اپنی مرضی کا مالک ہے۔

کھڑکی ہوا سے کھل گئی ہے۔ اس وقت سپرا کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد سناٹا چھا جاتا ہے۔ ریحانہ اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ اس سناٹے میں سپرا اکیلا نہیں ہے،اس کے ساتھ سوامی بھی ہے۔ پرانی عمارت بھی ہے۔نئی سیاست کا شور بھی ہے۔انتخابات میں اب کم دن رہ گئے ہیں اور یہ قدیم خانہ بدوش جنگلوں سے نکل کر شہر شہر قریہ قریہ پھیلتے جارہے ہیں۔

ریحانہ کو سپرا سے شکایت تھی۔تم انہیں خانہ بدوش کیوں کہتے ہو۔؟ یہ قدیم قبائل میں شمار ہوتے ہیں۔حضرت مسیح، حضرت یعقوب کے زمانے میں بھی تھے۔ سردی، گرمی، بارش میں کھلے آسمان کے نیچے رہتے ہیں۔محنت کرتے ہیں۔ ان کی ہنرمندی کی ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ ان کی عورتیں محلے گلیوں میں پھیریاں لگاتی ہیں۔ اوران کے دلچسپ قصے ساری دنیا میں مشہور ہیں۔

' یہ وہ خانہ بدوش نہیں۔' سپرا نے ہنس کر کہا۔ یہ وہ ہیں جہاں تہذیب نے پردہ کرلیا ہے۔ یہ وہ ہیں جن کا استعمال حکومتیں کررہی ہیں۔ یہ وہ ہیں جو منشیات کا کاروبار کرتے ہیں اور انسانوں کو کئی حصوں میں تقسیم کررہے ہیں۔ یہ تقسیم پرست ہیں اور گروہوں میں آباد ہیں اوراب یہ پھیل رہے ہیں۔ ناسور بن رہے ہیں۔ اس کے لہجے میں سختی ہے...اور یہ موت فروخت کررہے ہیں۔



.....اور یہ بے رحم سردیاں تھیں، جب حقیقتاً سڑکوں چوراہوں پر موت فروخت کی جارہی تھی۔ ایک طبقہ گھروں میں خوفزدہ تھا اور پارٹی نے آسانی سے خود کو ان کا شکار بننے دیا تھااور ایک تصویر تھی جو ہر دو قدم پر لہراتی تھی اور جارج آرویل کے بگ برادر کی یاد دلاتی تھی۔

'یہ ہم کہاں آ گئے۔؟'

مسیح سپرا کو احساس تھا کہ وقت اس فکر سے کہیں زیادہ خوفناک ہے، جو اس کی سوچ میں سفر کرتا ہے۔ سپرا کو ان اندھیروں کا احساس نہیں تھا جو سیّال کے مانند اس کے جسم میں اتر رہے تھے۔ تاہم اسے احساس تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ جب آپ خود سے سوال کرتے ہیں کہ کیا ہونے والا ہے تو آپ کی چھٹی حس میں ایک اسکرین پر کچھ تصویریں جھلملاتی ہیں۔ یہ تصویریں کبھی کبھی یقیناً آپ کو خوفزدہ کردیتی ہیں۔ کبھی کبھی انسان اس احساس سے باہر ہوتا ہے کہ ایک سونامی تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہی ہے اور یہ سونامی ایک لمحہ کے اندر گھر کے شیرازے کو بکھیر سکتی ہے۔ آنکھوں کے آگے جو ایک فریم فریز ہے، کبھی کبھی ہم اس سے آگے نہیں دیکھتے۔ جبکہ تیز رفتار وقت اچانک اس فریم کو تبدیل کردیتا ہے۔

فریم اچانک تبدیل ہوا تھا

'تو تم جارہے ہو؟' ریحانہ نے کاشف سے پوچھا

'ہاں۔'

'اورتم ہمیشہ کی طرح دیر سے آؤگے۔'

'ہاں۔'

'زیادہ دیر تو نہیں ہوگی؟'

'نہیں ممی۔'

’پھرٹھیک ہے۔زیادہ دیر ہوتی ہے تو میری الجھن بڑھ جاتی ہے۔‘
کاشف مسکرایا۔’تم بھول جاتی ہو کہ تمہارا بیٹا بڑا ہو گیا ہے۔‘
’اب اتنا بھی بڑا نہیں۔‘ ریحانہ نے حکم دیا۔’موٹر سائیکل آرام سے چلانا۔زیادہ تیز بھگانے کی ضرورت نہیں۔اور اپنا خیال رکھنا۔‘

اس دن آسمان کی رنگت اچانک تبدیل ہوگئی۔سیاہ بادل آسمان پر چھا گئے۔ کچھ دیر میں تیز بارش ہونے لگی۔کھڑکی کے باہر خانہ بدوشوں کا ایک ’جتھا‘ تھا جو بھیگتا ہوا،نعرے لگاتا شور کرتا ہوا گزر رہا تھا۔بارش کے رم جھم کی آواز آ رہی تھی۔ کھڑکی کے باہر ایک چھت پر دو کبوتر بھیگتے ہوئے اڑے اور درخت کے پتوں کے درمیان جگہ بنانے کی کوشش کرنے لگے۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

دونوں صوفے پر بیٹھے تھے اور ماحول میں خاموشی تھی۔سپرا نے ریحانہ کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں گہری سوچ میں گرفتار نظر آ رہی تھیں۔ ریحانہ نے اچانک سپرا کی طرف دیکھا۔
’خیال کیا ہے؟‘
’گاؤں کی پگڈنڈیوں پر چلتی ہوئی سائیکل۔‘
’اور جنون؟‘
’ڈگمگاتا ہوا ڈرون۔‘
’زندگی کیا ہے؟‘
’واہمہ۔‘
’خوف کیا ہے۔؟‘



’جسم میں ہر لمحہ اٹھنے والی سونامی لہر۔‘
’موت کیا ہے؟‘
’آہ...اس کا جواب میرے پاس نہیں۔‘
’اور میرے پاس بھی نہیں۔‘
ریحانہ کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔

سپرا کو اس کے سوالوں سے کوئی حیرانی نہیں تھی۔اس کے برعکس وہ بھی اپنے دل کو ڈوبتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔مگر کیوں؟ اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ کھلے دروازے سے غرّاتی ہوئی ایک بلّی کمرے میں داخل ہوگئی تھی۔ریحانہ کو، بلی کو باہر بھگانے میں کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔اس نے دروازہ بند کیا۔بارش ابھی بھی تیز تھی۔آسمان سیاہ بادلوں کے نرغے میں تھا۔

●●

بارش کے باوجود خانہ بدوشوں کا شور کان کے پردے پھاڑ رہا تھا۔بھیگتے ہوئے خانہ بدوش زور زور سے نعرے لگاتے ہوئے سڑک سے گزر رہے تھے۔ان کے لہجے میں سختی تھی اور جسم میں بارود کے بھرے ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔اب یہ خانہ بدوش مطمئن تھے کہ یہ سڑک ان کی ہے، عمارتیں ان کی ہیں اور کچھ دن بعد ملک کی ہر شے پر ان کا حق ہوگا۔ بے خوف سڑک پر ادھر ادھر آتے جاتے انہیں ٹریفک کے ہونے نہ ہونے کا ذرا بھی احساس نہیں تھا۔ یہ پرچم ہوا میں لہراتے اس طرح ادھر ادھر آ جا رہے تھے جیسے مقابلہ انہوں نے جیت لیا ہو اور اب ملک کی تقدیر لکھنے کی ذمہ داری ان کی ہے۔

یہی وقت تھا جب ایک خانہ بدوش کو بچاتے ہوئے ایک موٹر سائیکل ہوا میں اچھلی اور پھسلتی ہوئی کراسنگ سے ٹکرائی۔ اس سے قبل کہ پولیس آتی یا لوگ جمع

ہوتے، موٹر سائیکل چلانے والا کراسنگ کے کھمبے سے ٹکرانے کے بعد بیہوش ہو چکا تھا۔ پولیس نے زخمی نوجوان کو کنارے کیا۔ کچھ دیر بعد شور کرتی ایمبولنس آئی اور زخمی نوجوان کو لے کر اسپتال روانہ ہوگئی۔ جہاں ڈاکٹروں نے معائنہ کے بعد اس کے مردہ ہونے کا اعلان کردیا۔

سپرا نے فون پر خاموشی سے یہ خبر سنی۔

جذباتی لہجہ میں اس نے ریحانہ کو بتایا کہ اب خانہ بدوشوں سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ریحانہ کو ہوش میں لانے میں کافی وقت گزر گیا۔

سپرا ایک بار پھر اسپتال کی عمارت میں تھا۔ چاروں طرف اسے مردے نظر آرہے تھے۔ مورچری کا دروازہ ابھی بھی کھلا ہوا تھا۔ اسے یقین کرنا مشکل تھا کہ ایک دن اپنے پیارے بیٹے کے لیے اسے مورچری میں آنا ہوگا۔ اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ آنکھوں کے آگے دھند میں اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ گہری نیند میں چل رہا تھا۔ اسے یقین تھا، کارروائی مکمل ہونے میں کافی دیر لگ جائے گی۔ رات ۳ بجے، لاش کو لے جانے کا کلیرنس ملا۔ ظہر بعد تجہیز وتکفین کے لیے وقت مقرر ہوا۔ اس وقت تک دونوں ہوش میں نہیں تھے۔ بلکہ دونوں نیند کے مسافر تھے۔ انہیں گمان بھی نہیں تھا کہ وقت کے دریا نے انہیں کہاں اور کس مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔

تجہیز وتکفین کے بعد سپرا جب گھر آیا تو گھر خالی خالی لگ رہا تھا۔ ریحانہ کسی مجسمہ میں تبدیل ہوگئی تھی۔ اس نے ہزاروں پتھروں کو دیکھا ہے۔ ریحانہ پتھروں کا ایک ایسا مجسمہ تھی، جس میں نہ حرکت تھی، نہ زندگی۔ وہ بستر پر نڈھال پڑی تھی۔ سپرا گول گول گھومتا ہوا کاشف کے کمرے میں آیا.....

وہ ابھی یہیں تھا...



اسی کرسی پر بیٹھا ہوا...

کل اسی وقت وہ گھر سے نکلا تھا۔ اس نے جینس پہن رکھی تھی اور وہ دنیا کا سب سے خوبصورت شہزادہ لگ رہا تھا.....

مگر اب... وہ نہیں ہے.....

پکارنے پر بھی نہیں آئے گا.....

سپرا دیر تک ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ اسے سکون نہیں تھا۔ جیسے کاشف اپنے ساتھ اس کے صبر وسکون کو بھی سمیٹ کر لے گیا ہو۔ وہ ایک بار پھر خیالوں کے مردہ گھر میں تھا۔ اور اس مردہ گھر میں لاشیں سجی تھیں۔ سوامی کی... کاشف کی... ایک خالی اسٹریچر تھا۔ سپرا اس اسٹریچر پر آنکھیں موند کر لیٹ جانا چاہتا تھا۔

خود کو سمجھنے سمجھانے کی تمام دلیلیں ناکام ثابت ہوگئی تھیں۔ آنکھوں کے آگے دھند بڑھ گئی تھی۔ سپرا کو احساس تھا، اب اس دھند سے باہر نکلنا دونوں کے لیے مشکل ہو جائے گا۔ کچھ دنوں تک ریحانہ کی دماغی حالت ٹھیک نہیں رہی۔ جیسے ایک دن رات میں اچانک وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر سپرا کو جھنجھوڑ کر اٹھایا۔

'ہاں وہ آیا تھا۔ اور اس نے مجھ سے بات بھی کی۔'

'سوجاؤ ریحانہ۔'

'نہیں۔ وہاں اسے کھانے پینے کی تکلیف ہے۔ پزا اور برگر نہیں ملتا۔'

'میں اسے کچھ اچھا سا بنا کر بھیجنا چاہتی ہوں۔'

'صدقہ کردو۔'

'صدقہ کرنے سے کاشف تک پہنچ جائے گا؟'

'کیوں نہیں۔'

'اچھا پھر آرام کرو'

کچھ حادثوں کا اثر زندگی پر پڑتا ہے۔ کچھ حادثے آپ کے جسم کے ساتھ چپک جاتے ہیں۔ ایسے ہی کچھ چہرے ہر وقت آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔ وقت گزرنے کے بعد بھی یادوں کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا اور ایسی یادیں بھی ساتھ چھوڑ دیں تو پھر زندگی کا مطلب کیا ہے۔ سپرا ان یادوں کے ساتھ چلتا رہا۔ مردہ خانے کا تصور پہلے سے کہیں زیادہ جگہ گھیرتا رہا۔ اب یہ گھر بھی اسے مردہ خانہ لگتا تھا۔ لیکن اس وقت تک اسے یہ یقین نہیں تھا کہ یہ گھر ایک دن حقیقت میں مردہ گھر ثابت ہوگا۔

وقت نے صفحے تیزی سے تبدیل کر دیے تھے۔



(4)

## 2020 جنوری

۲۰۱۴ بھی آیا۔ پھر وقت نے ۲۰۱۹ کا فاصلہ بھی طے کر لیا... اور ۲۰۲۰ کی صبح نمودار ہوئی۔ اس صبح کے آنے تک منظر صاف ہو چکا تھا۔ خانہ بدوش حکومت میں تھے۔ بگ برادر اور بگ مین کے علاوہ پارٹی میں اور کوئی بھی نہیں تھا، جس کے پاس طاقت ہو یا جس کی آواز میں ارتعاش ہو، کچھ کہنے کی ہمت ہو۔ خانہ بدوش سڑکوں پر آزادانہ گھوم رہے تھے۔ قتل کر رہے تھے اور ایک بڑی آبادی کو شہریت سے محروم کرنے کے میپ بنائے جا چکے تھے۔ عدلیہ کے فیصلوں پر حکومت کی مہر تھی اور تمام ایجنسیاں حکومت کی نگرانی میں کام کر رہی تھیں۔ میڈیا بھونپو بن کر رہ گیا تھا اور شہر میں جگہ جگہ چوراہے پر نفرت کی قندیلیں روشن تھیں۔ پرانی عمارت کا فیصلہ آچکا تھا۔ اور آئندہ کے انتخابات کے لیے اس فیصلے نے تمام راستے صاف کر دیے تھے۔ اور جن دنوں فیصلے کی ۴۰ دن تک سنوائی ہو رہی تھی، یہ حادثہ انہیں دنوں پیش آیا۔

ریحانہ کی طبیعت بگڑتی جا رہی تھی۔ کاشف کی موت کے بعد وہ ایک دن بھی

خوش نظر نہیں آئی۔کئی بار وہ کمزور لفظوں میں کہہ چکی تھی کہ اسے کاشف کے پاس جانا ہے۔کاشف اسے یاد کرتا ہے۔اور جس دن عدلیہ مسلم ثبوتوں کا اعتراف کر رہی تھی اور یہ احساس ہو رہا تھا کہ پرانی عمارت کے فیصلے میں انصاف سے کام لیا جائے گا، اس دن ریحانہ کی طبیعت بگڑ گئی۔اس کا چہرہ سرخ تھا اور اس کی پیشانی گرم۔اس کو اٹھنے، چلنے میں پریشانی ہو رہی تھی۔سپرا خاموشی سے اس نظام کو دیکھ رہا تھا، جہاں چپکے سے یا اچانک لوگ گم ہو جاتے ہیں۔پھر نظر نہیں آتے۔ وہ شکست خوردہ ایک گوشہ میں بیٹھا تھا اور ذہن ودماغ پر مردہ گھر کے سوا کوئی تصور نہیں تھا۔

ان دنوں کا موسم کچھ اور تھا۔موت انسانی حیرانیوں سے طلوع ہو رہی تھی.... اور یہی وقت تھا جب سپرا نے اپنے کئی عزیزوں اور جاننے والوں کندھا دیا تھا۔ لوگ ایسے بھی جاتے ہیں کیا کہ کل تھے اور آج نہیں۔صبح تھے۔شام نہیں۔ایک گھنٹہ قبل گفتگو کر رہے تھے اور ایک گھنٹے بعد کرۂ ارض سے غائب۔موت نے سپرا کا اعتبار کھویا تھا۔وہ گھنے جنگلوں میں بھٹک رہا ہے۔کوئی دور سے دوڑتا ہوا آتا ہے۔ سپرا اسے پہچانتا ہے۔

'چلو میرے ساتھ۔'

'مگر کہاں؟'

'سوال مت پوچھو....چلو میرے ساتھ...'

'اس جنگل سے باہر۔'

'اب چاروں طرف گھنے جنگل ہیں۔ جہاں جاؤ گے وہاں جنگل۔آواز سنو۔'

'یہ آواز تو بھیڑیے کی ہے...'

'نہیں خانہ بدوش کی، یہ سارے خانہ بدوش بھیڑیے بن گئے ہیں۔'



'مگران کے بارے میں کچھ بھی بولنا ممنوع ہے۔'

'اور اسی لیے....چلو بھاگو....نکلو یہاں سے۔'

کوئی اس کو تھامتا ہے۔جنگلوں سے آگے پہاڑیاں ہیں۔کچھ پہاڑیاں ایسی ہیں، جہاں سے بڑے بڑے پتھر کھسک کر ہزاروں فٹ نیچے کھائی میں گر رہے ہیں۔ایک جگہ کچھ مزدور کھڑے ہیں۔بارودی سرنگ اڑائی جا رہی ہے۔کچھ دوری پر پولیس کے سپاہی ہیں۔اس علاقے میں کھدائی چل رہی ہے۔

'یہاں سے بھی نکلو۔دھماکہ ہونے والا ہے۔'

'پھر ہم کہاں جائیں گے؟'

'وہ سامنے دیکھو...'

'سامنے کیا ہے؟'

'مردہ گھر۔'

'مردہ گھر؟' وہ چونکتا ہے۔

یہاں پناہ ہے۔سب کے لیے.... جو مکانوں میں ہیں، سڑکوں پر ہیں، چوراہوں پر ہیں، دفتروں میں ہیں، خطرے میں ہیں۔اور سنو۔ان کی جیب بہت بڑی ہوگئی ہے۔'

'جیب ؟'

'ہاں جیب۔اس میں فلائی اوورز ہیں۔نیشنل انٹرنیشنل بینک ہیں۔عدلیہ ہے۔ایجنسیاں ہیں۔خانہ بدوش ہیں۔مذہب ہے اور ہتھیار.....'

'پھر باہر کیا ہے۔؟'

'موت۔اس لیے سوچو مت بھاگ چلو.....'

سپرا دھند سے واپس آتا ہے تو ریحانہ کی کمزور آواز سنتا ہے..... پانی.... وہ

ایک گلاس میں پانی لاکر دیتا ہے۔ تو ریحانہ اسے کافی کمزور نظر آتی ہے۔ کمزوری کے باوجود ریحانہ اس کی طرف مسکرا کر دیکھتی ہے۔

’تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ زیادہ وقت نہیں ہے میرے پاس.... میں اسے دیکھ رہی ہوں اور بہت قریب سے دیکھ رہی ہوں۔

’کس کو؟‘ سپرا زور سے چیختا ہے

’آہ.... چیخو مت۔ میری روح کو تکلیف ہوتی ہے۔‘

’کس کو دیکھ رہی ہو۔‘

’وہ ہے نا کمرے میں، اس وقت بھی۔ موت کا فرشتہ۔ وہ آچکا ہے۔‘

’ریحانہ....‘ سپرا کچھ کہتے کہتے ٹھہر جاتا ہے۔

’تمہیں اکیلا چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ اس کا صدمہ ہے۔ تم بہت اکیلے رہ جاؤ گے — مجھے اس کا احساس ہے — مگر کاشف کے بعد.... میں جینا بھول گئی۔ میں کاشف کے پاس جا رہی ہوں۔ وہ بار بار مجھے آواز دیتا ہے۔‘ ریحانہ دھند میں دیکھ رہی تھی..... ’یہ پہیلی کچھ سمجھ میں نہیں آئی.... اس کی آواز سنتی ہوں تو وہ سامنے کھڑا نظر آتا ہے۔ کتنے دنوں کی بات ہے وہ مجھ سے ناراض تھا۔ تمہیں یاد ہے نا..... مجھے اس کا چہرہ.... اس کی باتیں سب یاد ہیں... بلکہ میں کچھ بھی نہیں بھول سکی.... اور کیوں بھولوں میں..... وہ مجھے آواز لگاتا تھا..... بہت پیار سے..... مجھ سے جھگڑا کرتا تھا.... یہ ایک لمحہ زندگی کو کہاں لے جاتا ہے۔؟‘

’ریحانہ...‘ سپرا نے آہستہ سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا.... یہ سب کیوں سوچ رہی ہو۔ اور ہاں تم کہیں نہیں جا رہی ہو۔ تم مجھے جانتی ہو نا.... میرے بارے میں سوچتی ہو نا..... میں اس تاریکی کے بوجھ کو اکیلے اٹھانے کے قابل نہیں ہوں ریحانہ....‘



پہلی بار سپرا پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ صبر ہونٹوں تک آکر باندھ توڑ گیا۔ آگ کی لپٹیں اٹھیں۔ اس نے ریحانہ کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ یہ چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے بے نیاز تھا۔ سرد۔ صرف آنکھیں تھیں، جن میں جان باقی تھی۔ جسم میں کوئی ہلچل نہیں۔ اس نے ریحانہ کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ ایک لمحہ کے لیے اسے گھر گھومتا ہوا نظر آیا۔ خلا میں ایک جسم جھول رہا ہے... اور یہ اس کا جسم ہے۔ سپرا نے محسوس کیا، ریحانہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ کچھ کہنے کے لیے خود کو سمیٹ رہی ہے۔ ایک نور کا دائرہ ہے جو اس کے سر پہ منڈلا رہا ہے۔

’کچھ بہت برا ہونے والا ہے...‘ ریحانہ کی آواز ابھری.... مگر اس وقت تک میں نہیں رہوں گی۔ اب سوچتی ہوں، کاشف کا جانا غلط نہیں تھا۔ وہ اس ماحول میں زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ معصوم تھا اور اب جو کچھ ہو رہا ہے.... تم سمجھ رہے ہو نا... تم سے کچھ باتیں کرلوں... جی ہلکا کرلوں... سنو... کافی اندھیرا جمع ہو گیا ہے آنکھوں کے پاس۔ ان میں اجالے کی کہیں بھی کوئی کرن نہیں۔ تیس کروڑ لوگوں کو نکالنا ان کے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔ کیونکہ ان کو کسی بھی طرح کی خون ریزی سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا... مجھے خدشہ ہے کہ اس موسم میں تم کیسے رہو گے... تمہیں سیاست راس نہیں آئی۔ اور....‘

ریحانہ کے لفظ کھو رہے تھے، سپرا نے محسوس کیا، ریحانہ کے چہرے پر سرخ رنگ کے ساتھ ایک تناؤ ہے... وہ گہری سوچ میں ہے.... اور وہ خود نہیں جانتی کہ اس وقت وہ کیا کہہ رہی ہے۔ مگر وہ بہت کچھ سوچ رہی ہے اور اس کی فکر کا محور سپرا ہے... اس وقت ریحانہ جو کچھ بھی کہہ رہی ہے، وہ دیکھ سکتا ہے۔ اس کے اندر کی حرارت تھم رہی ہے۔ ہوا رک گئی ہے۔ ایک خوفناک ہوا ملک میں بہہ رہی ہے۔ ریحانہ کے چہرے پر اس ہوا کا اثر موجود ہے۔ اس کے چہرے کے آس پاس ایک

جالہ سا بن گیا ہے وہ ایک ٹک سپرا کی طرف دیکھ رہی ہے....ہوا ساکت۔ پانی سے بہتے ہوئے بلبلہ میں کچھ چہرے بنتے ہیں۔مٹ جاتے ہیں۔کسی کے مرجانے پر موت ایک لکیر چھوڑ جاتی ہے... یہ لکیر کبھی کبھی صاف نظر آتی ہے۔ جیسے کاشف نظر آتا ہے۔کبھی اس کمرے سے اس کمرے میں جاتا ہوا... کمرے میں روشنی اور ہوا کی ضرورت ہے۔اس وقت تاریکی بہت زیادہ ہے۔سپرا ہاتھ تھامے ہوئے ریحانہ کے چہرے کی طرف دیکھتا ہے...

’تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔بس، تم خوفزدہ ہوگئی ہو۔ کاشف کے صدمے سے تم باہر نہیں نکل سکی۔ میں تمہیں اسی وقت اسپتال لے چلوں گا۔ ڈاکٹر ہے نا...تم ٹھیک ہوجاؤ گی...سنا تم نے ریحانہ...‘

’تم مجھے دھند سے باہر لانا چاہتے ہو۔ میں دھند میں پاؤں بڑھا چکی ہوں۔‘

ریحانہ کی آنکھیں خلا میں دیکھ رہی تھیں...ایک بڑھیا ہوتی ہے جو چاند پر بیٹھ کر چرخہ کاتتی ہے۔ میں اکثر اس کو دیکھا کرتی تھی...کاشف اس کے پاس ہی ہوتا تھا۔ اب چرخہ کاتنے والی بڑھیا مجھے آواز دے رہی ہے...‘

سپرا زور سے چلّایا۔ کیا بک رہی ہو تم....

اسے احساس ہوا، اس کے پاس لفظ نہیں ہیں۔ ایک گہری کھائی ہے اور ریحانہ اس کھائی میں گرتی جارہی ہے۔

’ٹھہرو....‘

سپرا اٹھا۔ موبائل سے اس نے قریبی ڈاکٹر دوست کو فون لگایا... یہی لمحہ تھا، جب وہ ریحانہ کے پاس سے دور ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ فوراً آرہا ہے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ دوبارہ ریحانہ کے پاس آیا تو ریحانہ کی آنکھیں ہوا میں معلق تھیں۔ اس نے ریحانہ کے ہاتھوں کو چھوکر دیکھا۔ ہاتھ سرد اور بے جان



تھے۔

سپرا گھبرا کر پیچھے ہٹا...ابھی تھی... کچھ دیر پہلے تک۔ چاند والی بڑھیا کا ذکر کرتی ہوئی....ابھی...ابھی نہیں ہے...اس کا سر گھوم رہا تھا۔ وہ زور زور سے ریحانہ کا نام لے کر چلّایا...مگر کوئی فائدہ نہیں۔

سپرا کو احساس تھا۔ وہ مردہ گھر میں ہے۔ یہاں کوئی زندہ نہیں۔ سب کے سب ابھی ہوتے ہیں اور ابھی نہیں۔ ایکدم سے اس طرح کھو جاتے ہیں، جیسے کوئی وجود کبھی رہا ہی نہیں ہو۔ نہ جسم نہ آواز... کچھ بھی نہیں۔ نہ نشانیاں....انسان جسم اور روح سے ہوتا ہے، نشانیوں سے نہیں۔ ریحانہ تھی۔ اب نہیں ہے.... اور یہی سچ ہے۔ وہ ہے اور نہیں ہے...ایک مردہ گھر کا دروازہ کھلا... سپرا نے دیکھا...اس کے قدم مردہ گھر میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہاں کچھ لوگ پہلے سے ہیں، کچھ لاشوں پر جھکے ہوئے ہیں... اور لاشوں پر سفید چادریں پڑی ہیں...اور یہاں بھی وہ عورت موجود ہے...نقاب لگائے۔ وہ دیوار کے پاس چھپ کر کھڑی ہے۔

اس وقت مردہ گھر میں ہونا اس کو سکون دے رہا ہے.... وہ بھی مردہ ہے۔ کاشف کی طرح... ریحانہ کی طرح... چاروں طرف دھند ہے... وہ دھند میں معلق ہے...ہوا میں لہراتے لباس کی طرح جھول رہا ہے۔

## (5)

ریحانہ کی تدفین کے بعد وہ گھر آ گیا۔ دروازے بند کر لیے۔ زندگی واہمہ ہے اور موت حقیقت۔ پھر نمائشی زندگی کیوں ضروری ہے۔

اب وہ ایک مردے کی طرح زمین پر لیٹا تھا اور اسے یقین تھا مجسمہ والی عورت اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ سفید چادریں سرسرا رہی ہیں....اور اس مردہ گھر میں کسی اور کا وجود نہیں۔ اس نے کہیں پڑھا تھا، مردوں کو بھی بھوک لگتی ہے۔ اس لیے فلیٹ میں رکھے فریز سے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ کبھی کبھی گھر سے باہر جانے میں بھی۔ کیونکہ اسے یقین تھا، باہر جو لوگ ہیں، وہ بھی مردہ ہیں۔ ابھی ہیں۔ ابھی نہیں ہوں گے....

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسے احساس ہوا، وہ کسی سرد خانے میں ہے۔ اور اس کے جسم کے اعضا بے جان اور بے حس ہو چکے ہیں۔

مسیح سپرا کی تیاری میں کوئی کمی نہیں تھی۔ گھر کے باہر مردہ خانے کا بورڈ لگانے کا بعد وہ مطمئن تھا کہ اب اس کے پاس کوئی نہیں آئے گا۔ مردہ خانے میں کون آتا



ہے۔ سپرا کو یقین تھا کہ مردہ خانے کا بورڈ دیکھ کر اس سے ملاقات کے لیے آنے والے بھی راستہ بدل کر آگے بڑھ جائیں گے۔ اسے سکون کی ضرورت تھی۔ ایک ایسے سکون کی، جو صرف کسی مردے کے پاس ہوتی ہے، جس کے تمام اعضا اپنا کام بند کر چکے ہوتے ہیں۔ دماغ سوچتا نہیں۔ آنکھیں دیکھتی نہیں۔ ہونٹ بولتے نہیں اور وقفۂ سکون کو ابدیت تب نصیب ہوتی ہے جب یہ بولنا بند کر دیتے ہیں۔ اس نے سنا تھا کہ بلوغت کی عمر کو پہنچنے تک انسانی جسم میں تقریباً دس کھرب خلیات، حیاتیاتی اکائی کی صورت میں ہوتے ہیں۔ عضو آپس میں مل کر نظام اعضاء کو تشکیل دیتے ہیں۔ اس وقت ان خلیوں کے ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری تھا۔ ایک دلچسپ کھیل سپرا کے ہاتھ لگا تھا جبکہ وہ چاہتا تھا کہ اس کے سوچنے کے تمام سلسلے بند ہو جائیں۔ اس نے اپنے دونوں پاؤں کو دونوں ہاتھوں کی جگہ محسوس کیا اور چہرے کو پیٹ کے درمیان لے آیا۔ اسے یقین نہیں ہے کہ اس کے چہرے پر اس احساس کے ساتھ مسکراہٹ پیدا ہوئی ہو تاہم اس وقت وہ پیوند کاری کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اعضاء کی پیوند کاری اسے بالکل پسند نہیں تھی۔ اس نے خیال کیا، مردے سوچا نہیں کرتے اور اس نے آنکھیں بند کرنے کے بعد خود کو نور کے دائرے میں دیکھا کہ اس کا قیاس تھا کہ ایک نور کا ہالہ ہوتا ہے جو روح مقدس کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ مسیح سپرا نور کے ہالہ پر سوار تھا اور ٹھیک یہی وقت تھا جب دروازے پر دستک ہوئی۔ سپرا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اسے غصہ اس بات پر تھا کہ اس دنیا کے لوگ مردوں کو چین سے رہنے نہیں دیتے۔

اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک پولیس والا تھا۔ پولیس والے کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا اور وہ ڈنڈے سے بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

'یہ کیا ہے؟'

سپرا کا لہجہ سرد تھا۔ مردہ خانہ

'کیوں....' پولیس والے کے چہرے پر ناراضی تھی۔

سپرا نے کہنا چاہا کہ میں ایک مردہ ہوں، اس لیے، مگر وہ پولیس والے سے اس وقت الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ دیر تک وہ جواب سوچتا رہا۔ اس درمیان پولیس والا کھلے دروازے سے اندر کی طرف دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

'میں تنہائی چاہتا ہوں۔'

'تو گھر کے باہر مردہ خانہ لکھ دو گے۔؟'

'میں کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔'

'تو....؟'

'میں اکیلا رہتا ہوں'

'تو....؟'

'مجھے دروازہ کھٹکھٹانے سے بھی دقت ہوتی ہے۔'

'تو....؟'

پولیس والا گہری نظروں سے سپرا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

'تمہارا نام؟'

'مسیح سپرا'

' مسلمان ہو؟'

'ہاں جی'

'اوہ....' پولیس والے کے چہرے پر ایک تناؤ نظر آ رہا تھا تاہم وہ اپنے غصے کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک وہ زور سے ہنسا۔



'مردہ خانہ.... جانتے ہو یہ بورڈ لگانا قانوناً جرم ہے۔'

'نہیں جانتا'

'تو اب جان لو۔ رہائشی علاقے میں مردہ گھر نہیں ہوسکتا۔'

'لیکن یہ مردہ گھر تو صرف میرے لیے ہے۔'

'تمہیں اس کے لیے اجازت نہیں ہوگی...اور پولیس سے اس کی اجازت نہیں ملے گی۔ کورٹ بھی تمہیں اجازت نہیں دے گا۔ کہیں کوئی غیر قانونی کام تو نہیں کرتے....؟

'میں مر چکا ہوں....' سپرا کا لہجہ اس بار برف سے زیادہ سرد تھا

'کیا....'

پولیس والا پہلے چونکا۔ پھر اس نے کچھ سوچتے ہوئے اندر کی طرف قدم رکھا۔ وہ حیرت سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس نے قدم پیچھے کیے۔ پولیس والے کا لہجہ اس بار سہا ہوا تھا۔

'اس بورڈ کو ہٹا دو۔'

اس نے پولیس والے کو تیزی سے بھاگتے ہوئے دیکھا۔ سپرا کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ مردے کو دیکھ کر اکثر لوگ ڈر جایا کرتے ہیں۔ اسے بورڈ ہٹانا ہوگا۔ کیونکہ پولیس والا کہہ کر گیا ہے کہ قانون سے بھی اس کی اجازت نہیں مل سکتی۔ رہائشی علاقے میں مردہ گھر نہیں ہوسکتا۔ کیوں نہیں ہوسکتا؟ سپرا نے خود کو سمجھایا اور ذرا سی کوششوں کے بعد بورڈ اس کے ہاتھ میں تھا۔ بورڈ اس نے کچرے کے ڈبے میں ڈال دیا۔ اب اسے سکون و عافیت کے لمحے درکار تھے۔ اس کے گھر کے دو دروازے تھے، اس نے گھر کا پچھلا دروازہ کھولا۔ آگے کے دروازے پر قفل لگایا۔ پھر پچھلے دروازے سے اندر آ کر دروازہ بند کر دیا۔ دیواروں پر سفید چادریں جھول

رہی تھیں اور ان سفید چادروں سے دھند کے جھاگ نکل رہے تھے اور ان چادروں کے پاس ایک طرف وہ مجسمہ تھا، جہاں حجاب والی عورت کو جگہ ملی تھی۔ موت کا فرشتہ، سپرا کو احساس ہوا کہ عورت کے چہرے پر بھی مسکراہٹ ہے گویا اس نے بھی پولیس والے کو بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔

سپرا دوبارہ زمین پر لیٹ گیا۔

آنکھیں بند کر لیں۔

اب وہ اپنی موت کی دنیا میں تنہائی چاہتا تھا اور اسے یقین تھا، باہر قفل لگا ہوا دیکھ کر کوئی بھی اس سے ملنے کی کوشش نہیں کرے گا۔

سپرا نے خود کو ایک طویل نیند کے حوالے کر دیا۔ مگر یہ کیا۔ آنکھوں کے پردے پر ایک تصویر ابھر رہی تھی۔ اس تصویر میں دو لوگ تھے۔ کیا مردے خواب دیکھتے ہیں....؟ کیا مردے چلتے پھرتے ہیں؟ یہ دو لوگ جو باتیں کر رہے تھے، سپرا ان کی باتوں کو سن سکتا تھا۔

●●

ایک کا سر گنجا تھا۔ پستہ قد۔ موٹا بھائی۔ دوسرے کے چہرے پر گھنی داڑھی تھی۔ یہ ایک عالیشان کمرہ تھا۔ میز پر بریانی اور کباب کی خالی پلیٹ پڑی تھی۔ دروازے بند تھے۔ شیشے کے باہر صرف نیلا آسمان نظر آ رہا تھا۔ گھنی داڑھی والا اس وقت کسی گہری سوچ میں مبتلا تھا۔ جبکہ موٹا آدمی عینک صاف کرتا ہوا پرسکون تھا۔ وہ اتنا پرسکون تھا جتنا کوئی سمندر یا دریا ہو سکتا ہے۔ اس کے پرسکون رہنے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ کوئی بھی اس کے سامنے کچھ بھی بولنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ ایسا وہ سوچتا تھا اور عملی طور پر ہوتا بھی یہی تھا۔ بساط اس کے کرتے کی داہنی جیب میں تھی اور بائیں جیب میں سکّے۔ وہ سکے اچھالتا تھا اور پھر اپنی مرضی مطابق بساط سمیٹ



لیتا تھا۔ موٹے آدمی کو اس بات کی کوئی فکر نہیں تھی کہ سامنے والا آدمی کیا سوچتا ہے؟ لوگ کیا سوچتے ہیں؟ اس کے حریف اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ اگر وہ یہی سب سوچتا رہتا تو شاید ملک کا سب سے طاقتور آدمی ثابت نہیں ہوتا۔

اور اس وقت جب سامنے، کھڑکی سے باہر نیلا آسمان تھا۔ میز پر بریانی کی خالی پلیٹ پڑی تھی، موٹے آدمی نے داہنی جیب سے لیمینیشن کرائی ہوئی بساط نکالی اور گھنی داڑھی والے کے سامنے میز پر رکھ دی۔

گھنی داڑھی والا مسکرایا۔ 'یہ بساط تمہاری جیب میں آ جاتی ہے۔؟'

'میری جیب میں تو دنیا آ جاتی ہے۔'

'ہاہا...' گھنی داڑھی والا ہنسا۔ 'لیکن تمہاری جیب تو چھوٹی ہے...'

'ہاتھ تو لمبے ہیں۔' موٹا بھائی نے اس بار چشمہ ٹھیک کیا۔

'پھر بھی۔ یہ بساط جیب میں رکھنے سے مڑ تڑ سکتی ہے۔'

'سوال ہی نہیں۔' موٹا آدمی مسکرایا۔ 'لیمینیشن پر خون کے چھینٹے اور اس پر اسپرٹ۔ لیمینیشن مضبوط رہتا ہے۔'

'ہاہا...' گھنی داڑی والا مسکرایا۔ تم خون کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے؟'

'کیا خون کے بغیر کوئی کام ہو سکتا ہے سر۔؟'

'لیکن بساط پر خون کے چھینٹے اور اس پر اسپرٹ؟'

'اصل تو بساط ہے۔ سارا کام تو اس بساط کا ہے۔ خون کا چھینٹا دینا پڑتا ہے۔'

'پورا بنیا۔' گھنی داڑھی والا ہنسا۔ 'تو تم کو ہر کھیل میں خون کے چھینٹے کی ضرورت ہوتی ہے۔؟'

'ایسا نہیں ہے۔' موٹا بھائی ہنسا۔ 'بلڈ اسپرے، یہ جلدی کام کرتا ہے۔'

'ہونہہ۔ ملک بیمار ہو گیا ہے۔' گھنی داڑھی والا کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ٹہلتا ہوا

کھڑکی کے پاس آ گیا، جہاں سے نیلا آسمان جھانک رہا تھا۔ ’کیا تم کو لگتا ہے کہ.....‘

’سر، کیا اب تک ہم ناکام ہوئے؟‘

’نہیں۔‘

’پہلے دن سے۔ اب تو بیس برس گزر گئے۔‘

’ہاں۔‘

’مگر کبھی کبھی تم سے ڈر لگتا ہے...‘

’کیوں سر۔‘

’تم ذرا تیز بھاگتے ہو۔‘

’آپ سے بھی تیز....؟‘

’ہاں،‘ داڑھی والا مڑا۔ اب وہ موٹے آدمی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گو تمہارے فیصلے سے میں کبھی ناخوش نہیں ہوا۔ اور میں جس مقام پر ہوں، اس میں صرف تمہارا ہاتھ ہے۔ مجھ سے بھی کہیں زیادہ۔ میں کامیاب ہی نہیں ہوتا اگر تمہارا ساتھ نہ ہوتا اور یہی بات مجھے ڈراتی بھی ہے۔

’کیوں سر؟‘

’سیاست۔‘ گھنی داڑھی والے کا چہرہ اب بھی سنجیدہ تھا اور وہ اب عقاب جیسی نظروں سے موٹے آدمی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

’آپ کو ڈرنا نہیں چاہیے سر۔‘

’کیوں؟‘

’مجھے آپ کے بغیر کوئی نہیں جانتا۔ لوگ آپ کو جانتے ہیں۔ مقبولیت آپ کی ہے اور میں فقط کیشئر ہوں۔ اس مقبولیت کو کیش کرتا ہوں۔ میں کبھی آپ نہیں بن سکتا۔ لوگ مجھے قبول بھی نہیں کریں گے۔‘



’لیکن تم پتے تیز چل رہے ہو۔‘

’تاش کے پتے ہیں سر۔‘

’ہاں۔ مگر ساری جیت تم اکیلے اپنے نام کر رہے ہو...‘

موٹے بھائی کے چہرے پر تبدیلی آئی۔ ’نہیں سر۔ تاش بھی آپ کا۔ پتے بھی آپ کے۔ میں وہی کر رہا ہوں، جس کی اجازت آپ سے ملی۔‘

’چنار کی اجازت کیا مجھ سے ملی تھی۔؟‘

’صدفی صد تو نہیں۔‘

’اور ڈلواما کی.....؟‘

’وہ میری پلاننگ تھی مگر کام کر گئی۔‘

گھنی داڑھی والے نے ٹہلنا جاری رکھا۔ ’اور اسی لیے اب تم خطرہ بنتے جا رہے ہو...‘

’ایسا نہیں ہے سر۔‘

گھنی داڑھی والا مسکرایا۔ خطرہ مت بننا۔ سب ہمارے دشمن ہیں۔ ایک نہیں دو جانیں جائیں گی۔‘

’میں سمجھتا ہوں سر۔‘

’کبھی کبھی میں ڈر جاتا ہوں....‘ گھنی داڑھی والا کہتے کہتے رک گیا.....

’کیا....؟‘

’نئے انتخاب سے پہلے۔ کیا مجھے امید تھی...‘

موٹا بھائی ہنسا۔ ’آخری پریس کانفرنس میں آپ نروس تھے سر۔ مگر بساط..... میں نے مہرے چل دئے تھے۔‘

’ہاں۔ اور تمہارے سارے مہرے کامیاب رہے۔‘

'مجھ پر یقین قائم رکھیے سر۔'

'میں بھی تو بنیا ہوں۔' گھنی داڑھی والا مسکرایا۔ تم کو اب کیسا لگتا ہے، یہ لوگ مان جائیں گے؟'

'کس بات پر؟'

'پلّوں کو آؤٹ کرنے کے معاملے میں۔'

موٹا بھائی مسکرایا۔ میرے مہرے کبھی نہیں پٹے سر۔ یہ عبارت تو کانگریس نے لکھی تھی۔ ملک کا بٹوارہ مذہب کے نام پر ہوا۔ آزادی کے بعد میں نے مذہب کا صفحہ کھول دیا۔'

'اس دلیری کے ساتھ...'

'دلیری تو آپ سے سیکھی ہے سر۔'

'زلزلہ آجائے گا۔'

'آنے دیجیے سر۔ پرانی عمارت ملبہ بن گئی سر۔ اب بہت کم مہرے بچے ہیں۔'

'معیشت کی کشتی میں سوراخ......؟'

'اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ لوگ سوکھی روٹی کھائیں گے مگر ہمارا ساتھ دیں گے۔'

'اتنا اعتبار کہاں سے لاتے ہو.....؟'

'بنیا ہوں سر۔ آپ سے سیکھا ہے۔'

گھنی داڑھی والا دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔' بہت تیز جا رہے ہو اور اسی لیے کبھی کبھی تم سے ڈر لگتا ہے۔'

'ابھی اور بھی تیز جانا ہے سر۔ بلڈ اسپرے.....'

'بلڈ اسپرے۔' گھنی داڑھی والا مسکرایا.... ابھی کچھ دن تک اس اسپرے کو بند رکھو۔ حالات کا جائزہ لو۔'



'یس سر۔'

میز کے آمنے سامنے دونوں بیٹھ گئے تھے۔ سامنے غروب آفتاب کا منظر تھا کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی۔

مسیح سپرا کا چہرہ کھلا تھا۔ سفید چادروں کے درمیان موت کے فرشتہ نے جب اس کی طرف دیکھا تو اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اب وہ کچھ دیر نیند کی آغوش میں جانا چاہتا تھا۔ مگر اب اس کی نیند ٹوٹ گئی تھی۔ وہ اندھیرے کے دائرے میں تھا۔ موبائل، ٹی وی، اخبار.....وہ سب سے کٹ چکا تھا۔ وہ ایک مردہ تھا بس.....

اس نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔ اس بار کچھ لوگ تھے جو ایک مینار پر چڑھے ہوئے تھے۔ جن کے پاس اسلحے تھے۔ ہتھوڑے تھے۔ کچھ لوگ نعرے لگا رہے تھے۔ وہ مینار کو مسمار ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کبوتروں کے جھنڈ کو دیکھا..... جو اڑتے ہوئے کسی سیاہ سوراخ میں سمانے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر اس نے جلتی ہوئی آگ دیکھی۔ کچھ قبائلی تھے جو ڈھول بجا رہے تھے اور رقص کر رہے تھے۔ وہ جس زبان میں گفتگو کر رہے تھے، مسیح سپرا اس سے واقف نہیں تھا۔ پھر اس نے کچھ سلگتے ہوئے گھر دیکھے.... کچھ لوگوں کو جان بچا کر بھاگتے ہوئے دیکھا..... مسیح سپرا کو یقین تھا۔ موت ہر جگہ ہے اور موت کے فرشتے ہر اس جگہ پہنچ چکے ہیں جہاں ایک بھی انسان باقی ہے...

ایک دن مینار ٹوٹ جاتے ہیں...

ایک دن پرندے اڑ جاتے ہیں...

'اُڑ...اُڑ...چل خسرو گھر آپ نے سانجھ بھئی چودیس۔'

اب مسیح سپرا گہری نیند میں تھا۔

(6)

باہر کسی کے آہستہ آہستہ چلنے کی آواز تھی۔ پھر ایک ساتھ بہت سارے فوجی بوٹ کی آواز سنائی دی۔ جیسے کوئی لشکر گزر رہا ہو۔ کچھ دیر بعد سناّٹا چھا گیا۔ دروازے کے باہر کچھ لوگوں کے چلنے کی ہلچل تھی۔ سناٹے میں اچانک فائرنگ کی آواز گونجی۔ اس کے بعد پھر سناٹا چھا گیا۔ فائرنگ کس نے کی؟ فوجی کہاں جا رہے تھے؟ یا یہ سب دماغ کا وہم ہے۔ دماغ اندھیرے میں کچھ زیادہ ہی سوچتا اور کام کرتا ہے۔ کہیں وہ پولیس والا دوبارہ ادھر نہ آجائے۔ دروازے پر قفل ہے۔ اس لیے وہ نہیں آسکتا۔ وہ مر چکا ہے تو پھر ایسے خیال اسے کیوں آرہے ہیں۔ مسیح سپرا کو پیاس محسوس ہوئی۔ فریز سے بوتل نکال کر ایک گھونٹ پیا۔ پھر زمین پر آکر لیٹ گیا۔ کل اس نے برگر کھایا تھا۔ سامان کم ہو رہے ہیں۔ ایک ہفتہ میں شاپنگ کے لیے اسے باہر جانا پڑ سکتا ہے۔ مگر وہ مطمئن تھا۔ وہ مردہ ہے اور ادھر ادھر گھوم سکتا ہے۔ کھا پی سکتا ہے۔ مگر وہ مر چکا ہے۔ حقیقت یہی ہے۔ اس نے دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ وہ ہر طرح کی فکر سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر یہ کیا۔ سامنے دونوں کھڑے تھے اور یہ کسی محل کی عمارت تھی۔ کمرہ بند تھا۔ وہ دونوں پھر سے موجود تھے۔ ایک گنجے سر والا۔ دوسرا گھنی گھنی داڑھی والا۔ دونوں عجب انداز میں ہنس



رہے تھے اور اس وقت ان کے چہرے ڈارون کے قدیم بندروں جیسے تھے....

’کیا تمہیں لگتا ہے.....‘ داڑھی والا کچھ پوچھتے ہوئے خاموش رہ گیا۔

’ایک سوراخ برابر غفلت اور ہم دونوں نہیں ہوں گے۔‘

’ہاں،‘ گھنی داڑھی والا خیالوں میں کھویا تھا.... ہم نہیں ہوں گے۔

’اور ہمارا ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں۔‘ گنجے سر والے نے کہا۔

’یہ بھی صحیح۔ مگر ہمارا ایک ایک قدم.....‘

’ہم صحیح راستے پر ہیں۔ بس یہی راستہ ہمیں زندہ رکھ سکتا ہے۔‘

’شاید تم ٹھیک کہتے ہو،‘ گھنی داڑھی والے کی آنکھیں چھوٹی تھیں۔ فکر کے دوران یہ آنکھیں اتنی چھوٹی ہو جاتی تھیں کہ ان آنکھوں کے نہ ہونے کا گمان ہوتا تھا.... وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔

’ایک تاریخی فیصلہ....‘

’اور بہت سارے مردے،‘ گنجے سر والا ہنسا۔ اب دو ہی ذات ہیں۔ زندہ اور مردہ۔‘

’کیا مردے بولیں گے؟‘

’کیا مردے بول سکتے ہیں،‘ گنجے سر والا زور سے ہنسا۔

’تم نے چتر بنیا کہا تھا۔‘

’اس چتر بنیے کی لاش کو بھی دفن کر دیں گے۔‘

’اب تک سب کچھ ہماری مرضی سے ہو رہا ہے۔ یعنی جیسا ہم نے چاہا۔‘

’آگے بھی اپنی مرضی سے ہوگا۔ یعنی جیسا ہم چاہیں گے۔‘

’گڈ،‘ گھنی داڑھی والا کچھ سوچ رہا تھا‘.... تم وہ مرگ نینی لائے ہو...‘

’کاغذ کہیے سر۔‘

'ہاں۔ کاغذ کا ڈھیر۔ لائے ہو؟'

'اس کی ضرورت نہیں تھی۔'

'ہاں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اور مجھے یقین ہے....'

' نئی تاریخ نئے کاغذ پر لکھی جائے گی۔'

'سچ۔ بالکل سچ۔ یہی ہوتا رہا ہے۔ ہم ان سے سیکھ رہے ہیں، جنھوں نے ہم سے پہلے کچھ غلطیاں کیں۔'

'نئے کاغذ پر نیا نقشہ بنے گا۔'

'اوہ...میں زندہ ہوں۔ مجھے یقین نہیں آتا۔ مگر تم سے....'

'تم سے کیا سر۔

'تم سے ڈر لگتا ہے۔ تم جسمانی طور پر بھی مجھ سے زیادہ طاقتور ہو۔'

'ہاہا...' گنجے سر والا ہنسا مگر بولا کچھ نہیں۔

'گھوڑوں کی ریس ہے سر۔'

' کچھ کمزور گھوڑے بھی ہوں گے۔'

'ہاں انہیں پیچھے رکھا گیا ہے۔'

'چلو۔ ریس دیکھتے ہیں۔'

محل نما کمرے میں اب سناٹا تھا۔ مسیح سپرا کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ اب بہت سے گھوڑے تھے، جنہیں وہ ریس کورس میں دوڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کچھ گھوڑے تیز دوڑ رہے تھے۔ کچھ گھوڑے نقاہت کی وجہ سے گر گئے تھے۔ کچھ گھوڑے آدھے راستے میں ہی دم توڑ گئے تھے....سفید چادروں کے درمیان والی عورت اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔



مسیح سپرا نے آنکھیں بند کرلیں۔

# باب سوم

# گل بانو، صندوق اور قتل

(1)

## کے۔بی۔روڈ

یہ نام ایک ایسی بستی کا ہے، جس کے ذکر سے ہی دلی والوں کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ پرانی دلی کی سنکری گلیاں۔ ایک طرف جامع مسجد سے آگے جاتی ہوئی سڑک، دوسری طرف ترکمان گیٹ کے اندر سے، ایک دوسرے سے ملنے والی گلیاں۔ ان سڑکوں پر چلنا آسان نہیں۔ موٹر گاڑیاں، رکشے والے، ٹھیلے والے، ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے اور شور اس قدر کہ اچھے بھلے آدمیوں کے کان پھٹ جائیں۔ ان گلیوں کے نام میں بھی جادوگری ہے۔ بلی ماران، چوڑی والان، کالی مسجد روڈ، وکیلوں والی گلی، سوئی والان اور ان کے درمیان ہی، کہیں کے بی روڈ کا چوراہا آتا ہے تو نگاہیں سیدھے اوپر کی جانب چلی جاتی ہیں۔ طوائف خانہ، چکلہ خانہ، قحبہ خانہ، ڈیرہ دار، آپ جس نام سے پکار لیجیے، یہاں کی عورتوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے گزرتا ہوا نظیرا ایک چائے کے کھوکھا کے پاس رُکا۔ تیز آواز میں بولا۔



'اسلم میاں۔ ذرا گاڑھی چائے بنانا... اور اخبار بڑھانا۔'

'ابھی دیتا ہوں۔'

نظیرا کی آنکھیں سامنے والی چھت کے آس پاس بھی منڈرا رہی تھیں۔ پھر اسے نور جہاں خالہ نظر آئیں جو کپڑے سکھانے کھڑکی پر آئی تھیں۔ چائے پیتے ہوئے نظیرا نے اخبار پڑھتے ہوئے زور زور سے بولنا شروع کیا۔

'ابے، گڑے مردے ہیں ہم۔ یہ بھی لے لیں گے اور وہ بھی لے لیں گے۔ پرانی عمارت توڑ دیا اور اب کیا توڑیں گے۔'

اسلم میاں نے دیدے نچاتے ہوئے پوچھا۔ کیا ہوا نظیرا...

'ارے ذرا خبر تو دیکھو۔ مسلمانوں کو مسجد میں نماز پڑھنے سے روکا۔ ایک ٹرک روک کر چار مسلمانوں کو مار دیا۔ اس لیے کہ وہ گائے لے کر جا رہے تھے۔'

'ارے نظیرا، ضرورت کیا تھی گائے لے کر جانے کی۔'

وہ چار لوگ اور نظیرا کی بحث میں شامل ہوگئے۔ یہ اسی علاقے کے لوگ تھے اور ان سب کا تعلق کوٹھوں سے تھا۔ نظیرا نے کرتا پائجامہ پہن رکھا تھا۔ سر پر دوپلّی ٹوپی تھی۔ اس وقت وہ غصے میں تھا۔

'صحیح حشر ہو رہا ہے مسلمانوں کا۔'

'ارے کیوں بھائی' اسلموا نے پوچھا جو منیرا بائی کا خاص آدمی تھا۔

'آپس میں لڑتے ہیں سالے۔'

'کون؟ مسلمان؟'

'اور کیا۔'

ابو بھائی جو سازندے تھے، انہوں نے لمبی آہ بھری۔ آزادی کے بعد ادھر نہ ہم خوش، نہ ادھر وہ خوش۔'

'ارے ان کو جہنم میں جانے دو۔ ہم تو چین سے رہیں،' نظیرا نے چائے کا گلاس خالی کیا۔ بینچ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ سڑک پار کرنے کے بعد چھوٹے چھوٹے دربے جیسے گھر تھے۔ ان گھروں کی سیڑھیاں تنگ تھیں۔ دو آدمی ایک ساتھ نہیں چل سکتے تھے۔ سیڑھیوں پر چڑھ کر نظیرا بالائی منزل پر آگیا۔ کنڈی کھٹکھٹائی۔ خالہ نور جہاں کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

'کیا بات ہے نظیرا'

'پوچھو مت خالہ۔ مسلمانوں کے تو برے دن شروع ہو گئے۔'

'کبھی تو اچھی خبر لایا کر نظیرا'

'اب اچھی خبر کہاں سے لاؤں خالہ۔ یہ حکومت دوبارہ تقسیم کرا کے دم لے گی۔'

'ایسا کیوں کہتا ہے نظیرا'

'حالات ہی ایسے ہیں خالہ۔ اب ادھر سنو'

پاس کے دو تین گھروں سے لڑائیوں اور 'گالی گفتے' کی آوازیں آرہی تھیں۔ گالیاں ایسی فرّاٹے دار کہ نور جہاں نے اپنی زندگی میں کبھی نہ سنی ہوں۔ یہ عورتیں کچھ برس قبل ہی اتر پردیش سے آئی تھیں۔ اور ان گھروں کے درمیان ہمیشہ جنگ ہوتی رہتی تھی۔ کبھی کپڑے سکھانے کے نام پر۔ کبھی پانی بھرنے کے نام پر۔ کبھی بچوں کو لے کر۔

'یہ روز کے حالات ہیں'

'رونق رہتی ہے۔' نظیرا ہنسا۔ اچھا چلتا ہوں خالہ۔

گزرتے وقت کے ساتھ اب اس علاقے کی رونق کم ہو گئی تھی۔ شہر کی ہلچل



وہی تھی۔ مگر اس پیشے کی کمائی کم ہو گئی تھی۔ وقت بدل رہا تھا۔ مہاراشٹر سے آئی ہوئی اسمرتی کا خیال تھا کہ اب بڑے بڑے بنگلوں میں بھی یہ کاروبار شروع ہو گیا ہے۔ شریفانہ طریقے سے۔ پھر ان بدبودار علاقوں میں کون آئے گا۔

گل بانو کبھی یہیں رہتی تھی.....

اسی بستی میں--

## (2)

اندھیرا بڑھ چکا تھا۔گل بانو لفٹ سے نیچے آئی۔ادھر ادھر دیکھا۔ریسپشن پر بیٹھی ہوئی لڑکی اونگھ رہی تھی۔ باہر جانے والا دروازہ کھلا تھا اور اس وقت کوئی چوکیدار نہیں تھا۔ دبے پاؤں وہ دروازے تک آئی۔ باہر نکلی اور تیز تیز قدم بڑھانے لگی...گل بانو کے لیے یقین کرنا مشکل تھا کہ ایک لمحے کے اندر اس کی دنیا تبدیل ہوچکی ہے۔رات کے سناٹے میں وہ زیادہ تیز دوڑ بھی نہیں سکتی۔دوڑنے پر کسی کو بھی شک ہوسکتا ہے۔سڑک سناٹے میں ڈوبی تھی۔گل بانو کی سانسیں ایک دوسرے میں الجھ گئی تھیں۔سر گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔اسے پناہ کی تلاش تھی لیکن اس عالم میں اسے پناہ کہاں ملے گی، کہیں ملے گی بھی یا نہیں، یہ کہنا مشکل تھا۔سڑک پر اس وقت اکا دکا گاڑیاں چل رہی تھیں۔کبھی کبھی کوئی گاڑی ویران سڑک پر اس سرعت سے گزر جاتی کہ کان کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوتے۔وہ سڑک کے کنارے کنارے چل رہی تھی۔قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی مگر گل بانو نے سوچ رکھا تھا کہ ہر حال میں وہ خود کو بچانے کی کوشش کرے گی اور کہیں نہ کہیں خود کو محفوظ رکھنے کا راستہ تلاش کرلے گی۔

●●



بچپن سے گل بانو کو بوڑھوں سے پیار تھا۔ پارک میں ایک ساتھ کئی بوڑھوں کو دیکھ کر وہ بچوں کی طرح خوش ہوجاتی۔ بزرگوں کے چہرے کی مسکراہٹ میں وہ اپنے پیشے اور اپنی دنیا کو بھول جاتی تھی۔گل بانو کو غم اس بات کا تھا کہ اس نے اب تک اماں کی بزرگی نہیں دیکھی تھی۔اماں ابھی پچاس برس کی تھیں مگر پچاس برس کی عمر میں بھی اس کی اماں خاصہ قیامت نظر آتی تھیں اور گل بانو سے بھی کہا کرتیں کہ ہماری ساری خوبصورتی کا معیار جسم ہے۔ چہرہ نہیں۔ چہرہ ذرا ڈھل بھی جائے تو بیوٹی پارلر ہیں مگر جسم ڈھل جائے تو بیوٹی پارلر بھی کچھ نہیں کرسکتا۔ اس لیے جسم کو خوبصورت اور سڈول رکھنے کے لیے گل بانو کو ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔

اماں کے پاس ایک بڑا سا صندوق تھا۔ اس صندوق میں ہمیشہ ایک بڑا سا قفل پڑا رہتا۔گل بانو کو بچپن سے ہی اس صندوق سے خاصہ لگاؤ تھا۔ یہ صندوق گل بانو کے لیے انتہائی پراسرار تھا۔جیسے وہ سوچتی تھی کہ قفل کھلے گا اور صندوق میں اسے اندر جانے والی ایک سرنگ ملے گی۔ پھر یہ سرنگ اسے کسی پریوں کے جزیرے پر لے جائے گی۔اس قسم کی کئی اور باتیں تھیں، جو اکثر وہ سوچا کرتی تھی۔جیسے یہ کہ ممکن ہے۔اس صندوق میں اماں نے کسی دیوی یا راکشش کو بند کر دیا ہو۔قفل کھلتے ہی راکشش باہر آجائے گا اور اسے کچا کھا جائے گا۔ وہ جب بھی اماں سے اس صندوق کے بارے میں پوچھتی۔اماں نور جہاں اسے ڈانٹ کر بھگا دیتیں۔یہ وہ عمر تھی جب گل بانو کو اماں نے پاس کے اسکول میں پڑھنے کے لیے بٹھایا تھا۔ یہاں اماں کے پیشے والی دوسری عورتوں کے بچے بھی پڑھتے تھے۔لیکن گل بانو ذہین تھی، سبق فر فر یاد کرلیتی اور چھوٹی عمر سے ہی گل بانو نے ایک نئی دنیا کو دیکھنا شروع کردیا تھا...اور اس دنیا کے بارے میں گل بانو کی رائے یہ تھی کہ اس دنیا کے بیشتر لوگ اماں کے صندوق میں بند راکشش جیسے ہیں لیکن کچھ لوگ پریوں کی طرح ہیں

اور پریاں معصوم ہوتی ہیں۔

اس صندوق کی اپنی ایک تاریخ تھی۔ یہ پشتینی صندوق تھا اور اماں نورجہاں کے مطابق جیسے دنیا گھومتی ہے، زمین کے اندر قارون کا خزانہ گھومتا ہے اسی طرح یہ صندوق بھی پورے ہندوستان کا چکر لگا آیا تھا، پر دادی کے پاس کولکاتا میں یہ صندوق رہا۔ پھر دادی اس صندوق کو لے کر حیدرآبادی نواب گھرانے سے وابستہ ہوگئیں۔ حیدرآبادی نوابوں کو دادی کا چہرہ اور رقص کا انداز بہت پسند تھا۔ حیدرآبادی نوابوں سے دل بھرا تو دادی گلبرگہ شریف چلی گئیں۔ پھر وہاں سے بلند شہر اور اس طرح امّاں نورجہاں کے ساتھ یہ صندوق دلّی آ گیا۔ لیکن دلّی آنے تک زمانے بدل چکے تھے۔ لیکن دادی اور پر دادی کا زمانہ اور تھا۔ اماں کا زمانہ اور تھا۔ اماں کے زمانے تک دلی بھی بدلی، دستور بھی، نظریات بھی اور شوق بھی۔ اماں پہلے چاندنی چوک کے پاس اس جگہ رہتی تھیں جہاں ان کی ہم پیشہ طوائفوں کے چھوٹے چھوٹے گھر تھے۔ اماں نورجہاں کے پاس ان دنوں ایک بزنس مین آیا کرتا تھا، شروع شروع میں وہ خاموش رہتا تھا، مگر آہستہ آہستہ اماں سے اس کو عشق ہو گیا۔ اس نے عشق کے تحفے کے طور پر اماں کو ایک خوبصورت سا گھر ساؤتھ ایکس میں دلا دیا۔ اس گھر میں اسے آنے جانے کی آسانی تھی اور اماں گل بانو کو اس نے کہہ رکھا تھا کہ اس کے سوا کسی اور سے تعلق نہ رکھا جائے۔ جب تک وہ زندہ رہا، اماں اس بزنس مین کی جاگیر بن کر رہی۔ وہ شام گئے آتا اور صبح ہوتے ہی چلا جاتا۔ گل بانو طویل وقت تک یہ سلسلہ دیکھتی رہی۔ وہ اتنا جانتی تھا کہ اس شخص کی آمد سے اماں کے چہرے پر خوشی آجاتی ہے۔ اس نے کئی بار اماں سے اس آدمی کا نام پوچھنا چاہا۔ مگر اماں نورجہاں کے مطابق نہ کبھی اس نے اپنا نام بتایا نہ یہ کہ وہ کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر اماں کا خیال تھا کہ وہ سندھی ہے اور ہندو ہے۔ اماں پنجابی



اور سندھیوں کے لہجے سے واقف تھیں۔ پھر اس بزنس مین نے آنا بند کر دیا۔ اماں کو چھ مہینے تک انتظار رہا لیکن ایک دن معلوم ہوا کہ روڈ ایکسیڈنٹ میں اس کی موت ہو گئی۔ اس دن گل بانو نے پہلی بار اماں کو چوڑیاں توڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ گل بانو جانتی تھی کہ اماں سے اس کا رشتہ نازک حد تک گہرا ہے اور اس لیے وہ اماں کو اس پراسرار اجنبی کا نام لے کر چھیڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اماں نے کچھ دن تک خود کو سفید لباس کے حوالہ کیا اور گل بانو کو احساس تھا کہ اماں نے اس اجنبی میں ایک شوہر کو دیکھا تھا اور یہ کچھ برس جو اجنبی کے ساتھ گزرے، اماں کے لیے زندگی کے سب سے قیمتی برس تھے۔ پراسرار اجنبی کچھ پیسے چھوڑ گیا تھا۔ اس لیے کچھ مہینوں تک اماں کو کچھ بھی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ کچھ مہینے گزر جانے کے بعد اماں کو پیسوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اماں اس بات سے خوش تھیں کہ وہ جس جگہ رہتی ہیں اس کے آس پاس ایلیٹ کلاس کے لوگ ہیں اور اس طرح اماں بھی اب ایلیٹ کلاس میں شمار ہوتی ہیں۔ اس علاقے میں کسی مڈل کلاس آدمی کا کوئی مکان نہیں تھا۔ اماں اس بزنس مین کو دعائیں دیتی تھیں، جو انھیں چکلہ گھر سے نکال کر ایلیٹ کلاس والوں کے درمیان لے آیا تھا۔ گل بانو سوچتی تھی، اس کے درمیان اور ایلیٹ کلاس والوں کے درمیان ذرا بھی فرق نہیں ہے۔ کم عمری میں ہی فنون لطیفہ میں اس کی دلچسپی پیدا ہوئی۔ وہ داستانوں کو پڑھ گئی۔ پینٹنگس میں اس کی دلچسپی تھی۔ وہ کسی بھی اچھی نمائش میں سب سے پہلے پہنچنے والوں میں رہتی تھی۔ وہ سیاست میں بھی دلچسپی رکھتی تھی۔ جب اسکول میں تھی اس نے انگریزی زبان میں خصوصی طور پر دلچسپی لی۔ وہ جانتی تھی کہ اماں کے صندوق سے ایک دن پٹاخے اور آتش بازیاں نکلیں گی۔

اماں کی جہاں پہلے رہائش تھی، اس علاقے کے تمام گھروں کو چکلہ گھر کہا جاتا تھا اور اماں کو اس نام سے وحشت ہوتی تھی۔ رات کے ڈھلتے سایے میں وہاں

آنے والے زیادہ تر بیمار اور مریض ہوا کرتے تھے۔اماں کو اس بات کا بھی خدشہ لگا رہتا کہ ان کی بیماریاں ان کے نازک جسم میں منتقل نہ ہوجائیں۔ کچھ کو تو اماں دروازے سے ہی بھگا دیتیں۔ یہ زمانہ گل بانو کو اچھی طرح یاد ہے اور اس زمانے تک اس پراسرار اجنبی یا بزنس مین سے اماں نور جہاں کا واسطہ نہیں پڑا تھا۔

رات کے جاگے ہوئے دوپہر تک سوتے رہتے، دوپہر دو بجے کے بعد ہی چکلہ گھروں میں کھٹ پٹ کھٹ پٹ کی آوازیں شروع ہوتیں۔ ناچنے کا کمرہ سج جاتا۔ دیواروں کے کنارے کرسیاں لگ جاتیں۔ اماں نے قندیل اور رنگ برنگی بتیوں کا بھی استعمال کیا تھا، جس سے چکلے کی سجاوٹ میں اضافہ ہو۔آس پاس چکلہ گھروں کی لڑکیاں صبح سویرے سے ہی بن سنور کر کھڑکی کے پاس کھڑی ہوجاتیں اور ہر آنے جانے والوں کو فحش انداز میں اشارہ کرتیں۔لیکن یہ سب اماں کو قبول نہیں تھا۔

’کیا تم ان سے الگ ہو؟‘ گل بانو معصوم بن کر سوال کرتی....

’نہیں‘، اماں کا جواب ہوتا۔

’پھر ان لوگوں سے گھلتی ملتی کیوں نہیں ہو‘

’یہ پشتینی پیشہ ہے، اس لیے احترام کرتی ہوں۔مگر ان کے جیسی نہیں ہوسکتی۔‘

’اور میں.....‘

’تیرے بارے میں فیصلہ بعد میں ہوگا۔ابھی پڑھنے پر دھیان دے۔‘

اس نے کھڑکیوں سے کئی بار آس پاس کے چکلہ گھر کا جائزہ لیا۔شام ہوتے ہی دروازے سج جاتے۔ نیلے سرخ بلب کی روشنیوں میں سگریٹ کے دھویں تیرتے نظر آتے۔عورتیں کوٹھے مٹکاتی ہوئی اور پاؤں کو اچھالتی ہوئی مردوں کو زیر



کرنے میں مصروف ہوتیں۔ باہر سڑک سے گزرنے والے رکشے اور پیدل چلنے والے مسافر ایک بار ٹھہر کر چکلہ گھر کی رونق کو دیکھنے کے لیے ضرور رُکتے۔کبھی کبھی گلی اندھیرے میں نظر آتی۔ گھر کے اندر رکھے ہوئے پیانو خاموش رہتے...اس پورے علاقے میں چکلہ گھر سے نکلنے والی ایک عجیب سی بدبو کا احساس ہوتا تھا گل بانو کو۔گل بانو اس بدبو سے خوف کھاتی تھی۔خوشبو دار صابن اور ایر فریشر بھی اس بدبو کو روکنے میں ناکام رہتے۔کبھی کبھی یہ سب بھول کر گل بانو شیکسپیئر کے بارے میں سوچتی۔ اسے برنارڈ شا بھی پسند تھے۔ وہ جانتی تھی کہ چکلہ گھر میں آنے کے لیے اماں کی کیا غلطی تھی۔ یہ تقدیر کی بات ہے۔ وہ بھی تو اسی چکلہ گھر میں پیدا ہوئی مگر وہ چکلہ گھر کے طور طریقوں کو سیکھنے پر یقین نہیں رکھتی تھی۔

وہ چھوٹی تھی۔ دس برس کی تھی۔ جب اس علاقے میں فساد ہوا۔ اماں نور جہاں کہتی تھیں کہ جب ایسے لوگ چکلہ گھروں تک آسکتے ہیں تو اس دنیا کی خیر نہیں۔ یہاں تو جسم سجتے ہیں اور جسموں کا نام نہیں ہوتا۔ ریحانہ رات میں رجنی بن جاتی ہے۔ رجنی، سلطانہ۔ یہاں تو نام روز بدلتے ہیں۔ دو غنڈے اس کی سیڑھیوں پر بھی چڑھے۔گل بانو کے پستانوں کو دبایا۔ بوسہ لیا۔ اماں کو لے کر کمرے میں بند ہوئے۔ پھر باہر نکلے ...اور دندناتے دندناتے ہوئے سیڑھیوں سے اتر گئے۔اماں کئی دنوں تک خاموش رہیں۔لیکن اس درمیان گل بانو مسلسل اس بات پر غور کرتی رہی کہ اس کے جسم میں تبدیلی آرہی ہے۔ وہ اماں سے اپنے احساس کے بارے میں کوئی بھی بات کہتے ہوئے جھجھک محسوس کرتی تھی۔مگر وہ پہلا دن تھا جب دو مردوں نے اس کے کچے پستانوں کو چھوا تھا اور اس کی فکر میں تغیر پیدا ہوا تھا۔

یہ حادثہ تکلیف دہ بھی تھا اور حسین بھی۔ اس حادثے نے کئی ایسے ذہن کے تاروں کو چھوا تھا کہ پیانو پر ہاتھ پھیرتے ہی جب سر ابھرتے تو اماں اس کی پیشانی

چوم لیا کرتیں۔ اس زمانے میں چکلہ گھر میں ہونے کے باوجود گل بانو کو باغبانی کا شوق پیدا ہوا۔ صحنوں اور باغیچوں میں اس نے خوبصورت بیلوں سے آراستہ محرابیں دیکھی تھیں۔ بیل دار پودوں کو سہارے سے دیوار اور چوکھٹ پر سجا دیا تھا۔ گل بانو میں سلیقے اور ذوق کی کمی نہیں تھی۔ بیلوں پر گلابی قرمزی رنگ کے پھول آ گئے اور کھڑکی کے پاس ان بیلوں کے لگنے سے اس کے چکلہ گھر کا نقشہ بھی بدل گیا تھا۔

'یہ سدا بہار اور تیزی سے پھلنے پھولنے والی بیلیں ہیں۔'

'ہاں۔'

'تم اس گھر کے لیے نہیں ہو....'

'پھر میں کس گھر کے لیے ہوں۔'

'جہاں نمائشی اور مصنوعی پھول نہ ہوں۔'

اماں کا جواب تھا۔

اس رات دروازے پر دستک ہوئی۔ رات میں دروازہ اماں ہی کھولتی تھیں۔ اس نے دوسرے کمرے کے پردے سے چھپ کر دیکھا۔ ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ سر پر کیپ۔ سوٹ اور ٹائی میں تھا، کچھ دیر تک وہ اماں کے حسن میں کھویا رہا۔ پھر مسکرانے کی کوشش کی۔

'اندر آنے کی اجازت ہے۔'

'آیئے سرکار۔ اجازت کی کیا بات ہے۔'

اس نے کیپ اتاری۔ اماں نور جہاں کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

'ایک دن، شاید ایک ہفتہ قبل کی بات ہے۔ اس راستے سے، اپنی گاڑی سے گزر رہا تھا کہ اچانک آپ کو دیکھا۔ جگہ اور راستہ حافظے میں نوٹ کرلیا۔ ایک ہفتہ



تک اس منظر سے نکلنے کی کوشش کی۔ کامیاب نہیں ہوسکا اور آج آپ کے دروازے پر ہوں۔'

'میری خوش قسمتی۔ ان خوشبودار بیلوں کی عمر دراز ہو۔'

یہ پہلا دن تھا جب گل بانو نے اس اجنبی کو دیکھا تھا۔ صبح اجنبی کے جانے کے بعد گل بانو نے اماں کے چہرے پر جو تازگی اور سکون محسوس کیا، وہ پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ اماں کی نظریں جھکی تھیں اور ان کی باتوں سے خوشبو کے پھول جھڑ رہے تھے....

'اور انھوں نے تمہارے بارے میں پوچھا۔'

'پھر تم نے کیا بتایا...'

'میں نے بتایا کہ تمہاری دلچسپی کن چیزوں میں ہے۔'

'پھر کیا کہا انھوں نے؟'

'انھوں نے کہا، صندوق سب کے لیے نہیں ہوتا۔'

'صندوق؟'

'انھوں نے کمرے کے باہر صندوق کو دیکھ لیا تھا۔'

'وہ کیسے لگے تمہیں؟'

'وہ ایک شریف آدمی ہے۔'

گل بانو یہ سوال کرتے ہوئے ڈر گئی کہ شریف آدمی کا چکلہ گھر سے کیا کام۔

اس کی خوشی اس بات میں تھی کہ آج برسوں بعد وہ اماں کو خوش دیکھ رہی تھی۔ اماں کی زندگی میں اس اجنبی کے آنے کے بعد بہت کچھ بدلا تھا۔ اماں اب پہلے سے کہیں زیادہ صفائی پر دھیان دینے لگی تھیں۔ ان کی شخصیت میں ایک خاص طرح کا ٹھہراؤ پیدا ہوا، جو گل بانو نے اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ سلسلہ دراز ہوتا

رہا۔

ایک دن صبح کمرے کا دروازہ کھلا۔ جانے سے قبل اس شخص نے پلٹ کر گل بانو کو دیکھا۔ ہیٹ اتارا۔ اس کے سر پر سیاہ اور گھنے بال تھے۔ ہیٹ کے بغیر اس کی عمر ۴۵ سال سے زیادہ کی نہیں لگ رہی تھی۔ اجنبی کا قد لمبا تھا اور اس کے سیاہ جوتے چمک رہے تھے۔ اس نے سفید شرٹ اور ریڈ ٹائی لگا رکھی تھی۔ وہ ایک ہینڈسم ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اس نے پہلی بار گل بانو کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ مسکرایا۔ پوچھا....

'کیا تم چاہتی ہو کہ...' وہ ٹھہرا۔ گل بانو کا جائزہ لیا۔

گل بانو مسلسل اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

'کیا تم ساری زندگی یہیں رہنا چاہتی ہو؟'

'نہیں'

'گڈ' اجنبی مسکرایا' پھر کیا چاہتی ہو؟'

گل بانو نے اس کا مطلب نہیں سمجھا مگر اس کی آنکھوں کے سامنے سفید رنگ کا ایک بنگلہ تھا۔ یہ بنگلہ اس نے حضرت نظام الدین میں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔

'ایک بڑا سا بنگلہ'

'ویری گڈ۔ وہاں کیا کریں گی آپ؟'

میں کتابیں پڑھوں گی۔ پینٹنگس بناؤں گی۔

'ویری گڈ....اور....' اجنبی کے چہرے پر سنجیدہ مسکراہٹ تھی۔

'اس گھر میں پھولوں والی بیلیں لگاؤں گی' اجنبی مسکرایا.... صرف اتنا کہا' ایسا بہت جلد ہوگا'



گل بانو نے کھڑکی سے اجنبی کو جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کی چال میں بھی ایک شان تھی۔ کچھ فاصلے پر اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ بڑی سی گاڑی تھی۔ پھر اس نے گاڑی کو نگاہوں سے اوجھل ہوتے دیکھا۔ گل بانو کے لیے یقین کرنا مشکل تھا کہ اس دنیا میں خواب دیکھے جاسکتے ہیں یا خوابوں کے پیچھے بھاگا جاسکتا ہے۔ یہاں تو درختوں یا پھولوں کی قطار بھی نہیں تھی، جہاں وہ کم از کم تتلیوں کے پیچھے ہی بھاگتی اور رنگ برنگی تتلیوں کو ہتھیلی میں لے کر خوابوں کے سحر میں گم ہو جاتی۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ اماں کے چہرے کی سنجیدگی گہری ہوتی جارہی ہے۔ کبھی کبھی وہ اماں کو تنہائی کے گوشے میں دیر تک سوچتے ہوئے پاتی۔ اماں کے پاس اب دوسرے مرد نہیں آتے تھے۔ آتے بھی تھے تو اماں منع کر دیتی تھی۔ کچھ ہی مہینوں بعد اجنبی ایک بڑی سی گاڑی میں آیا۔ اماں اور گل بانو کو گاڑی میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ کار وہ خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ آدھے گھنٹے، پینتالیس منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد کار ایک خوبصورت سے بنگلہ پر رکی۔ یہ ساؤتھ ایکس کا علاقہ تھا۔ اجنبی نے اماں سے اترنے کے لیے کہا۔ آگے بڑھ کر اس نے فلیٹ کا دروازہ کھولا اور کنجی اماں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

'یہ چھوٹا سا تحفہ تمہارے لیے'

گل بانو نے پہلی بار اماں کو زار و قطار روتے ہوئے دیکھا تھا۔ بنگلہ میں چار کمرے تھے۔ فرش پر سنگ مرمر لگا تھا۔ دیواریں سفید تھیں اور ان پر قیمتی پینٹنگس آویزاں تھیں۔ ڈرائنگ روم میں قیمتی صوفے کے ساتھ کشمیری شاہی قالین بچھی تھی، جس پر گل بانو کو قدم رکھتے ہوئے بھی ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔ کچن اتنا بڑا تھا کہ گل بانو نے کبھی ایسے ماڈرن کچن کا تصور نہیں کیا تھا۔ تین کمرے تھے آراستہ۔ ایک کمرہ گل بانو کے لیے تھا اس کمرے میں میز اور کرسی بھی تھی۔ حفاظت کے لیے

ایک ڈاگی بھی تھا جو باہر زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر میں نور جہاں اور گل بانو سے مانوس ہو گیا۔ بنگلہ میں داخل ہوتے ہی ایک چھوٹا سا گارڈن تھا۔ جس کی ابھی مزید سجاوٹ کا کام باقی تھا اور گل بانو نے سوچ لیا تھا کہ وہ گارڈن کو اپنی مرضی سے سجائے گی۔

ڈرائنگ روم کافی بڑا تھا۔ اجنبی، اماں کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا۔ گل بانو نے سنا، اماں سسکیاں لیتی ہوئی دریافت کر رہی تھی۔

'کون ہو تم؟؟ کہاں سے، کس لیے آ گئے۔'

اجنبی کے چہرے پر خاموش مسکراہٹ تھی۔

'میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔'

اجنبی آہستہ سے بولا۔ 'جس دن پہلی بار تم کو دیکھا، اس دن ایک بڑی ڈیل فائنل ہو گئی۔ تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتی۔ جس دن تم سے پہلی ملاقات ہوئی اس دن ایک بڑا ٹنڈر پاس ہو گیا۔ تمہارے پاس آنے لگا، تو میری بہت سی ناکامیاں، کامیابی میں بدل گئیں۔ اس لیے...کوئی احسان نہیں کیا۔'

کچھ دیر بعد اجنبی اٹھ کر چلا گیا۔ اماں گھر کو سجانے سنوارنے میں مصروف ہو گئیں۔ چکلہ خانے سے کچھ سامان اس بنگلہ میں شفٹ ہوا، اس میں وہ پرانا صندوق بھی تھا، جس میں گل بانو کی دلچسپی تو تھی مگر اس نئے بنگلے میں وہ اس صندوق کو دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ گل بانو نے اماں کو دیکھا۔ اماں نے وہ صندوق حفاظت سے دوسرے کمرے میں رکھوا دیا جو نسبتاً باقی کمروں سے چھوٹا تھا۔ اماں کے پاس گل بانو کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کہ اس نئے بنگلہ میں اس پرانے صندوق کی کیا ضرورت ہے۔



بنگلہ میں آزادی تھی۔ اب یہاں کوئی نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی صرف اجنبی ہی آتا تھا۔ کبھی کبھی دو ایک روز ٹھہرنے کے بعد وہ چلا جاتا۔ وہ کہاں رہتا ہے، کہاں سے آتا ہے، اماں نے کبھی نہیں پوچھا۔ مہینے کے خرچ کے پیسے وہ اماں کو دے جاتا تھا اور اماں کو اب کسی اور سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ اماں سارا دن اگر اجنبی نہیں ہوتا، تو گھر کو چست درست رکھنے میں مصروف ہوتیں یا پھر اماں کا محبوب مشغلہ تھا، کھانا بنانا۔ وہ طرح طرح کے کھانے بناتیں۔ مرغ کا قورمہ، مٹن کے کباب، نہاری۔ گل بانو چکلہ گھر کی روایتی بدبو کے احساس سے دور نکل آئی تھی۔ اس کو پڑھنے کا شوق تھا۔ پینٹنگس بنانے کا۔ آس پاس کے بنگلے عام طور پر سنسان رہتے تھے۔ یہاں آس پاس کوئی بھی ایک دوسرے سے بات چیت نہیں کرتا تھا۔ یا کسی کو بھی اس بات کی فکر نہیں تھی کہ پڑوس میں کون رہتا ہے۔ سڑک سے گاڑیاں بھی کم گزرتی تھیں۔ اس علاقے کو جوڑنے والے دو آہنی گیٹ تھے، جو تحفظ کے خیال سے، رات کے وقت بند کر دیے جاتے۔ ہر طرح کی آزادی کے باوجود گل بانو کو کبھی کبھی یہاں گھٹن محسوس ہوتی تھی۔

اماں نور جہاں میں ایک اور تبدیلی آئی تھی۔ وہ کبھی کبھی بڑی سی بندی لگا لیتیں اور کبھی کبھی مانگ میں سندور ڈال دیتیں۔ گل بانو نے کبھی پوچھنا ضرور نہیں سمجھا اور کچھ باتوں کو پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ اماں کے چہرے پر صاف لکھا ہوتا تھا کہ اس بابت اماں سے کچھ بھی دریافت نہ کیا جائے۔ پچھلے چکلہ گھر کی یادیں اب بھی محفوظ تھیں۔ سامنے ایک پیپل کا پیڑ۔ کچھ مسلمان طوائفیں، کچھ غیر مسلم۔ صبح سویرے پیپل کے پیڑ کے پاس بملا، کانتی، سودامنی، چترالا اور کامنی کی قطار ہوتی۔ اماں جیسی عورتیں درگاہ پر جایا کرتیں۔ گیارہویں شریف اور محرم کی خاص تیاریاں کرتیں۔ نیاز، فاتحہ ان کی روایت شروع سے قائم تھی۔ رمضان شریف اور ربیع

الاول کے مہینے کا خاص خیال رکھا جاتا۔

نئے گھر میں آ کر اماں نور جہاں الجھ گئی تھیں۔گل بانو کو اس بات کا احساس تھا۔اماں کے الجھنے کی وجہ صاف تھی۔اجنبی نے اپنا نام تو نہیں بتایا تھا مگر وہ ہندو مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔اماں کی زندگی میں پہلی بار بہار نے دستک دی تھی اس لیے اماں اجنبی کے مذہب کا پورا خیال رکھتی تھیں۔کبھی کبھی ایسا لگتا کہ اماں کی ہتھیلیوں پر ریت ہے اور اماں کی ہتھیلیاں جب اس کی پیشانی تک آتی ہیں تو اس کا چہرہ ریت سے بھر جاتا ہے۔کبھی کبھی اماں کی آنکھوں میں عجیب سی ویرانی تیرتی ہوئی نظر آتی۔سرد چہرہ۔کوئی جذبات نہیں۔پتھر جیسی ساکت آنکھیں۔زرد ہونٹ... وہ ایک مجسمہ کی طرح نظر آتیں۔گل بانو سوچتی تھی کہ اماں کو تو اب خوش ہونا چاہیے۔مگر اماں خوش ہونے کے باوجود بھی بہت سے زخموں کے ساتھ زندگی گزار رہی تھیں۔گل بانو کے کسی بھی سوال کا اماں کے پاس جواب نہیں تھا۔

’یہ صندوق...‘

’میرا اصل سرمایہ یہی ہے۔‘

’پھر اس کو بند کیوں رکھا ہے۔‘

’جب وقت آئے گا،صندوق کھل جائے گا۔‘

’وقت کب آئے گا۔؟‘

’کبھی بھی۔‘

اماں کبھی کبھی پرانے دنوں کی سرنگ میں داخل ہو جایا کرتی تھی۔گل بانو جانتی تھی کہ یادوں کی سرنگ سے باہر آنے میں وقت لگتا ہے۔گل بانو جانتی تھی کہ اس سرنگ میں خطرناک قسم کی چٹانیں ہیں... جنگل ہے... اماں کبھی کبھی راستہ بھول جاتی ہیں اور سرنگ سے واپس آنے کے بعد اماں کو اجنبی کا انتظار رہتا ہے۔



اس بار اجنبی کافی دنوں بعد آیا۔گل بانو کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔گل بانو چھپ کر کچھ دیر اماں اور اجنبی کی باتیں سنتی رہی۔گو ایسا کرنا اسے پسند نہیں تھا،مگر اس وقت اس کی مجبوری تھی۔اماں نے بندیا لگا رکھی تھی اور مانگ میں سندور بھی تھا۔

یہ سب کیا ہے... ایک ٹھنڈی آواز ابھری۔

’کچھ نہیں۔‘

’زندگی میں نمائش ضروری نہیں۔‘

’تمہیں پسند نہیں؟‘

’بالکل بھی نہیں۔‘

’کیوں۔؟‘

’مسلمان عورتیں سندور نہیں لگاتیں...،آواز میں ٹھنڈ اب بھی موجود تھی۔’مگر میں تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔‘

اماں نے اس کے بعد بھی سندور اور بندی لگانا نہیں چھوڑا۔اماں کی زندگی اب ڈھلان پر تھی۔گل بانو کو احساس تھا،بہت کچھ تبدیل ہو رہا ہے۔اور شاید وہ بھی۔

●●

سردیوں میں اجنبی کا آنا کم ہو گیا۔جیسے جیسے گل بانو بڑی ہو رہی تھی۔صندوق کی شکل اسے بری لگنے لگی تھی۔وہ پڑھائی میں تیز ثابت نہیں ہوئی اس لیے پڑھنا موقوف ہو گیا۔اماں کہتی بھی تھیں،ہم خاندانی ہیں اور ہماری وراثت میں تعلیم کا حصہ کبھی نہیں رہا۔جو زیور ہماری اصلیت ہیں،وہی رہیں گے۔اسے پینٹنگس اور تصویریں بنانے کا شوق تھا۔مگر اس میدان میں بھی اس کی رہنمائی نہیں ہو سکی۔اماں

جب صندوق کی طرف دیکھتیں تو گل بانو کو ایسا لگتا کہ جیسے اماں اس کو صندوق میں بند کرنے جارہی ہوں۔ کبھی کبھی صندوق اسے کسی قدیم مقبرے کی طرح لگتا اور گل بانو نے صندوق کا نام ہی یادوں کا مقبرہ رکھ دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد ہی گل بانو کی بے چینی بڑھ گئی۔ مثال کے لیے اب وہ خود سے سوال کرتی تھی۔ وہ کون ہے؟ اس کا وجود کیا ہے؟ اس کا خاندان کیا ہے؟ اس کے اندر کس کی روح ہے؟ وہ اکثر پیانو کی آواز سنتی ہے اور چکلہ گھر میں لوٹ جاتی ہے۔ چکلہ گھر کی کھڑکیوں سے جھانکتے چہروں میں اس کا چہرہ کون سا ہے۔؟ کیا کبھی اس کے وجود سے پریشانی ہوتی ہے۔؟ ۵ فٹ ۲/ انچ، دو آنکھیں، ایک ناک، جسم میں پیدا ہونے والی تبدیلیاں۔ آئینہ میں چمکتی ہوئی برف، وہ جسم ہے یا روح؟ یہ کون ہے، جو اسے بار بار یاد دلاتی ہے کہ ایک دن اسے صندوق میں بند ہوجانا ہے۔ اس بدشکل اور بوسیدہ صندوق میں جس کی لکڑیاں تک سیاہ ہوچکی ہیں۔ ایک پگڈنڈی ہے، جس پر چلتے چلتے وہ آنکھیں بند کرلیتی ہے، آس پاس کی مہک اسے چکلہ گھر پہنچا دیتی ہے۔ وہاں اس کی سہیلیاں بھی تھیں، نئی پگڈنڈی پر ایک زندگی سے ٹوٹ جانے والا تعلق ہے۔ اور وہ اجنبی کون ہے؟ اس سے کیا رشتہ ہے اس کا۔؟

پھر اچانک اجنبی نے آنا بند کردیا۔ گل بانو کی عمر سترہ سال کی ہوگئی تھی۔ اماں کچھ عرصہ تک پاگلوں کی طرح انتظار کرتی رہیں۔ پھر انتظار میں صدیوں کی برف جمتی چلی گئی۔ اس نے دیکھا تھا، اماں اکثر تنہائی میں بڑبڑایا کرتی تھیں۔

وہ نہیں آئے گا...

شاید اسے کچھ ہوگیا ہے...

پتہ نہیں، وہ زندہ بھی ہے یا نہیں...

اجنبی جب چھ مہینے تک نہیں آیا تو اماں کو احساس ہوا کہ زندگی کو چلانے والی



مشین رُک گئی ہے۔ قدموں کے نیچے کی زمین غائب ہے اور سورج سوا نیزے پر آ گیا ہے۔ لیکن اماں کو اس کے باوجود یقین تھا کہ ایک دن اچانک بیل بجے گی اور اجنبی اس کے سامنے ہوگا۔ مگر ایسا نہیں ہوا...اجنبی کے مرنے کی خبر ملی اور یہ خبر اماں کو اداس کرگئی...اور جب سنگ مرمر کے فرش پر چلنے والے پاؤں میں کانٹے چبھنے لگے تو ایک دن اماں نے گل بانو کو اپنے پاس بلایا اور صندوق کی طرف اشارہ کیا۔

’تو جاننا چاہتی تھی نا، کہ اس میں کیا ہے؟‘

’ہاں۔‘

’چل جلدی سے تیار ہو۔‘

’مگر کیوں، کہاں جانا ہے؟‘

’درگاہ پر...‘

’درگاہ پر؟‘

’ولیوں کے ولی کی درگاہ۔ تیار ہوجا....‘

اماں آستانے پر پہلے بھی جا چکی تھیں۔ بلکہ جاتی رہتی تھیں۔ اماں سے ہی گل بانو نے سنا کہ دلی بائیس خواجاؤں کی بستی ہے۔ مٹکا پیر، قطب مینار کے پاس بابا قطب شاہ، حضرت نظام الدین، اجمیر شریف، کلیر والے صابر، اماں منّتیں اتارنے یا دعا کرنے اکثر جایا کرتی تھیں۔ لیکن گل بانو کو لگ رہا تھا کہ اس بار اماں کا ارادہ کچھ اور ہے۔ پہلے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو اس نے یونہی ایک بدمزہ سا گانا گنگنانا شروع کیا۔

سجنوا تیرے دیش میں

گئی بلبل پردیس میں....

گل بانو باضابطہ ٹھمکا لگانا چاہتی تھی۔ پہلی بار اسے علم ہوا کہ اس کے اندر ایک دریا بہہ رہا ہے۔ دریا میں طغیانی ہے اور اس لیے اس کا دل رقص کرنے کو کر رہا ہے۔ اس نے بند دروازے کی طرف دیکھا اور ایسے کھڑکی ہوگئی جیسے پاؤں میں گھنگرو بندھے ہوں۔ پھر اس نے تھرکنا شروع کیا...

سجنوا تیرے دیش میں
گئی بلبل پردیس میں

وہ دیر تک تھرکتی رہی۔ اس وقت تک جب تک اس کو احساس نہیں ہوگیا کہ اس پر پاگل پن کا دورہ پڑا ہے۔ دروازہ کھول کر وہ باہر آئی۔ اس کی خواہش تھی کہ اس وقت بہت سے بندر آجاتے اور وہ بندروں سے باتیں کرتی۔ جی کھول کر ہنستی۔ گل بانو جانتی تھی وہ ایسی نہیں ہے۔ لیکن پہلی بار اس پر ایسے ایسے حملے ہو رہے تھے کہ ان حملوں کو وہ کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھی۔ وہ جھولے پر جھولنا چاہتی تھی۔ وہ بطخوں کے ساتھ تیرنا چاہتی تھی۔ وہ کچے آم توڑنا چاہتی تھی اور ریل گاڑی میں اکیلے سفر کرنا چاہتی تھی۔ وہ ایسا بہت کچھ چاہتی تھی اور اسے احساس تھا کہ اب بہت جلد اس کی شروعات ہونے والی ہے۔ باہر سڑک خالی پڑی تھی۔ آس پاس بنگلوں کے دروازے بند تھے۔ سناٹا طاری تھا۔ گل بانو نے محسوس کیا، وہ ایک حسین مرغابی میں تبدیل ہوگئی ہے اور کچھ لڑکے ہیں جو مرغابی پر پتھر پھینکنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اس نے ناچنا پھر شروع کیا...

سجنوا تیرے دیش میں
عجب عجب سے بھیس میں
پتھر مارے کیس میں
سجنوا تیرے دیش میں



کچھ دور پر اسے ایک ہرن بھاگتا ہوا نظر آیا۔ یہ اس کی نظروں کا دھوکہ نہیں تھا۔ تھرکتے قدم ٹھہر گئے... گل بانو نے محسوس کیا، وہ ایک ہرنی کی طرح قلانچیں بھر رہی ہے۔ اس نے دروازے کی طرف پلٹ کر دیکھا، وہاں اماں کھڑی تھیں اور تیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں...

'یہ سب کیا ہے؟'

'مرغابیاں...'

'کیا.....؟'

'ہرن...' گل بانو نے ٹھہا کا لگایا۔

'تم ابھی تک تیار نہیں ہوئی۔؟'

'جانا کہاں ہے؟'

'تمہیں بتا تو چکی ہوں۔'

'اجنبی کو واپس لاؤ گی؟'

'اجنبی اب نہیں آئے گا۔' اماں کے چہرے پر سختی تھی۔

'پھر...'

'تم تیار ہو جاؤ۔'

وہ اماں کے پیچھے مڑی۔ اس نے دیکھا، اماں چلتی ہوئی صندوق کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ اسے یقین تھا، ابھی صندوق کے دروازے کھلیں گے اور اس میں سے ایک ہاتھی نکلے گا اور پھر ہاتھی دیوار پر جھولنا شروع کر دے گا، مگر ایسا ہوا نہیں۔ اماں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

'جلدی سے تیار ہو جاؤ۔'

اس دن اماں نے اس کو تیار کیا۔ گلابی شاہانہ کپڑے پہنائے۔ یہ لباس اماں

نے دو دن قبل ہی درزی کے حوالے کیا تھا۔ جب گل بانو تیار ہوگئی تو سب سے پہلے اماں نے نظر اتاری، پھر اس کا ہاتھ تھام کر باہر آ گئی۔ ایک آٹو لیا اور حضرت نظام الدین کے باہر گل بانو کو لے کر آٹو سے اتر گئی۔ سڑک پر گاڑیوں کا ہجوم تھا۔ ایک طرف قطار سے فقیر بیٹھے تھے۔ ان کے درمیان چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔ آستانے پر جانے والوں کی بھیڑ تھی۔ کچھ آگے چلنے کے بعد پھول والوں کی دکانیں تھیں۔ اور ان دکانوں کے سامنے ایک قطار سے گوشت کی دکانیں بھی سجی ہوئی تھیں۔ گل بانو کو اس طرف آتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی، جہاں ہر کوئی خوف اتارنے آتا ہے، اس دہلیز پر قدم رکھنے سے وہ گھبراتی کیوں ہے۔ اماں چھوٹی چھوٹی گلیاں پار کرتی ہوئی آستانہ میں داخل ہوگئیں۔ قوالی کی آواز گونج رہی تھی۔ آج ضرورت سے زیادہ بھیڑ تھی۔ اماں نے اس کا ہاتھ تھاما۔ اماں کے دونوں ہاتھ پھول کی تھالی سے بھرے ہوئے تھے۔ اماں نے ایک تھالی اس کے ہاتھوں میں دی اور پھر جالی کے ایک طرف اس کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پہلے امیر خسرو پھر حضرت نظام الدین اولیا۔ گل بانو کی نظر میں آج اماں عام دنوں کے مقابلے بدلی ہوئی تھیں۔ جیسے کوئی اہم فیصلہ کر کے آئی ہوں۔ اماں کافی دیر تک سجدے میں رہیں۔ ایک لمحہ تو ایسا بھی تھا، جب گل بانو کو احساس ہوا کہ اماں ضرور بے ہوش ہوگئی ہیں۔ کافی دیر بعد اماں نے سر اٹھایا۔ اب ان کے چہرے پر سکون اور طمانیت کا احساس تھا۔ لیکن گل بانو کے چہرے سے سکون رخصت ہو چکا تھا۔ وہ جان چکی تھی کہ اماں کے اس فیصلے میں وہ کس حد تک شامل ہے۔ فاتحہ نیاز کرنے کے بعد اماں اسے لے کر ایک حجرے تک آئیں۔ گل بانو نے دیکھا، ایک مولانا کو گھیر کر کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا نے اشارے سے ان لوگوں کو جانے کے لیے کہا۔ پھر اماں کی طرف دیکھا۔ یقینی طور پر وہ اماں کو پہلے سے جانتے تھے۔ انھوں نے آنکھیں بند کر کے



کچھ پڑھنا شروع کیا۔ پھر ایک پلیٹ بڑھائی۔ اس میں کچھ میٹھے ٹکرے رکھے ہوئے تھے۔ ایک ٹکرا گل بانو نے کھایا۔ مولانا نے ایک سرخ دھاگہ نکالا۔ دھاگہ کو دم کیا...اور اس کے دائیں ہاتھ پر دھاگے کو باندھ دیا۔ اماں خوش تھیں۔ نذرانہ بڑھایا اور گل بانو کو لے کر آستانہ سے باہر آ گئیں۔

پھول والوں اور گوشت والوں کی دکانوں کے قریب اچانک گل بانو نے اماں سے ہاتھ چھڑا لیا اور مسکرانے لگی۔

’اب کیا ہوا؟‘ اماں کے چہرے پر بے چینی کے آثار تھے۔

’میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں زور زور سے ناچوں۔‘

’باؤلی ہوگئی ہو۔‘

’ہاں،‘ گل بانو نے آنکھیں نچائیں۔

’لوگ کیا کہیں گے؟‘

’مجھے نہیں معلوم۔ مگر میں تو ناچوں گی۔‘

’پاگل ہوگئی ہے۔‘

’ہاں۔‘

’چلو یہاں سے۔‘

’نہیں۔ میں ناچوں گی۔‘

گل بانو بے قابو ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے پاؤں تھرک رہے تھے۔ کچھ نوجوان لڑکے تالیاں بجانے لگے۔ کچھ دکانداروں نے اس طرح دیکھا، جیسے اس طرح کے تماشے کوئی نئے نہیں ہوں۔ گل بانو رقص میں گم تھی۔

ہوا میں اڑتا جائے...

مورا لال دوپٹہ مل مل کا...

ہوا میں اڑتا جائے۔

اچانک اماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو گل بانو کو محسوس ہوا وہ ایک طلسم خانے سے نکل کر ایک ایسی دنیا میں آ گئی ہے، جہاں دور تک گوشت کی بدبو پھیلی ہے اور اس بدبو میں پھول والوں کے پھولوں کی خوشبو گھٹ کر رہ گئی ہے۔ اب وہ ایک کٹھ پتلی کی طرح اماں کے ساتھ ساتھ انگلیاں تھامے چل رہی تھی۔ شام ہو گئی تھی۔ کسی میوزک شاپ سے قوالی کی آواز یہاں تک گونج رہی تھی۔ 'بھر دے جھولی مری یا محمدؐ'۔ نظام الدین کی تنگ گلیوں سے باہر نکل کر اماں سڑک کے کنارے آ گئیں۔ ایک آٹو والے کو رُکنے کا اشارہ کیا... وہ سہمی ہوئی بھیڑ کی طرح اماں کے ساتھ آٹو میں سوار ہو گئی....

سترہ برس... گل بانو کی انگلیوں میں سترہ برس سما گئے تھے... ان سترہ برسوں میں اس کی دنیا وہیں آباد تھی، اس پرانے چکلہ گھر میں، جہاں کی یادیں اب بھی اس کے حافظہ میں محفوظ تھیں۔ سترہ برس... عمر کی سترہ سیڑھیاں... ان سیڑھیوں پر خاموشی تھی مگر اب کسی طوفان کی گرج سنائی دے رہی تھی۔

گھر آنے کے بعد اماں نے پہلا کام یہ کیا کہ صندوق کھولا۔ یہ صندوق کبھی نہیں کھلا تھا۔ یہ صندوق گل بانو کے لیے کسی جادو سے کم نہ تھا۔ وہ ہمیشہ اس صندوق کے بارے میں سوچتی تھی۔ مگر اب اس صندوق سے ڈر لگ رہا تھا۔ اماں مسکراتی ہوئی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

'تو جاننا چاہتی تھی نا کہ اس صندوق میں کیا ہے؟'

'ہاں۔'

'بتاتی ہوں۔'

قفل کھولنے کے بعد اماں کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ مگر ان کے ہونٹ تھرتھرا



رہے تھے...' اور تم گواہ ہو اس لمحے کی۔ جب خدا ہمارے توقعات کو روشنی دیتا ہے، اس روشنی سے ایک جسم برآمد ہوتا ہے... اور اس جسم میں خدا ایسے کسی صندوق کو حفاظت سے رکھ دیتا ہے اور یہ کوئی عام صندوق نہیں... اور تم گواہ ہو کہ ہوا اچانک خاموش ہو گئی۔ رزق روپوش ہو گیا اور چاندنی کھو گئی... اور ان حالات میں صندوق کو کھولنا، کہ اب اس کی حفاظت تمہارے ذمے ہے...'

اماں نے آنکھیں کھولیں۔ گل بانو کی طرف دیکھا...

'ہمارے پاس یہی صندوق ہے؟ جس کی وارث اب تم ہو...'

## (3)

ایک محفوظ جزیرے پر سورج طلوع ہورہا تھا۔ سمندر کے درمیان سورج کی شعائیں رقص کررہی تھیں۔ ایک چھوٹا سا بچہ گندے لباس میں تانبے کا سکہ اچھالتا ہوا کھیل رہا تھا۔ ایک لڑکی تھی جو روزن سے جھانک رہی تھی۔ ایک بوڑھا تھا، جو سڑک سے ان کھڑکیوں کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں عورتیں سج دھج کر کھڑی تھیں۔ ایک رات تھی، جس کے ختم ہونے کے آثار نہیں تھے۔ گل بانو نے کروٹ بدلی تو فوجی دستے کو آگے بڑھتا ہوا پایا۔ سرسبز پہاڑوں پر صنوبر کے درخت اُگے ہوئے تھے۔ اوران کے قریب سے بادلوں کے جھنڈ گزر رہے تھے۔ چاروں طرف پہاڑیوں پر کہاسہ چھایا تھا۔ بھورے پہاڑوں پر وہ برہنہ پاؤں چل رہی تھی... اماں نے صندوق کھولا اور گل بانو اس صندوق میں سما گئی۔ پھر اسے ہوش نہیں رہا۔ وہ کہاں ہے؟ سرسبز پہاڑوں پر، صنوبر کے درختوں کے درمیان یا بادلوں کے ہجوم میں؟ وہ اسی چکلہ گھر میں کھڑکی پر کھڑی ہے یا سمندر کی موجوں کے ساتھ کسی محفوظ جزیرے میں آ گئی ہے۔ گل بانو نے آنکھیں بند کیں تو احساس ہوا، کوئی اس کی عمر کو سبز ربن سے باندھنے کی کوشش کررہا ہے۔ پیچھے ایک سیلاب ہے اور آگے گھنا کہرا... سبز ربن کھل گیا اور وہ ہلکی ہلکی سسکیوں کے درمیان ہے اور فوجی دستے سڑک



سے گزر رہے ہیں۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ مختلف آزمائشوں سے گزرتے ہوئے، اس کے قدم کس موڑ پر ٹھہریں گے۔...اوراماں کے صندوق کی پٹاری سے جو جن نکلے گا وہ اسے کسی پرستان میں لے جائے گا یا کسی انجان جزیرے میں——

گل بانو اچانک زور سے بولی۔

'لیچی کے دام بڑھ گئے ہیں۔'

'لیچی.....' اماں نے چونک کر دیکھا۔

'لیچی میں رس ہوتا ہے نا.....'

'باؤلی ہوگئی ہے۔'

'بس، اب تم یہ صندوق بند کرو۔ آج نہیں۔ لیچی کے دام بڑھ گئے ہیں۔'

گل بانو اچھل کر صندوق کے پاس سے ہٹ گئی۔ آج وہ آسمان میں آزاد فضا میں اڑتی چڑیوں کو دیکھنا چاہتی تھی۔ دروازہ کھول کر وہ باہر آئی۔ آسمان چڑیوں سے خالی تھا۔ اس وقت اس کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ لیچی مہنگی ہوگئی اور اب اسے مینڈھک بننا ہوگا۔ گل بانو مینڈھک بن گئی۔ مگر کمر میں درد کا احساس ہونے لگا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب اس کے کانوں میں موسیقی کی آواز تیر رہی تھی۔ ابو بھائی سازندے کا چہرہ ناچ رہا تھا۔ وہ خاموش چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔

کبھی کبھی اماں اسے پرانے زمانے کے بارے میں بتایا کرتی تھیں۔ اس نے اماں کے منہ سے کئی اصطلاحیں سنی تھیں۔ تماش بینی، ڈیرے دار، زنان خانگی، خانگیاں، کوٹھے والیاں، طوائف، رنڈی... اماں کہتی تھیں، ان سب کا تعلق اشرافیہ گھرانوں سے ہے۔ غدر کی تباہی نے کتنوں کو محتاج کردیا۔ شرفا عورتیں در در کی ٹھوکریں کھانے کو مجبور تھیں۔ مستورات گھر کی چوکھٹ سے نکل کر نقاب الٹ دیا کرتی تھیں۔ شریف مردوں

پر بھی بھوک نے اپنا دائرہ تنگ کیا تھا۔سورج غروب ہونے کے بعد مرد خاموشی سے خانگیوں کے دروازے پر دستک دیتے تھے۔آہستہ سے دروازہ کھولا جاتا۔مرد کے ساتھ ایک تماش بین ہوتا۔وہ دس پندرہ منٹ کے لیے اندر جاتا۔اس سے زیادہ دیر تک اندر رہنے کا حکم نہیں تھا۔اس زمانے کی بات ہی اور تھی۔اماں بتایا کرتی تھیں کہ غدر نے سب سے زیادہ عورتوں کو متاثر کیا۔جنگیں سب سے زیادہ عورتوں کو متاثر کرتی ہیں کیونکہ عورتوں کے پاس جو ہوتا ہے، وہ مردوں کے پاس نہیں ہوتا اور عورتیں دنیا کی کسی بھی دولت سے زیادہ قیمتی ہوتی ہیں۔

اماں کی باتیں گل بانو کے جسم کے اندر اتر کر، اس وقت ایک دبی ہوئی چیخ میں تبدیل ہوگئی تھیں۔تماش بین کے جانے کے بعد دروازہ اندر سے بند کرلیا جاتا۔ایسے گھروں تک عام لوگوں کی رسائی نہیں تھی۔صرف شرفا آتے تھے۔ملک میں انگریز تھے۔ان انگریزوں کو بھی خانگیاں پسند تھیں۔یہ انگریز رقص وموسیقی کو پسند کرتے تھے۔نشست گاہوں کا پورا خیال رکھا جاتا۔شفاف فرش بچھا ہوتا۔سلیقے سے گاؤ تکیے لگے رہتے۔ایک طرف صاف ستھرا پاندان رکھا ہوتا۔چھتوں پر قمقموں کی آرائش رہتی۔نشست گاہوں میں شائستہ ماحول ہوتا۔شعر وشاعری کا دور بھی چلتا۔آداب وتہذیب کا پورا لحاظ رکھا جاتا۔اماں نے کہا تھا۔ پست طبقے کی رنڈیوں، کسبیوں، ٹکابیوں نے شائستگی کی رسم اٹھادی۔پہلے امراء عمائدین ہوا کرتے تھے۔اب ان کی جگہ بازارو مردوں نے لے لی۔جنسی ناآسودگی کے خواہشمند نے کوٹھے کو بازار پھر چکلہ خانہ بنا دیا۔حیدرآباد، پھر لکھنؤ پھر دلی کا سفر اماں کے لیے کچھ بہت بہتر نہ تھا۔لیکن وقت بدل چکا تھا۔کہاں اکبری دروازے کا ماحول اور کہاں دلی کا چکلہ بازار۔ستم کی آنکھ سے دیکھا تو سب نظارے تھے۔

اماں کو بغیر بتائے وہ تیار ہوئی۔گھر سے باہر نکلی اور بس میں سوار ہوگئی۔آج وہ



دلی گھومنا چاہتی تھی۔آج وہ آزاد رہنا چاہتی تھی۔کناٹ سرکل آگیا تو بس سے اتر گئی۔دیر تک کناٹ سرکل میں گھومتی رہی۔پالیکا بازار میں اس نے کچھ چھوٹی موٹی شاپنگ کی۔باہر آکر دوڑتی گاڑیوں کو دیکھتی رہی۔پھر سامنے والے پارک میں چلی گئی جہاں کبوتروں کا جھنڈ موجود تھا۔آزاد کبوتر۔وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔اسے احساس تھا، اب ایسے مناظر سے وہ بہت جلد دور ہونے والی ہے۔وہ ان مناظر کو آج جی بھر کر، آنکھوں میں بھر لینا چاہتی تھی۔اسے احساس تھا کہ وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے۔شام کی پرچھائیوں نے سایہ کیا تو وہ دوبارہ بس میں بیٹھ گئی۔اس وقت تک وہ سب کچھ بھول چکی تھی۔یہ بھی کہ وہ کون ہے اور کس بات سے خوفزدہ ہے۔یا کس بات سے خوش ہے؟ یا اس کے اندر کیا کشمکش چل رہی ہے۔جیسے چاروں طرف دھواں ہے اور گل بانو اس دھویں میں تیر رہی ہے۔

رات کے آٹھ بجے نظیرا آیا۔عمر یہی کوئی پچاس برس۔پرانے چکلہ گھر کا دلاّ تھا، مگر نظیرا کو کتابیں اور اخبار پڑھنے کا شوق تھا۔چکلہ گھر میں بھی اماں کے پاس وقت گزاری کے لیے آیا کرتا تھا اور دنیا بھر کی خبریں سنا کر جاتا۔اماں نے نظیرا کو بلایا تھا۔گل بانو کے سر پر نظیرا نے شفقت سے ہاتھ پھیرا۔گل بانو نے غور سے دیکھا۔نظیرا وہ پہلے والا نظیرا نہیں تھا۔رنگ ڈھنگ بدلا ہوا۔گلے میں رومال بھی نہیں، جیسا کہ وہ ہمیشہ باندھا کرتا تھا۔وہ سوٹ بوٹ میں تھا اور خاصہ شریف نظر آرہا تھا۔اماں نے اس کے لیے چائے تیار کی۔پھر نظیرا کے پاس آکر بیٹھ گئی۔گل بانو نے نظیرا کو غور سے دیکھا تو اس کے سانولے چہرے پر اسے بہت سے دانے نظر آئے۔یہ دانے اسے چھوٹے چھوٹے شیشے کی مانند نظر آرہے تھے اور ایسے ہر دانے میں پرانی یادوں کا ایک چہرہ روشن تھا۔دانوں کی وجہ سے اس کا چہرہ بدہیئت اور بدنما

نظر آرہا تھا اور چہرے کی اس بدنمائی کو وہ سوٹ بوٹ کے ذریعہ چھپانے کی کوشش کررہا تھا۔ یہ وہ پرانا والا نظیرا نہیں تھا، جس کے دانت ہر وقت پان کی پیک سے سرخ رہتے تھے اور جس کے چہرے پر عجب سی دو پلی ٹوپی ہوا کرتی تھی اور جو چہرے سے اس علاقے کا دلاّ لگتا تھا۔ نظیرا نے نظر اٹھا کر کئی بار گل بانو کی طرف دیکھا۔ گل بانو کو پرانے دن یاد آگئے جب نظیرا اسے اخبار کی باتیں بتایا کرتا تھا۔ خبریں سناتا تھا اور آس پاس کے ایسے ایسے قصے سناتا تھا کہ گل بانو کا ہنستے ہنستے برا حال ہو جاتا۔ ایک تو اس کا حلیہ، دوسرا اس کے قصے سنانے کا انداز۔ تیسرا اس کا عاشقانہ مزاج، اس کی چھیڑ چھاڑ کا طوائفیں برا نہیں مانتی تھیں بلکہ لطف اندوز ہوا کرتی تھیں۔

کافی دیر تک سناٹا چھایا رہا۔ اماں بھی پرانی یادوں کے سفر پر نکل گئی تھیں اور نظیرا بھی۔ کافی دیر بعد سناٹا ٹوٹا تو سناٹے سے مردہ چہرے برآمد ہو رہے تھے۔

’عائشہ کیسی؟‘

’کینسر سے مرگئی۔‘

’وہ حمیرا؟‘

’ سے تو مرے ہوئے تین برس ہو گئے۔‘

اماں کا چہرہ فق۔ ’اور وہ تیری زلیخا.....؟‘

’پچھلے برس وہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئی۔‘

’سارے چکلے والے مر گئے۔؟‘

’ نہیں خالہ، ایسا کیوں بولتی ہو۔‘ نظیرا ہنسا۔ اب ان بستیوں میں کون ہمیشہ کے لیے رہنے آیا ہے اور کون رہنا چاہتا ہے۔ جو گیا، اپنے گناہ کاٹ گیا۔ ہاں تبدیلی ضرور آئی ہے۔ پہلے سڑک کنارے دو چار بدنام کوٹھے ہوا کرتے تھے اب



اچھے علاقوں میں آ گئے۔‘

’اور تو سوداگر بن گیا ہے۔ ہے نا؟‘

’ہے ہے.....‘ نظیرا ہنسا....’تم بھی نا خالہ....‘

’میں بھی کیا۔ اب چھوٹے چوزے چھوڑ کر مہنگے علاقوں کی بلیوں پر نظر ہے۔ کیوں؟‘

’بلّوں پر بھی۔‘ نظیرا نے پھر قہقہہ لگایا۔ ’زمانہ بدل گیا خالہ۔ بلّیاں، بلّے سب بازار میں بکتے ہیں۔‘

’تو موٹی کمائی ہو رہی ہے تیری۔ بدن پر چربی بھی چڑھ گئی۔‘

’تم بھی نا خالہ....اور تم نے کوئی کم تیر مارا۔ اب یہی جگہ دیکھ لو۔ کیا کوئی سوچ سکتا ہے کہ نور جہاں بی بی کے پر لگیں گے تو جنت کے دروازے کھل جائیں گے۔ تم نے بھی ایسا ہاتھ مارا خالہ کہ پرانے گھر کو بھول گئی۔‘

’پرانا گھر کوئی نہیں بھولتا۔‘

’مگر اللہ قسم۔ تم بھول گئی۔ پرانے یاروں کو بھول گئی۔ وہاں سب تمہیں یاد کرتے ہیں۔ مگر تمہیں کسی کی یاد نہیں آئی اور یاد بھی کیوں آئے گی خالہ۔ کہاں بدبو دار مٹی کو چھوڑ کر اس علاقے میں آ بسی، جہاں کا تصور بھی محال ہے خالہ....اور اب تو تم کروڑ پتی ہو.....‘

’ارے خاک کروڑ پتی۔‘

’سونے کی مرغی ہے تمہارے پاس۔ لاٹری نکلے گی تو ہر دن سونے کا ایک انڈا۔‘

نظیرا نے قہقہہ لگایا مگر گل بانو کو اس وقت اس کی ہنسی بالکل پسند نہیں آئی۔ اسے احساس تھا کہ نظیرا اس کے جسم کا ناپ لے رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک

فیتہ ہے اور یہ فیتہ سر سے ہوتا ہوا اس کے پنجے تک پہنچ چکا ہے۔ اس کے اندر ایک عجیب سی آگ تیر رہی تھی۔ اس نے دیکھا، نظیرا اپنا سر کھجلا رہا تھا۔ کچھ دیر سوچتے ہوئے بولا۔

’آج کل مندی ہے خالہ۔ تم تو بازار کا بھاؤ پڑھتی ہوگی۔ نوٹ بندی، جی ایس ٹی۔ عام آدمی تو مر ہی گیا سمجھو۔ چھوٹے چھوٹے روزگار تباہ ہوگئے۔ پیسے ہی نہیں۔ اس لیے چکلہ گھروں کی کمائی بھی بند ہے۔ مگر..... بڑے دروازے کھلے ہیں خالہ۔ اب تو بڑے دروازے ہیں۔ شریف لوگ۔ بڑے بڑے محلوں والے۔ ان کے پاس پیسوں کی کمی نہیں۔ بس بیچارہ غریب مرگیا۔ دو وقت کا اناج خریدے یا چکلہ گھر جائے۔ بڑی مشکل سے کوئی تماش بین ہاتھ آتا ہے۔

’تیرا تماش بین‘ اماں نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ’تو نہیں بدلا نظیرا۔ بس تیرا ٹھاٹھ باٹ بدل گیا ہے۔‘

’بدلنا پڑتا ہے خالہ۔ وقت کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ جیسا دیس ویسا بھیس۔ اور تم تو جانتی ہی ہوگی کہ اب ہم کیا سے کیا ہوگئے ہیں۔‘

’کیا سے کیا ہوگئے ہیں؟‘ اماں ایک دم سے چونک گئیں۔

گل بانو بھی چونکی۔ کھڑکی کے پاس ایک چھپکلی دیوار پر رینگنے کی کوشش میں زمین پر گرگئی۔ کھڑکی کے باہر دھواں سا پھیلا تھا یا گل بانو کو لگ رہا تھا کہ باہر دھواں پھیلا ہے۔ بلکہ گل بانو نے یہ بھی محسوس کیا کہ کوئی تیز آندھی، تیزی سے اس کی سمت بڑھ رہی ہے۔

’تم کچھ نہیں جانتی خالہ؟‘

’نہیں رے نظیرا...‘

’یعنی اخبار نہیں پڑھتی۔ ٹی وی نہیں سنتی۔؟‘



’نہیں رے۔‘

’کس دنیا میں رہتی ہو خالہ۔ بندر سارے آم کھا گئے اور مالک پوچھے آم کا درخت کہاں؟‘

’یہ کون سا محاورہ ہے۔‘

’ہے ہے...‘ نظیرا ہنسا۔ محاورے گڑھ لیتا ہوں۔ مگر تم ہماری دنیا سے کتنے انجان ہو خالہ۔ اتنی انجان مت رہا کرو۔‘

’اب سیدھے سیدھے کچھ بتائے گا یا ڈرامہ کرتا رہے گا۔‘

’ڈرامہ نہیں خالہ۔ اب کہاں سے بتاؤں۔ تم تو اخبار نہیں پڑھتی۔ ملک کا حال بھی نہیں جانتی۔ خبر رکھا کرو اماں۔‘

’اچھا، چل۔ اب رکھوں گی۔‘

’مغل چلے گئے۔ انگریز بھی چلے گئے۔ دو قومی نظریہ میں پاکستان چلا گیا۔‘

’اب یہ دو قومی نظریہ کہاں سے آگیا۔‘

’اسی پر تو بٹوارہ ہوا ملک کا۔ پاکستان بن گیا اسلامی ملک.... اور اب بم پھٹ گیا خالہ۔ پاکستان اسلامی دیس تو ہندوستان ہندو دیس۔‘

’تو پاگل ہوگیا ہے۔‘

’شہری بل آیا ہے خالہ۔ جیسے ہندو پاکستان میں، ویسے مسلمان ہندوستان میں۔ اب مسلمانوں کے اترانے اور شان سے چلنے کا زمانہ گیا۔ دوسرے بلکہ چوتھے درجے کے شہری ہیں مسلمان۔ دیکھتی جاؤ۔ تمہارے گھروں پر قبضہ کرلیں گے۔‘

’خاک کریں گے۔‘

’اُف خالہ۔ اچھا بتاؤ۔ یہ گھر کب سے ہے؟ کچھ برسوں سے۔ پہلے کے

کاغذات۔؟ آئی کہاں سے تم؟ بنگلہ دیش سے؟ سب کو بھگا دیں گے۔اب تو کھلا
کھیل فرخ آبادی ہے۔خالہ اپنے ہی ملک میں مہاجر بنادیں گے اور پھر ایک دن
بوریا بستر سمیت کہیں گے کہ بھاگو یہاں سے۔'

'اچھا،' گل بانو نے چونک کر نظیرا کو دیکھا۔اسے علم بھی نہیں اور ہندوستان اتنا
آگے نکل گیا۔اماں نور جہاں نے صندوق تب کھولا، جب پرندے اپنا آشیانہ
چھوڑ کر کسی اور سمت پرواز کر گئے اور اسی لیے کئی دنوں سے گل بانو کو آسمان خالی
خالی نظر آرہا ہے۔اس نے نظیرا کی طرف دیکھا، اس وقت اسے نظیرا اچھا لگ رہا
تھا۔نظیرا کے چہرے پر خوف کی جگہ غصہ تیر رہا تھا۔

'بے حیا سمجھتی ہو اماں، ایک بے حیا کا پودا بھی ہوتا ہے۔یہ پودا خود سے جگہ
بہ جگہ اپنی شاخیں نکال لیتا ہے۔ان کی نظر میں مسلمانوں کی اوقات بے حیا کے
پودوں کی طرح ہے۔اب وہ ان پودوں کو کاٹ دیں گے۔اب وہ ان پودوں کے
ساتھ اپنی من مانی کریں گے۔وہ ان پودوں کی شاخیں کُتر دیں گے۔پودے ہی کو
کچل دیں گے اور سب سے زیادہ نقصان میں تم رہو گی خالہ۔'

'ہائے اللہ۔ ہمارے پیشے کا مذہب سے کیا تعلق۔'

'اللہ آ گیا نا بیچ میں۔' نظیرا ہنسا۔تم لوگ تو سیدھے بنگلہ دیش بھیج دی جاؤ گی
اور بنگلہ دیش نے بھی قبول نہیں کیا تو سرحد پار ماری ماری پھرو گی۔خالہ، اچھے دنوں
کو نظر لگ گئی۔اب مسلمانوں کے لیے صرف برے دن ہیں۔بس جتنے دن روزگار
کر سکتی ہو، کر لو اماں....'

'اس سے کیا ہوا؟' گل بانو نے سوال کیا۔

'اس سے؟' نظیرا نے قہقہہ لگایا۔ اب تک ہم مالک مکان تھے۔ اب ہم
کرایے دار ہوں گے۔کرایے دار سے کبھی بھی گھر خالی کرایا جا سکتا ہے۔



گل بانو کو اچانک احساس ہوا، اس کے اندر کی حرارت ختم ہو چکی ہے۔اس کی
آواز گم ہے۔اور کچھ بدبو دار گوشت کے لوتھڑے اس کے جسم سے لپٹے ہوئے
ہیں۔اس کی آنکھیں فق ہیں اور ہونٹ بے آواز۔

'تم اقبال جرم کر چکی ہو....'

'اقبال جرم؟'

'ہاں، کہ تم کرایے دار ہو.... اور اب یہاں تمہاری ضرورت نہیں۔'

گل بانو کے کان کے پاس آتش بازیاں چھوٹ رہی تھیں۔ پہلے وہ نظیرا کے
جملے کی اہمیت کو سمجھی نہیں تھی۔اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ کس حد تک دنیا سے
کٹ کر رہ گئی ہے اور اچانک وہ اپنے ملک میں کہاں آ گئی ہے۔ جہاں ہر شے اسے
پرائی اور اجنبی نظر آ رہی ہے۔

گل بانو بہت دنوں بعد چھت پر آ گئی۔آس پاس گھروں میں اس وقت ہلچل
کا ماحول تھا۔سامنے والی چھت پر ایک لڑکی تھی جو ٹہلتی ہوئی کتاب بھی پڑھ رہی
تھی۔ دوسری چھت پر ایک عورت تھی جو موبائل پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ عام
دن ہوتے تو گل بانو خود کو ان جیسا ہی تسلیم کرتی۔لیکن اچانک وہ احساس کمتری
کے دائرے میں آ گئی تھی....اور یہ کمتر ہونے کا احساس اسے پریشان کر رہا تھا۔اس
دن اس نے موبائل پر سوشل ویب سائٹس چیک کیا۔یوٹیوب پر اول جلول خبروں کو
دیکھا۔ٹی وی پر عام دنوں میں وہ سیریل ہی زیادہ دیکھتی تھی۔اس نے باری باری
سے کئی نیوز چینل دیکھے۔ایک کام اور کیا۔اخبار والے کو بول دیا کہ وہ روز انگریزی
اور اردو کا ایک اخبار دے جایا کرے۔ابھی صندوق میں اس کی دلچسپی نہیں تھی۔
دلچسپی اس بات میں تھی کہ اچانک ملک میں اتنی بڑی تبدیلی کیسے آ سکتی ہے۔وہ سترہ

سال کی تھی اور ان باتوں کو سمجھنے لگی تھی۔ اس نے اماں سے بول دیا کہ صندوق کے لیے کچھ دن اور رُک جاؤ۔

اس نے نظیرا کو جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کے پاؤں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ نظیرا اور اماں کے درمیان کیا باتیں ہوئیں۔ جاتے ہوئے نظیرا ایک لمحہ کے لیے اس کے قریب ٹھہرا، پھر سرعت سے گیٹ کھول کر باہر نکل گیا۔ جہاں اس کی گاڑی لگی ہوئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد گاڑی اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔

چار دن بعد اماں کا صندوق کھل گیا۔ صندوق کو تو کھلنا ہی تھا۔ اس دن موسم صاف تھا۔ دھوپ تیز تھی۔ آسمان پر پرندے بھی نظر آرہے تھے۔ اماں نے نئی ساڑی پہنی تھی۔ پیشانی پر بندی لگائی تھی۔ اماں دیر تک نوابوں کی کہانیاں سناتی رہیں۔ ابوتراب خاں کا کٹرہ... محمد علی خاں کا کٹرہ... سرائے کے قصے، آصف الدولہ کی باتیں... کشمیری محلّہ، محبوب گنج، عنبر گنج، نخاس اور نواب گنج کے تذکرے... امجد علی شاہ اور نواب واجد علی شاہ کا تذکرہ.... وہاں کی گلیوں اور چوباروں کی باتیں۔ حالات بدلے تو لوگ بدلنے لگے۔ پھر کتنی کتنی ہجرتیں تقدیر میں لکھی گئیں۔ محل سرا اور ڈیوڑھیوں کے قصے۔ اب تو ان کے نشانات بھی گم ہوگئے۔ ایک ڈیوڑھی مرزا محبوب کی تھی۔ گورے چٹے، لمبے، آواز میں رعب... اماں کے مرید۔ محل سرا کے نزدیک نواب یار کی املاک، ولایت سے لوٹے تھے.... حکیم میرن.... سب کل کی باتیں لگتی ہیں۔ شیش محل کے نوابان کی ڈیوڑھیاں... دلی آکر کیا ملا؟ پورا ہندوستان دلی آکر بس گیا۔ پنجابی، ہریانوی، بہاری، مہاراشٹریں، بنگالی۔ دلی کسی کی نہیں رہی۔ اور اس لیے نہ یہاں ڈیوڑھیاں رہیں نہ محل سرا، خلوت میں جلوت کا انداز



بدل گیا۔

صندوق کھلا... پہلے ایک تیز بدبو اٹھی۔ اماں نے ہاتھ ڈال کر آہستہ آہستہ صندوق میں رکھے زیورات کو گل بانو کے سامنے رکھنا شروع کیا۔ یہ کشتی نما ٹوپی، کرتا، انگرکھا، اچکن، جس میں اطلس وزربنت کا استعمال ہوا تھا... ریشمی مہری کے سبز اور سرخ پائجامے۔ مخملی زرد رنگ کے چاندی کے بکلس، جامہ دار کے دوشالے اور چادریں، پھولدار ٹوپی، جامہ وار تھانوں سے بنی اچکن، جامدانی، انگوٹھیاں، بھاری بھاری چاندی کے چھلے، فیروزہ، عقیق، زمرد کے تحفے، چاندی کی جوتیاں، پھولدار پردے، ریشمی غلاف کے پھولدار لحاف، فرشی شمع دان اور یہ نواب کی بیویوں کے اترن....'

اماں مسکراتی تھیں۔ جو بھی ڈیوڑھی پر قدم رکھتا، تحفے ضرور لاتا۔ معاملہ عشق کا ہوتا تو بات زیورات تک پہنچ جاتی۔ عشق کے اظہار کے طریقے بھی مختلف تھے۔ یہاں بھی آداب کا لحاظ رکھا جاتا۔ آج کی طرح نہیں کہ جو دل میں آیا کہہ دیا۔ رئیس باخبر ہوتے تھے کہ عشق کے مقام میں کیسے کلمات ادا کرنے ہیں۔ اب تو تہذیب بدل گئی۔ اب وہ معاشرہ ہی ختم ہوگیا۔ اور یہ دیکھ....'

اماں نے ایک خوبصورت سا پھولدار لباس نکالا۔ ان کی آنکھوں میں چمک آگئی تھی۔

'تب میں تیری عمر کی تھی۔ سترہ سال۔ اماں نے پہنایا تھا۔ اس دن مجھے بڑے نواب کے ساتھ شب بیداری کرنی تھی۔ بڑے نواب اصولوں کے پابند تھے۔ قیمتی عطر کے شوقین تھے۔ بے داغ لباس پہنتے تھے۔ یہ میری نتھ اترائی کا موقع تھا۔ کل یہ لباس تیرے جسم پر سجے گا۔ نظیرا آنے والا ہوگا۔'

اماں نے لباس گل بانو کی طرف بڑھایا۔ گل بانو کی آنکھوں میں پہلے چمک

پیدا ہوئی۔ پھر کانوں میں بھیڑیے کی آواز گونجی۔ وہ اس کشمکش میں تھی کہ یہ چمک بادلوں سے آئی تھی یا لباس سے۔ بھیڑیے لباس میں چھپے تھے یا اس کے کان بج رہے تھے۔ اماں نورجہاں اس کی طرف پیار سے دیکھ رہی تھیں۔

'تم نے بھیڑیے کی آواز سنی؟'

'نہیں تو....

'اچھا، ابھی بجلی کڑکی۔ تم نے چمک دیکھی۔'

'نہیں تو....'

'اچھا، جب تم نے پہلی بار یہ لباس پہنا، اس وقت....'

'کوئی بجلی نہیں کڑکی۔'

'بارش میں جگنو تو آئے ہوں گے؟'

'بارش...جگنو...؟' اماں حیران سی، اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ کیا بول رہی ہو گل بانو....؟'

گل بانو ہنسی.... 'تمہارے صندوق سے جانور نکلے....؟'

'یہ جانور ہیں... یہ ریشمی دوپٹہ.... یہ کمخواب.... یہ جواہرات...؟'

'جانور....' گل بانو ہنستی چلی گئی۔

اماں نورجہاں کو حیرانی تھی۔ اچانک اس لڑکی کو کیا ہوگیا۔ کسی جنات کا سایہ تو نہیں پڑ گیا....

'تم نے بہت سے جانور پال رکھے ہیں اماں۔'

'تو سچ مچ پاگل ہوگئی ہے۔'

نہیں۔ میں وزیر آباد میں ہوں۔ رکاب گنج میں۔ محل سرا میں۔ نخاس میں... اور چتلی قبر میں۔'



'اب یہ چتلی قبر...؟'

'ایک دن سب کو قبر میں جانا ہے اماں۔'

اماں ناراض ہوگئی۔ 'ارے باؤلی۔ منہ سے کبھی کبھی اچھی اچھی باتیں بھی نکال لیا کر۔ تیری زندگی کی نئی شروعات ہونے والی ہے۔'

'تم بس صندوق سے بم نکالتی رہو اماں۔ میرے بارے میں زیادہ نہ سوچو۔'

'کیوں؟'

'کیوں کہ مجھے بم کا دھماکہ پسند ہے۔'

اس کے بعد گل بانو رُکی نہیں۔ اپنے کمرے میں آگئی۔ اس وقت اس کے اندر کیا کشمکش چل رہی تھی، اس کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

چار بجے نظیرا آیا۔ آج سبز سوٹ میں تھا اور چہرے سے کافی خوش نظر آرہا تھا۔

'طوطا...' گل بانو کو ہنسی آئی۔

'کیا....' نظیرا چونکا۔ پھر مسکرا دیا.... 'خالہ کہاں ہیں۔'

'بلّی پکڑنے۔' گل بانو کھلکھلا کر ہنسی۔

اماں کے قدموں کی چاپ گونجی تو گل بانو بھاگ کر دیوار کے پیچھے چھپ گئی۔ یہاں سے نظیرا اور اماں دونوں کی باتیں سن جاسکتی تھیں۔ نظیرا ہنس رہا تھا۔

'تم بھی نہ خالہ۔ زمانہ بدل گیا ہے۔'

'وہ تو تجھے دیکھ رہی ہو۔'

'اس لیے کلائنٹ بھی بدل گئے۔'

'ہاں یہ بھی صحیح۔'

'جو کل تک چھپ چھپا کر ہوتا تھا اب کھلے عام ہو رہا ہے۔ جہاں کل تک ایک دو منڈی ہوا کرتی تھی، وہاں نئی منڈیاں آ گئی ہیں۔'

'اب کام کی بات کر نظیرا۔ کیا ہوا'

'بہت بڑا کلائنٹ ہے۔ کل آئے گا۔ پہلے وزیر تھا۔ الیکشن ہار گیا۔'

'عمر کتنی ہے۔'

'عمر کی بات کیوں کرتی ہو خالہ۔ ۶۰ کا ہے۔ مگر ۴۵ کا لگتا ہے۔ وہ یہاں آنے کو تیار نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے منایا ہے۔ اب میرے سارے کلائنٹ بڑے لوگ ہیں۔ بٹیا راج کرے گی۔'

'وہ تو کرے گی۔' اماں کے چہرے پر خوشی دوڑ رہی تھی۔

اور یہ رکھ لو اماں۔ پورے ایک لاکھ ہیں۔'

نظیرا نے لفافہ اماں کی طرف بڑھایا۔ اماں نے جھٹ سے لفافہ نظیرا کے ہاتھوں سے لے لیا۔

'پہلے نظر تو اتار لوں۔ صدقہ تو نکال لوں... اے گل بانو... گل بانو۔'

گل بانو پاس آئی تو اماں نے لفاف آگے بڑھایا۔

' اس کو اپنے ہاتھ سے چھو دے۔ تیری پہلی آمدنی۔'

گل بانو نے لفافہ کو دیکھا تو ایسا لگا، اس کے اندر ہاتھی اچھل رہے ہوں۔ اس نے لفافہ پر ہاتھ رکھا۔ اماں نے آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھا۔ پھر لفافہ کھولا۔ دو ہزار اور پانچ سو کے نوٹ تھے۔ پانچ سو کا ایک نوٹ لے کر اماں نے نظیرا کی طرف بڑھایا۔

'بستی حضرت نظام الدین چلے جانا۔ غریبوں کو کھانا کھلا دینا۔'

'یہ پانچ سو مجھے دے دو نا۔ میں بھی تو غریب ہوں۔' گل بانو نے کہا



نظیرا نے قہقہہ لگایا۔ 'اب کہاں۔ بس دیکھتی جاؤ خالہ۔ ایک دن پوری سرکار تمہاری ہوگی۔'

'تیرے منہ میں گھی شکر۔'

اماں نے گل بانو کی نظریں اتاریں۔ محبت سے نظیرے کی طرف دیکھا۔

'....اور کمیشن۔؟'

'اس کی پرواہ نہ کرو اماں۔ تم سے کمیشن نہیں لوں گا۔ میرا کمیشن مجھے کلائنٹ سے مل جائے گا۔ بس، گل بانو کلائنٹ کو خوش کر دے۔'

'کیوں نہیں خوش کرے گی۔' اماں نے گل بانو کی طرف محبت سے دیکھا۔

مگر گل بانو کا دھیان کہیں اور تھا۔

تیرا سمندر بڑا ہے اور میری کشتی چھوٹی....

میں تیرتی ہوئی پانیوں کے دیس میں آ گئی ہوں....

یہاں چاروں طرف پانی ہے اور میرے پاؤں بھیگے ہیں....

گل بانو کو احساس ہے کہ وہ تیرتی ہوئی اتنی دور نکل گئی ہے کہ اب واپسی ممکن نہیں ہے۔

## (4)

ایک، دو، تین، چار.....اب گل بانو نئے نئے تجربوں کی عادی ہوگئی تھی۔ کبھی گھر، کبھی ہوٹل، کبھی گیسٹ ہاؤس۔ کبھی کوئی نوجوان، کبھی بوڑھا۔ اماں نور جہاں کو صرف پیسوں سے مطلب تھا۔ گل بانو کو احساس تھا کہ اس بار کچھ نیا تجربہ ہونے والا ہے۔

ہوٹل کے چھوٹے سے کمرے میں نور ہی نور پھیلا تھا۔ کسٹمر آج کی رات کو کچھ کچھ 'تاریخی' یا یادگار بنانا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں کہاں سے اُس کے اندر ایک شاعر آ گیا تھا۔ شاعر ــــ وہ اِس شاعر کو، جنت سے اُتری ہوئی اپسرا کے سامنے کچھ زیادہ ہی 'قرینے' سے پیش کرنا چاہتا تھا۔ حقیقت میں اِس طرح سے رومانی وہ کبھی نہیں ہوا۔ 'مال' کی سپلائی۔ آرڈر۔ گاڑی اور بسوں کی تھکان ــــ پھر ایک عدد طوائف کا ساتھ ــــ جنگلی پن کا مظاہرہ اور ایک ٹھنڈی ندی کا بہاؤ۔ لیکن ــــ یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔

گل بانو، شہزادیوں کی طرح بستر پر لیٹ گئی تھی ــــ مخمور آنکھیں ــــ گہری جھیل کی طرح لگ رہی تھیں۔ سنگ مرمر کی طرح شفاف، چمکتا ہوا بدن۔ ایک لمحے کو اُس نے کہا بھی۔



'کپڑے اُتاروں؟'

'نہیں۔ ابھی نہیں......ابھی تو رات پڑی ہے......'

گل بانو نے کندھے اُچکائے۔ اُس کی بانہیں ننگی تھیں ــــ گوشت کا ایک بے حد حسین ٹکڑا۔ جینس کے پینٹ اور سلیولیس ٹی شرٹ میں اُس کا 'مغرور بدن' انگاروں کی بارش کر رہا تھا۔

ایک لمحے کو کسٹمر ٹھہر گیا۔ گل بانو اُسی کی طرف دیکھ رہی تھی ــــ اُس کی پریشانی تھی کہ کہاں سے شروع کروں۔ مطلب کہاں سے رومانی ہوا جائے۔ وہ سوچ میں گرفتار تھا۔ اتنا بڑا شہر ــــ پھیلتا ہوا ــــ تیزی سے بڑھتا بازار ــــ آلودگی ــــ شور ــــ شروعات شہر سے ہی کرنی چاہئے۔

اب کسٹمر مطمئن تھا۔ ہونٹ گول ہوگئے۔ آنکھوں میں نشہ پیدا کیا۔ بانو کے چہرے کی طرف دیکھا اور لگا ــــ الفاظ کے 'فوارے' چلنے خود بخود شروع ہوگئے ہوں......

''تمہارا شہر......تمہیں یاد ہے ــــ پیڑ پودے......کھلکھلاتا ہوا گلشن...... گیت گاتی ہوئی ٹھنڈی ہوا...... یہ سب مجھے میرے اپنے لگتے تھے۔ جیسے ہوا صرف میرے لئے جھوم رہی ہو...... درخت صرف میرے لئے گا رہے ہوں...... اور شہر ــــ میں یہیں پیدا ہوا ہوں......اسی مٹی سے ــــ یا پھر 'پنر جنم' کا کوئی گہرا لگاؤ ہوگا۔ میں کبھی یہاں بزنس کے خیال سے نہیں آیا ــــ بس۔ یہاں کا ــــ یہاں کی آب و ہوا بار بار مجھے اپنی طرف کھینچ لاتی تھی۔ جیسے شہر بین بجا رہا ہو...... میرے لئے...... بلا رہا ہو مجھے...تمہیں آنا ہی ہوگا اور دیکھو ــــ''

'یہ شہر میرا نہیں ہے ــــ'

گل بانو نے درمیان میں ہی بات کاٹ دی۔ جیسے ہوا رُک گئی۔ 'بین' کا

بجنا بند ہوگیا۔ سرسراتے پیڑ خاموشی میں بدل گئے ـــــ گیت رُک گیا......

کسٹمر ایکدم سے چونکا ـــــ 'تمہارا نہیں، مطلب......'

'مطلب میرا نہیں ہے......'

'پھر ـــــ؟'

'میں ابھی حال میں آئی ہوں۔ پھر کہاں جاؤں گی۔ کہہ نہیں سکتی......'

'چلو......کوئی بات نہیں......'

آگے بڑھ کر کسٹمر نے کھڑکی کھول دی ـــــ کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آ گئے تھے۔

'ٹی وی چلا دوں......'

'نہیں، گل بانو کی آواز خاموش لہروں کی طرح 'ساکت' تھی۔

کسٹمر بھی کچھ دیر تک کھڑکی سے باہر بے مطلب دیکھتا رہا۔ جیسے گل بانو سے دوبارہ گفتگو کے لئے نئے لفظ تلاش کر رہا ہو ـــــ اُس نے آئینہ میں اپنا جائزہ لیا۔ سفید کرتا، پائجامہ۔ آنکھوں کا نشہ ابھی اُترا نہیں تھا۔ ہونٹ ابھی بھی گول تھے۔ اندر رومانی انسان موجود تھا۔ 'شہر' والا کارتوس تو فیل کر گیا۔ جانے دو۔ کیا ہوا۔ گل بانو اب کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کو وہ اُٹھی۔ لہرا کر کھڑکی کے پاس کھڑی ہوگئی ـــــ جیسے کشتی کے 'بادبان' کھل گئے ـــــ ہوا کے رتھ پر ایک خوبصورت سا چہرہ، 'جھولے' جیسا جھول رہا تھا۔

'وسو......' اُس کی آواز میں نشہ تھا...... وسندھرا...... کتنا پیارا نام ہے...... تمہیں پتہ ہے وسو...... دلّے نے ـــــ نہیں معاف کرنا مجھے ـــــ پہلے ہم اُسے اِسی نام سے پکارتے تھے...... چلو، چھوڑو اِس بات کو۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ دلّے نے جیسے ہی تمہارا نام لیا...... و......سن......دھرا...... پتہ ہے...... مجھے کیا لگا......کبھی



تم نے ریگستان میں، خاموشی کی ریت پر چلنے والے اونٹوں کی گھنٹیاں سنی ہیں ـــــ نہیں۔ میں مندر یا گرجا گھر کی گھنٹیوں کی بات نہیں کر رہا...... ریت کی اُڑتی آندھی میں، ایک قطار سے چلے آ رہے، اونٹوں کے گلے میں بندھی گھنٹیاں...... جیسے 'جلترنگ' بجتا ہے...... جیسے دنیا کے سب سے میٹھے ساز نے تمہارا نام پکارا ہو۔ و......سن......دھ......را......جیسے ـــــ'

'وسندھرا میرا نام نہیں ہے ـــــ' گل بانو کھڑکی سے ہٹ گئی تھی۔ کسٹمر نے جائزہ لیا۔ وہ خاصی لمبی تھی۔ ایک خوبصورت اور پُرکشش جسم ـــــ لیکن جیسے دھیمی دھیمی آنچ پر جلتے پگھلتے جسم کی اُسے کوئی فکر ہی نہیں تھی۔ گل بانو اُٹھ کر کرسی پر بیٹھ گئی ـــــ

'تمہارا نام نہیں......' کسٹمر اٹک رہا تھا۔ لفظ ٹوٹ رہے تھے ـــــ

'ہاں......'

'مگر دلّے نے تو......'

'ہاں وہ ہر روز نام بدل دیتا ہے......'

ہر روز......مطلب تمہارا اپنا کوئی نام نہیں'۔

گل بانو گہری سوچ میں گم تھی اور ایک ٹک کسٹمر کے چہرے کو دیکھ رہی تھی ـــــ

'تم سونا چاہتی ہو تو......'

'نہیں گل بانو کے الفاظ میں سختی نہیں تھی ـــــ وہ سب کچھ ایک روبوٹ کی طرح کر رہی تھی......'تم نے خریدا ہے مجھے۔ آج کی رات کے لئے۔ مجھے حکم ہے، میں وہی کروں جو تم چاہو گے......'

کہنے کے لئے تو کسٹمر کے پاس متعدد سوالات تھے—— زندگی اور مجبوری سے جڑے سوالات—— یہاں، اِس منزل تک کی تکلیفوں سے الجھے ہوئے سوالات—— مگر ایسے 'بے رحم' سوالوں کی شروعات سے ایک اچھی، خوبصورت اور رومانی رات کا ستیاناس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ گل بانو ایک بار پھر بڑی ادا سے بستر پر لیٹ گئی تھی۔ 'قلوپطرہ' مونا لیزا سے لے کر جنیفر لوپیز تک کتنے ہی نام ہونٹوں تک آ کر، ٹھہر گئے—— یہ جسم، یہ لباس...... وہ اُس کے لباس کا جائزہ لے رہا تھا۔ آج جینس تو ہر دوسری تیسری لڑکی پہنتی ہے۔ سلیولیس شرٹ تو سبھی پہنتے ہیں......مگر اتنا بولتا ہوا لباس...... چوائس کتنی اچھی ہے—— ہیرا اپنی قیمت پہچانتا ہے۔

ہوا تیز ہوگئی تھی۔ کھڑکی کے پٹ ڈول رہے تھے—— گل بانو آہستہ سے بولی۔

'کھڑکی بند کردو......'

'اچھا'

کسٹمر اپنی جگہ سے اُٹھا۔ کھڑکی سے، بادلوں کے کچھ ٹکڑوں کے درمیان، آنکھ مچولی کھیلتا ننھا سفید چاند آ گیا تھا۔ دروازہ بند کرتے ہی وہ تیزی سے مڑا۔ چاند گل بانو کے لباس میں گم تھا...... سفید ٹی شرٹ، بادل کے ٹکڑوں میں تبدیل ہوگئے تھے۔ چاند اِن ٹکڑوں میں سمٹ آیا تھا......

گل بانو دھیرے سے ہنسی——

'کیا دیکھ رہے ہو......'

'تمہارا لباس......'

'لِ......باس——' گل بانو کہتے کہتے رُک گئی۔



'کتنا خوبصورت۔ کتنا پُرکشش ہے۔ جیسے......'

اُس کی کھنک دار ہنسی نے ایک بار پھر کمرے کا سکوت توڑ دیا تھا——

'یہ لباس بھی میرا نہیں ہے۔'

'مط......لب۔'

گل بانو چپ تھی—— ''مطلب میرا نہیں ہے۔ کل والی پارٹی نے دیا تھا۔ گفٹ۔ ایک رات کا تحفہ...... کچھ سر پھرے ایسے بھی ہوتے ہیں۔ قیمت کے ساتھ ساتھ گفٹ بھی دے جاتے ہیں...... پاگل۔''

باہر جیسے ہوا کا شور رُک گیا۔ بند کھڑکی سے بادلوں کے ٹکڑے، جیسے 'کُہرا' بن کر کمرے میں سمٹ آئے۔ گھُپ اندھیرا۔ نمی کی پتلی سی چادر۔ پھر جیسے دھیرے سے چادر ہٹی۔ اندھیرا ختم ہوا۔ بادل کھڑکی سے باہر لوٹ گئے۔ وہ فکرمند تھا—— کیسی لڑکی ہے۔ نام بھی اپنا نہیں—— لباس بھی نہیں—— شہر بھی نہیں......

باہر جیسے ڈرم پیٹے جا رہے ہوں۔

کسٹمر یکایک چونک پڑا تھا۔ گل بانو اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر یکایک اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اب وہ اس کی آنکھوں میں کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ہوا پھر سے تیز ہوگئی تھی ......وہ..بستر پر دوبارہ لیٹ گئی تھی...... اُس کے ہاتھ بارش بن گئے تھے......اپنے ہی جسم پر مچلتے ہوئے——

'ہوا تیز ہے...... ہے......نا......'

'ہاں......'

اُس نے ایک جھٹکے سے جینس ہوا میں اُڑا دی......

'کھڑکی کے پٹ ڈول رہے ہیں......'

'ہاں......'

سفید ٹی شرٹ، اس کے مخملی بدن سے الگ ہوچکی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک آگ تھی۔نہیں جل مچھلی......نہیں جل مچھلی نہیں......فرانس کی شنگو رافش کے بارے میں اُس نے سنا تھا____ ایک پانی میں تیرنے والی عورت____ بستر جیسے ہوا میں اُڑ رہا تھا...... ایک بے حد حسین چہرہ۔ لمبی گردن۔قلوپطرہ کی طرح، تنا ہوا حسین، گٹھا ہوا جسم____ جیسے کمان سے تیر چھوٹنے بھر کی دیر ہو۔ دو ننگے پاؤں____ جیسے پانی میں لہراتی دو ننگی حسین ڈالیاں......

گفتگو کا سناٹا اُس کے حسین مچلتے جسم نے توڑ دیا تھا......کسٹمر کانپ رہا تھا۔ جذبات کی تپش میں...... بہتے سیلاب میں____ ٹھنڈے پانی اور گرم آگ میں...... وہ اُڑ رہا تھا......نہیں بہہ رہا تھا____ یہ لڑکی۔نہیں ویشیا۔ نام بھی نہیں۔ شہر بھی نہیں۔لباس بھی نہیں......مگر یہ حسین جسم...... یہ حسین چہرہ......

سمندر میں چھلانگ لگانے سے پہلے وہ اُسے خوش کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا۔لڑکی اُس کے سوالوں سے بوجھل ہوگئی تھی۔ مگر اب آخری سوال____ آخری ہتھیار...... بستر پر آگ کا دریا بہہ رہا تھا...... اُس نے آگ کے دریا کو مدہوش ہورہی آنکھوں سے دیکھا۔آنکھوں میں خمار چھا گیا۔ ہونٹ گول ہوگئے۔ وہ ایک بار پھر رومانی تھا۔

'یہ......تمہارا چہرہ......تمہارا جسم......تم یقین کرو گی۔ وسو......یا جو بھی تمہارا نام ہو......تم یقین......'

'یہ جسم میرا نہیں ہے، یہ چہرہ میرا نہیں ہے......' گل بانو کسی روبوٹ کی طرح اپنا پرس کھول رہی تھی____ 'ہاں۔چونکومت۔ اِس میں کچھ بھی چونکنے جیسا نہیں ہے......'



گل بانو ایک لمحہ کو رُکی____

باہر طوفان یکا یک تیز ہوگیا تھا۔ کھڑکی کے پٹ تیز تیز بجنے لگے تھے____ جیسے ابھی ہوا کا زور، پوری طاقت سے کھڑکی کے پٹ توڑ ڈالے گا۔گل بانو کہہ رہی تھی......

'سنو...... اِس میں کچھ بھی نیا نہیں ہے۔ یہ چہرہ، یہاں تک____ ماں بتاتی تھی____ اُس کا ہے____ یہاں...... یہاں سے یہاں تک یہ والا حصہ میرے باپ کا...... ماں میری ہاتھ کی انگلیوں کے بارے میں بتاتی تھی کہ...... ماں کہتی تھی پیر تو بالکل اُس کے جیسے......اور یہ حصہ...... ماں کہتی تھی...... ماں کا ایک بوائے فرینڈ تھا......'

تیز ہوا سے کھڑکی کی سٹکنی ٹوٹ کر گر گئی تھی۔گل بانو بچوں کی طرح تالیاں بجارہی تھی____ ہا......ہا...... یہاں بھی تم ہار گئے......'

بچوں کی طرح پرس میں ہاتھ ڈال کر اُس نے کنڈوم نکال لیا تھا____

'یہ میرا ہے۔ اِسے میں ساتھ لے کر چلتی ہوں......'

گل بانو بچوں کی طرح 'کنڈوم' کو پھونکنے، پھلانے کی کوشش کر رہی تھی____ کمرے میں یکا یک طوفان بڑھ گیا تھا۔

(5)

## نئے حالات اور گل بانو

گل بانو نے گرم پانی میں تیرتے تیرتے سر نکالا تو دنیا بدلی ہوئی نظر آئی۔ نظیرا بدل چکا تھا۔ اماں بدل چکی تھیں اور خود گل بانو کی زندگی میں ایک بڑی تبدیلی آئی تھی۔ باہر آندھیاں تیز تھیں۔ نظیرا نے جن واقعات کی طرف اشارہ کیا تھا، تبدیلی کے لیے ایک بڑی دنیا اس نئے انقلاب میں شامل نظر آ رہی تھی.... گل بانو کے معمولات بدل چکے تھے۔ نظیرا ایک مہینے میں پانچ سے چھ کلائنٹ کا انتظام کرتا۔ اماں نور جہاں نے کہہ دیا تھا۔ اس سے زیادہ نہیں۔ بے بی کے جسم پر اثر پڑے گا۔ کلائنٹ امیر ہوں۔ باقی کے دن ہم اپنی مرضی سے گزارنا چاہتے ہیں۔ گل بانو اب صبح اٹھ کر اخبار پڑھتی تھی۔ ٹی وی دیکھتی تھی۔ شاپنگ کرتی تھی اور نئے حالات سے باخبر رہنا چاہتی تھی۔ نظیرا نے بتایا....

خانہ بدوش آ رہے ہیں....

اور بڑی تعداد میں آ رہے ہیں۔

'کہاں؟'



اس دن نظیرا گل بانو کے پاس بیٹھ گیا۔ آہستہ سے گل بانو کا ہاتھ تھاما۔ گل بانو نے اعتراض کیا۔

'تیری نیت ٹھیک نہیں۔'

'بے بی کی بات....' نظیرا ٹھہاکے لگا کر ہنسا۔

'میرا ہاتھ چھونے سے کیا ملتا ہے.....'

'بے بی کی بات....' نظیرا پھر ہنسا..... خانہ بدوشوں کی دنیا میں نکل جاتا ہوں....'

'خانہ بدوشوں کی دنیا.....'

'انھوں نے قبضہ کر لیا ہے..'

'دیکھ رہی ہوں..'

'کیا سرحد پار کے گدھ اڑ گئے....'

'گدھ ہر جگہ ہیں....'

'پھر ہمارا کیا ہوگا.....'

نظیرا نے گل بانو کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ انقلاب.... 'سوچتا ہوں، باہر جو طوفان امڈا ہے، میں بھی اس میں شامل ہو جاؤں گا۔'

'تو شامل ہوگا؟' گل بانو ہنسی۔

'کیوں؟ دلّا ہوں۔ بے غیرت نہیں۔' نظیرا اٹھ کر سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا.... انقلاب کو سب کی ضرورت ہوتی ہے....'

'پھر تو میں بھی جاؤں گی۔'

'کہاں....'

'انقلابیوں کا ساتھ دینے..... خانہ بدوشوں کے خلاف....'

'تم جاؤ گی؟' نظیرا ہنسا...

'کیوں؟' گل بانو مسکرائی— 'اسٹوڈنٹ ہوں....'

'تم اور اسٹوڈنٹ؟'

'میں بھی اسٹوڈنٹ ہوں.....میں بھی پروٹیسٹ کروں گی۔'

نظیرا بے ساختہ ہنسا.....تم ایک— سپر ماڈل

'سپر ماڈل پروٹیسٹ نہیں کرتے......شہری نہیں ہوتے.....؟'

'ہوتے کیوں نہیں ہیں۔'

'پھر میں بھی ان کا ساتھ دوں گی۔'

سپر ماڈل.... یہ نظیرا کا گل بانو کو دیا ہوا نیا نام تھا۔گل بانو اس وقت کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔اس کی مٹھیاں بند تھیں۔

'کیا وہ ہمیں نکال باہر کر پائیں گے؟'

'ان کے پاس طاقت ہے۔' نظیرا نے آہستہ سے کہا۔

'وہ طاقت کا استعمال ہم پر کریں گے۔؟'

'وہ ایسا کر سکتے ہیں۔'

جب سورج کی ملگجی روشنی تیرتی ہوئی کھڑکیوں پر دستک دے رہی تھی اور گل بانو نے دیکھا کہ اس کی شیشوں والی کھڑکی لینڈ اسکیپ پینٹنگ میں تبدیل ہوگئی ہے اور اس پینٹنگ میں بہت سے پرندے ہیں جو ایک جگہ جمع ہیں اور اڑنا بھول چکے ہیں اور اپنے پروں کو دیکھ رہے ہیں کہ ایسا کیسے ہوگیا۔ پرندے خوفزدہ بھی ہیں اور ساکت بھی لیکن گل بانو کو احساس ہوتا ہے کہ ابھی وہ اس پینٹنگ سے نکل کر اس کے کمرے میں آجائیں گے۔اس نے نظیرا کی طرف دیکھا۔وہ چپ تھا اور انگلیوں



سے فرش رگڑ رہا تھا۔اس کی انگلیاں موٹی اور سیاہ تھیں، بدنما بھی۔اس نے ان انگلیوں میں ایک کھنچاؤ محسوس کیا۔گل بانو کو احساس ہوا کہ اس میں آنے والی تبدیلیوں میں بڑی حد تک ہاتھ اس نظیرے کا بھی ہے۔جو پچھلے گھر میں ایک ناکام سا آدمی، ایک بدہیئت مخلوق یا پیشہ ور خواتین کا منیجر معلوم ہوتا تھا، اب اس نئے پیشے میں اس کے اندر تخیل کا ایک جہاں آباد ہوگیا ہے۔وہ دوسروں سے اس لیے بہتر ہے کہ وہ سوچتا ہے۔بہت سی چیزیں، یا خیال، یا کسی نکتہ کو صرف ایک آرائشی پیرہن نہیں دیا جاسکتا۔کبھی کبھی خیالات اسی طرح آزادی چاہتے ہیں جیسے دلی کے، جامعات کے طلبا اور طالبات اس وقت سڑکوں پر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔اس نے ایک بار پھر نظیرے کی طرف دیکھا اور نظیرے کی آنکھیں گل بانو کو بہت معصوم نظر آئیں۔نظیرے کے ہونٹ سیاہ اور خشک تھے۔آنکھیں چھوٹی تھیں مگر یہ آنکھیں مختلف موقعوں پر گل بانو کو حیران کر جاتی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح گل بانو نے اس کے پاؤں کی طرف دیکھا....اور احساس ہوا کہ چوہے اس کے پاؤں سے لپٹے ہوں اور چوہوں سے پاؤں کو چھڑانے کی کوشش میں نظیرے کے پاؤں میں لنگ پیدا ہوگیا ہو۔گل بانو مسکرائی۔کبھی کبھی مسکراہٹ بھی عجیب ہوتی ہے۔مسکراہٹ کو کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔مسکراہٹ میں درد بھی ہوتا ہے اور مسکراہٹ کسی خوشی کی تخلیق کی جگہ دکھ کی عبارتیں لکھنے میں مصروف رہتی ہے۔گل بانو نے اپنے ہاتھوں سے اپنے چہرے کو سہلایا اور نظیرے کی طرف دیکھا۔اس بار اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

'کتّے '

'میں برا نہیں مانوں گا بے بی۔'

'ہاں تم برا نہیں مانو گے۔ کیونکہ کتّے ہر حال میں تم سے بہتر ہیں اور اسمارٹ بھی۔'

'ہے ہے ....' نظیرا ہنسا...

'گلاب..' گل بانو نے پیار سے نظیرے کی طرف دیکھا.....

'اب یہ کیا ہے.....؟'

'تمہارے اندر دیکھ رہی ہوں۔ ایک گلاب کھلنا چاہتا ہے۔ مگر غیر معقول آدمی۔ تم اس گلاب کو کھلنے نہیں دیتے...'

'ہے ہے.....بے بی کی بات...' نظیرا پھر ہنسا۔

'حالات خراب ہیں...'

'ہاں بہت سے کہیں زیادہ۔'

'اور تم لنگڑا بھی رہے ہو۔'

'اب یہ لنگڑانا کہاں سے آ گیا بے بی....'

'جہاں سے حالات آئے۔ تم لنگڑاتے ہوئے بالکل اچھے نہیں لگتے۔' گل بانو نے اس کی طرف دیکھا۔ ویسے پہلے تو نہیں لنگڑاتے تھے۔ پھر کیا ہوا۔

'ہے ہے۔ دو بات ہوتی ہے بے بی۔ آدمی گڈھے میں گر جاتا ہے یا گڈھا چل کر آدمی کے پاس آ جاتا ہے۔'

'تمہارے حصے میں کیا آیا۔'

'گڈھا چل کر میرے پاس آیا...'

'یعنی پورے گر گئے...'

'ہے ہے...' نظیرا کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا۔

گل بانو ایک لمحہ کو خاموش ہوئی۔ اس نے پھر غور کیا، اس میں آنے والی تبدیلیوں میں، اس کی ماں کا ہاتھ بالکل بھی نہیں تھا۔ اماں نور جہاں، اجنبی کی چاہت کے باوجود کورا سلیٹ تھیں، جس پر وہ ڈھنگ سے اور طریقہ سے گل بانو کا



نام بھی نہیں لکھ سکیں۔ وہ اس کی زندگی سنوار بھی سکتی تھیں مگر وہ ایک ایسی خاتون تھیں جو زیادہ خود کے بارے میں سوچتی تھیں اور ان کی چاہت میں ایک بھی پودا نظیرے کی طرح نہیں تھا جو باہر کے سرد اور گرم موسم کو دیکھنے کی بصیرت رکھتا ہو۔ اور اسے پھر خیال آتا ہے، کچھ بہت تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے اور اس کی عمر اس موڑ پر ہے کہ اسے زندگی کو سمجھنے کی دوڑ میں کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہیے۔ اور جب گل بانو نے یہ سوچا تو اسے فوجی بوٹوں کی آہٹیں سنائی پڑیں۔ کھڑکی سے باہر سڑک کا منظر نظر آ رہا تھا۔ اس وقت سڑک سے کچھ فوجی ٹرک گزر رہے تھے۔ ان کے پیچھے بھی فوجیوں کی ایک قطار تھی جو تیز قدموں سے آگے بڑھ رہے تھے۔ اس نے پھر آہستہ سے کہا۔

'حالات خراب ہیں....'

'کیا یہ سب کچھ اچانک ہوا نظیرے....'

'نہیں۔'

'تجھے کیسے معلوم....؟'

نظیرے ہنسا۔ دلاّ ہوں۔ مگر شہری بھی ہوں اور گل بانو نے دیکھا اس وقت نظیرے نے ایک بڑے مزے کی بات کہی۔ گل بانو کو امید نہیں تھی کہ نظیرا کبھی اس طرح کی باتیں بھی کر سکتا ہے۔ نظیرے نے اپنی سیاہ انگلیوں کو مسلتے ہوئے کہا کہ انسان کو بولنا چاہیے۔ صرف دیکھنا نہیں چاہیے اور دنیا ایک خوبصورت غبارہ نہیں ہے۔ غبارے کی ہوا بھی نکل جاتی ہے اور اس وقت پچکی ہوئی دنیا کو دیکھنے کا خیال بھی تباہ کن ہوتا ہے۔ اس لیے جو نہیں دیکھتے، جو نہیں سنتے، جو نہیں بولتے، وہ اکثر مرجاتے ہیں....'

'ابھی ہم کیا ہیں۔'

'مرے ہوئے۔'

'کیا کرنا ہوگا....؟'

'زندہ ہونے کا ثبوت پیش کرنا ہوگا۔'

'اور اس کے لیے۔'

'چلو بے بی....زندگی زندگی کھیلتے ہیں...'

'یا آزادی آزادی؟'

'دونوں برابر ہیں۔'

'کیسے نظیرا؟'

'زندگی کو آزادی چاہیے بے بی....آزادی کے بغیر زندگی صرف ایک پیپر ویٹ بن جاتی ہے۔ٹھوس، سخت اور ایک جگہ منجمد.....جب تک کوئی دوسرا اس کے استعمال کو نہ مل جائے۔'

'تو چلو...' گل بانو اپنی جگہ سے اچھلی...

'خالہ کو...'

'خالہ کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔'

نظیرا نے پورٹیکو سے گاڑی نکالنی چاہی تو گل بانو نے منع کیا۔نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔

کیوں؟ نظیرے کے چہرے پر حیرت تھی۔

'آٹو سے چلیں گے۔'

آٹو سے چلتے ہوئے فوجی اور پولیس قدم قدم پر نظر آئے۔علاقہ چھاؤنی میں تبدیل تھا۔ پولیس ڈنڈوں سے لیس تھی۔مختلف شاہراہوں پر فوجی ٹرک کھڑے



تھے۔طلباء طالبات کی قطار ہر جگہ تھی۔ان کے ہاتھوں میں پوسٹر اور زبان پر نعرے تھے۔ ہونٹوں پر معصوم سوال تھے اور اس پینٹنگز کو جو گل بانو نے اپنے گھر کی کھڑکی پر دیکھا تھا، جہاں پرندے خاموش تھے، وہ پرندے اس اطراف میں آ چکے تھے، مگر یہ پرندے خوفزدہ نہیں تھے۔ پولیس کی قطار اور فوجی دستوں کے باوجود وہ ایسے چل رہے تھے، جیسے وہ فاتح ہوں اور دنیا کی کوئی طاقت انہیں مغلوب نہیں کرسکتی ۔ وہ کافی پہلے آٹو سے اتر گئے۔ ہزاروں کا مجمع تھا۔ کچھ لڑکے لڑکیاں تھک کر بیٹھ گئے تھے۔ کچھ کھڑے تھے۔ گیٹ بند تھا۔ایک چھوٹی سی تعداد گیٹ کے اندر بھی تھی۔ذرا ذرا سے فاصلے پر پولیس کے باوردی اور اسلحوں سے لیس پولیس کے سپاہی موجود تھے۔گل بانو نے زندگی میں پہلی بار اتنے سارے طلبہ طالبات کو اکٹھے دیکھا تھا ان کے ہاتھوں میں پرچم اور بینر تھا۔ ہزاروں کی بھیڑ میں پرچم چاروں طرف لہرا رہا تھا۔ ایک طرف اچانک نگاہ اٹھی تو سامنے ایک لڑکی تھی۔عمر یہی کوئی اٹھارہ انیس۔ اس نے حجاب لگا رکھا تھا۔ چہرہ سانولہ تھا مگر اس کے باوجود پرکشش۔اس کے ہاتھ میں ایک بینر تھا۔ میں ہندو ہوں، میرا نام چارولتا ہے۔کیا آپ اس لباس میں میری شناخت کر سکتے ہیں۔؟ گل بانو کو یاد آیا۔کچھ دن قبل پی مشن کے باس نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ دہشت گرد اپنے لباس سے پہچانے جاتے ہیں۔اس معصوم سی لڑکی میں گل بانو کسی دہشت گرد کو تلاش نہیں کر سکی۔اس نے چاروں طرف دیکھا۔ سر ہی سر۔غیور، پُر اعتماد، مادر وطن پر نچھاور ہو جانے والی لڑکیاں، وہ ان لڑکیوں کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔کیا لڑکیاں ایسی بھی ہوتی ہیں۔ کچھ حجاب میں تھیں۔ کچھ اسکرٹ اور جینس میں۔کسی کو لباس کی زیادہ پرواہ نہیں تھی۔کسی نے بھی میک اپ نہیں کیا ہوا تھا۔ اس وقت سروں کا سیلاب تھا اور پرچم لہرا رہے تھے۔اچانک ان میں سے ایک لڑکی نے آزادی کی دھن چھیڑ دی۔ سڑک کے

چھوٹے سے گوشے میں قطار باندھے لڑکے لڑکیوں نے آزادی کے لفظ کو دہرانا شروع ہوا۔گل بانو کو احساس ہوا، آزادی کے اتنے دنوں بعد آزادی؟ اب کس سے آزادی۔؟ اس نے سنا۔ آگے والی لڑکی ہاتھ اٹھا کر کچھ کہتی تھی ۔ پھر سروں کے سیلاب سے آزادی کی مخصوص دھن سنائی دیتی تھی۔گل بانو نے ایک ایک لفظ پر توجہ دی۔آزادی....پُر آشوب موسم سے آزادی...نفرتوں سے آزادی.... رہنے کی آزادی..کھانے اور پینے کی آزادی... پڑھنے کی آزادی..فسطائی طاقتوں سے آزادی....شر پسندوں سے آزادی....مذہب کے نام پر سیاست کرنے والوں سے آزادی....اچانک اس کا ہاتھ بھی ہوا میں لہرایا....آزادی....اورنظیرے نے حیرت سے دیکھا کہ گل بانو ان لڑکیوں سے بالکل بھی الگ نہیں تھی جو اس وقت آزادی کے نعرے لگا رہی تھیں۔جینس اور ٹی شرٹ میں ایک لڑکی آگے بڑھی اور گل بانو سے پوچھا...

’تم اسٹوڈنٹ ہو.....؟‘

گل بانو کے کانوں میں موسیقی گونجی۔ جیسے یہ اسٹوڈنٹ لفظ دنیا کا سب سے خوبصورت لفظ ہو۔ وہ کبھی اس لفظ کے معنی نہیں سمجھ پائی تھی لیکن آج ہزاروں کی بھیڑ اور انقلاب کے نعروں میں وہ اس لفظ کی حقیقت محسوس کر رہی تھی۔

’ہاں اسٹوڈنٹ ہوں۔‘

’لیکن تمہارے پاس بینر نہیں ۔ویری بیڈ۔ بینر ہونے چاہئیں۔ میں ابھی دیتی ہوں۔‘

گل بانو نے زور سے کہا....’دو لائیے گا....‘

دو منٹ بعد ہی جینس والی لڑکی دو بینر لے کر آ گئی۔ ایک پر لکھا تھا...نو سائلنس۔نو وائلنس ۔ دوسرے پر لکھا تھا...اس لیے بولو کہ زندہ ہونے کا احساس



ہو۔ایک بینر گل بانو نے نظیرے کی طرف بڑھایا۔

’میرے لیے...آہ...زندگی کامیاب ہوگئی۔‘

گل بانو نے نظیرے کی آنکھوں کی نمی کو دیکھا اور اس سے پہلے کہ وہ اس نمی کے اندر خزاں موسم کو دریافت کر پاتی، ایک تیز لات اس کی پشت پر پڑی۔اس نے دیکھا ایک وردی والا سپاہی تھا۔ اس کی یونیفارم پر تمغے سجے تھے۔گل بانو لڑکھڑائی۔ وہ اس چہرے کی شناخت کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس کے فولادی ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی...سامنے والے پولیس افسر کا چہرہ سپاٹ تھا....

اس نے دریافت کیا...نام....؟

’گل بانو...‘

’اسٹوڈنٹ ہو.....؟‘

’اس کا قصور کیا ہے....‘ نظیرے نے گل بانو کا ہاتھ تھاما....گل بانو نے افسر کو دیکھا.... وہ پیچھے کی طرف جا رہا تھا۔ دوبارہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اس نے پولیس افسر کی تصویر اپنی آنکھوں میں سجا لی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔

نعرے لگانے والی لڑکیوں کی آواز میں جوش آ گیا تھا۔ہم کو چاہیے آزادی....

## (6)

اس سے پہلے کہ بینر اٹھا کر دوبارہ وہ آگے کی طرف بڑھتی، گل بانو کو احساس ہوا کہ اچانک کے حملے اور پشت پر بوٹ لگنے کے بعد اس کی تیسری آنکھ وا ہوئی ہے۔ اس تیسری آنکھ میں ایک بزرگ کے مشاہدے اور تجربوں کی جھریاں ہیں۔ اور جیسا کہ وہ پڑھ سکتی ہے، ان تمام بینروں کو جو طلبہ طالبات نے اٹھا رکھے ہیں اور ان کے عزم جواں ہیں، ایسے ہر بینر پر ایک بوٹ کی دھمک ہے...اور اس سے پہلے کہ اس پولیس افسر کو وہ دوبارہ تلاش کر سکتی، اس نے دیکھا، وہی جینس والی لڑکی بینر اٹھائے آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہی ہے...اس کی آنکھوں میں غصہ تھا، بلکہ گل بانو کو احساس ہوا کہ سامنے والی لڑکی نے ڈھیر سارا بارود اپنی آنکھوں میں جمع کر رکھا ہو۔لڑکی نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں کو چھوا...اس کی طرف دیکھا.... اس نے تمہیں بوٹ سے مارا...کیا اسے حق تھا؟ تم آرام سے کھڑی تھی...اور تم ہمارے احتجاج کا حصہ تھی۔اس نے بتایا کہ اس کا نام چندا یادو ہے، وہ یہیں پڑھتی ہے اور ملک بھر کا تعاون، دنیا بھر کی یونیورسٹی کا تعاون اب احتجاج کو حاصل ہے۔

اس نے پھر پوچھا۔تمہارا نام کیا ہے۔

’گل بانو...‘

’مجھے یقین ہے تم اسٹوڈنٹ نہیں ہو‘ چندا یادو نے پیار سے اس کی طرف



دیکھا...اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تمہارا تعلق یہاں کی کسی یونیورسٹی سے نہیں ہے۔‘

’میں......‘

اوہ..... چندا مسکرائی۔ یہ میرے لیے فخر کی بات ہے اور جب میں اپنے دوستوں کو بتاؤں گی تو انھیں بھی فخر ہوگا اور تمھیں احساس ہونا چاہیے کہ تم صحیح جگہ آئی ہو۔تم کیا کرتی ہو، یہ زیادہ معنی نہیں رکھتا۔تم کیا ہو یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ لیکن اس وقت اصل معاملہ یہ ہے اور مجھے نہیں معلوم کہ تمھیں یہاں آنے کی وجہ معلوم ہے یا نہیں....‘

’تھوڑا تھوڑا....‘

’تھوڑا تھوڑا سے بات نہیں بنے گی۔‘ چندا اسے ایک طرف ہجوم کے درمیان لے گئی۔ یہاں کچھ طالبات بیٹھی تھیں۔ چندا نے ان کے درمیان جگہ بنائی۔ پھر گل بانو کی طرف دیکھا۔خانہ بدوشوں نے ملک پر حملہ کر دیا ہے....اور تم سمجھ سکتی ہو اور میرے خیال سے اتنا تم جانتی ہوگی کہ اس وقت تم لوگوں کو اس ملک سے نکالنے کی بات چل رہی ہے۔در اصل یہ بی مشن کی سیاسی آخری بازی ہے کہ ملک نیلام ہونے کی حد کو پہنچ گیا ہے ۔ روزگار نہیں ہے۔ ایئر لائنس، ریلوے، ایئر پورٹ، لائف انشورنس، سب کچھ وہ بیچتے جا رہے ہیں۔کیونکہ معاشی سطح پر وہ سارا پیسہ اپنے بزنس مین دوستوں کے حوالے کر چکے ہیں اور ملک چلانے کے لیے ان کے پاس ایک ہی ہتھیار ہے اور وہ مذہب ہے۔آزادی کے بعد ان کا کھیل نہیں چلا۔ کیونکہ شروع میں ہی یہ احساس ہو چکا تھا کہ ان کے باطل نظریہ سے ملک ٹوٹ جائے گا اور اس لیے کچھ بڑے اور سمجھدار سیاستدانوں نے بھی بی مشن کے نظریات کی مخالفت کی اور کہا کہ ’یہ ملک سب کا ہے۔ہم اس ملک کو مخصوص مذہب کے سانچے میں فٹ نہیں کر سکتے‘ چندا رکی تو گل بانو نے حیرت سے چندا کو دیکھا۔اسے تعجب

تھا کہ اسٹوڈنٹ ایسے بھی ہوتے ہیں اور چندا یادو اپنے بارے اسے بتا رہی تھی کہ اس وقت خاص کر وہ پولیس والا اس کی نظروں میں دھوپ کی ملگجی کرنوں کی طرح آ گیا تھا۔

مخصوص نظریہ۔گل بانو نے مسکرا کر چندا یادو کو دیکھا... ہاں تو...تم کچھ بتا رہی تھی...؛

’ہاں...‘ چندا مسکرائی...ان کے پاس کوئی ایجنڈا نہیں تھا۔کوئی ایجنڈا تھا تو بس ایک۔ ڈیوائیڈ اینڈ رول۔ جو غلامی کے وقت ہوا تھا جب دو قومی نظریے نے اس ملک کو تقسیم کر دیا تھا۔مگر آزادی کے وقت کی صورتحال مختلف تھی۔ ہندوستان کی پیدائش میں جمہوریت کو دخل تھا... اور یہ ایک باطل نظریہ ایک باطل تہذیب کی پرورش کر رہے تھے اور اس لیے پہلے دن سے انھوں نے ہم میں اور تم میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی اور ملک کو وہاں لے گئے، جہاں دھوپ نہیں تھی، تعلیم نہیں، بیداری نہیں...اور جب انھیں احساس ہوا کہ ان کے مہروں نے کام کرنا بند کر دیا ہے اور تعلیمی سطح پر بیداری شروع ہو چکی ہے تو وہ ایک قانون لے کر آئے اور جیسا کہ وہ مسلسل بیانات دیتے رہے تھے کہ گھس پیٹھیوں کو.....تم سمجھ رہی ہو نا.....گھس پیٹھیے ... پہلے انھوں نے اس گھس پیٹھیے کا لفظ استعمال کیا۔ پھر وہ کھل کر قانون بنانے پر آ گئے۔اچھا مجھے بتاؤ، تمہارے پاس پاسپورٹ ہے، آدھار کارڈ ہے، ووٹر آئی ڈی ہے، پین کارڈ ہے تو کیا شہریت کے لیے کچھ اور رہ جاتا ہے۔؟ وہ منتخب ہو کر آئے ہیں اور ان شہریوں کی بدولت آئے ہیں جنھوں نے ان کو ووٹ دیا ہے اور اب وہ کہہ رہے ہیں کہ وہ شہری نہیں۔ خاص کر تم...ہمارے پاس اگر ہماری شناخت کے لیے کچھ بھی نہیں، تب بھی ہم گھس پیٹھیے نہیں ہوں گے۔مگر تمہارے لیے....گل بانو تمہارے لیے راستے بند ہوں گے۔ پہلے تمہاری شہریت جائے گی۔



پھر تمہاری ملکیت پر قبضہ ہوگا اور اس کے بعد تمھیں کسی ڈیٹنشن سینٹر میں مرنے کے لیے ڈال دیا جائے گا..تم سمجھ رہی ہو نا....لیکن گھبرانے کی بات نہیں ہے..‘

چندا یادو نے خوفزدہ ہو کر کہا...ادھر دیکھو... وہ آ رہے ہیں اور وہ بڑی تعداد میں ہیں...اور اس طرح آ رہے ہیں جیسے دشمن ملک پر حملے کا پروگرام ہو...اب اپنے لیے کوئی جگہ تلاش کر لو...میرا خیال ہے، کچھ برا ہونے جا رہا ہے...

گل بانو نے گولی چلنے کی آواز سنی...اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ حیوان نما چہرہ اسے دوسری بار نظر آیا۔گل بانو نے چیخ کر نظیرے سے کہا، وہ حملہ کرنے آ رہے ہیں، جیسے دشمنوں پر بمباری کی جاتی ہے...اس درمیان ذرا فاصلے پر آنسو گیس کا ایک گولہ گرا۔ پولیس والے لاٹھیاں چلا رہے تھے۔چیخیں گونج رہی تھیں۔ پھر اس نے یونیورسٹی کے گیٹ کو کھلتے ہوئے دیکھا....گل بانو کی آنکھوں کے آگے اندھیرا اتر رہا تھا۔ وہ گرنے کو ہوئی تو اس نے دیکھا کوئی اس کے پستان کو چھونے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ وہی پولیس والا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے دبوچ رکھا تھا اور اس کی سخت انگلیاں اس کے پستان سے ہو کر اس طرح گزر رہی تھیں، جیسے آتش فشاں کے دھماکے کے بعد شعلے سیال کی طرح باہر آتے ہیں۔ اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر اس وقت وہ دو سخت ہاتھوں کے درمیان تھی اور اس پر غشی طاری ہو رہی تھی۔

گل بانو کو احساس ہوا کہ ہاتھوں کی گرفت کمزور ہوئی اور وہ زمین پر پھسل کر گر پڑی۔اس کی آنکھوں میں نظیرے کا چہرہ چمکا، جس نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

’چاروں طرف دھواں ہے....اور کچھ بھی ہو سکتا ہے۔‘

گل بانو نے محسوس کیا، بھیڑ اس کے سامنے سے ہٹتی جا رہی ہے اور اس وقت

وہ دشمن فوج کے درمیان ہے اور وہ کسی اور ملک کی شہری ہے اور پولیس والے قیدیوں کی طرح احتجاج کرنے والوں کو ہانکتے ہوئے لے جا رہے ہیں۔نظیرے ہاتھ تھام کر گل بانو کو سرکنڈے کے پیچھے لے آیا... دھند چھٹ رہی تھی... دھواں بے اثر ہو رہا تھا... کچھ نوجوان حراست میں تھے۔ایک بڑی سی پولیس وین تھی، جس میں پولیس کے سپاہی جبراً مظاہرہ کرنے والوں کو ڈیٹین کر رہے تھے۔

'میں محافظوں سے بات کرتا ہوں۔' نظیرے نے کہا۔ باہر نکلنا دشوار ہے۔'

'کون محافظ... یہ پولیس دستہ.... یہ محافظ نہیں ہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔'

سرکنڈوں کے پیچھے چھپتے ہوئے گل بانو نے دیکھا، ایک سنکرا سا راستہ ہے جو آگے جا کر یقیناً سڑک سے مل جائے گا۔ وہ نظیرے کے ساتھ اس راستے پر چل پڑی۔ پولیس وین کے ہارن گونج رہے تھے۔نظیرا چپ تھا۔گل بانو محسوس کرتی ہے کہ یہ ایک بے حد خاص دن ہے اس کے لیے۔اس کا پاؤں ایک گڈھے میں پڑا، لیکن وہ سنبھل گئی۔اس نے نظیرے سے صرف اتنا پوچھا...

'تم اس پولیس والے کو جانتے ہو....'

'نہیں۔'

'اس کے بارے میں معلوم کرو۔'

اس کے بعد کا راستہ دونوں نے خاموشی سے طے کیا۔

●●

اماں نور جہاں پریشان تھیں کہ نظیرے، گل بانو کو کہاں لے گیا۔کئی بار فون کرنے کے باوجود بھی جب دونوں نے فون نہیں اٹھایا تو اماں نور جہاں کی پریشانی بڑھ گئی، شام کے ۷ بجے نظیرے کے ساتھ گل بانو نے گھر میں قدم رکھا۔اس نے اماں نور جہاں کی طرف دیکھا ہی نہیں سیدھے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔



دروازہ کی سٹکنی لگائی اور خود کو آئینہ کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں انگارے تھے اور پھر ایک ایک کر کے اس نے سارے کپڑے اتار دیے... اس نے دیکھا، پستانوں کے پاس سرخ لکیریں موجود تھیں اور ان سے تیزاب کی دھار پھوٹ رہی تھی۔اس پولیس والے نے ٹھیک اسی جگہ ہاتھ رکھا تھا، جب دھویں سے اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ یہ پستان اسے کاٹ دینے چاہئیں۔اس کی آنکھوں میں نفرت سے زیادہ غصہ کی آندھی چل رہی تھی اور وہ اس آندھی میں خود کو اڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ پھر ایک ایک منظر اس کی آنکھوں کے آگے دوڑنے لگے... دشمنوں کی طرح پولیس کا حملہ...حق کی آواز کو دبانے کی کوشش اور اس کی پستانوں میں الجھی سخت انگلیاں...گو یہ اس کے لیے نئی بات نہیں تھی۔اس کا پیشہ ایسا تھا۔مگر اس کی مرضی کے بغیر...؟ وہ سانپ کے جسم کی طرح سخت ان انگلیوں کو کاٹ کر پھینک دینا چاہتی تھی مگر ابھی مجبور تھی...اس کی آنکھوں میں چندا یادو کا چہرہ لہرایا۔ وہ بستر پر ننگے جسم کے ساتھ بیٹھ گئی۔ پھر اٹھ کر لباس تبدیل کیا۔دروازہ کھولا... اور سرعت سے باہر نکلی۔ اماں اور نظیرے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔اس نے اماں کو جانے کا اشارہ کیا...اس نے نظیرے کی طرف دیکھا اور اس وقت اس کے چہرے پر بہت سے بچھو لپٹے ہوئے دکھائی دیے، جو مسلسل اپنے ڈنک سے نظیرے کو لہولہان کر رہے تھے۔گل بانو نے اضطرابی کیفیت میں کہا...

'نظیرے....'

'ہاں بے بی...'

'کچھ سناؤ...کوئی غزل...'

'غزل....؟'

'غزل...لیکن تمہیں کیوں یاد ہوگی...'

'میں غزلوں کا عاشق ہوں بے بی... میں بھی کتابیں پڑھتا ہوں۔'

گل بانو نے اس بار چونک کر نظیرے کو دیکھا، جیسے نظیرے کی جگہ وہ کسی آٹھویں عجوبے کو دیکھ رہی ہو۔

'تم اور غزل.....؟'

'کیوں نہیں بے بی... وقت ملتا ہے تو ناول بھی پڑھتا ہوں۔؟'

'تم اور ناول....؟' گل بانو اپنی جگہ سے اچھلی لیکن یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ کیا کوئی سوچ سکتا ہے کہ ان محلات میں جینے والے لفظوں سے بھی دوستی کر سکتے ہیں.... اس نے دوبارہ نظیرے کو دیکھا۔ بچھو چہرے سے الگ ہو چکے تھے اور اب اس کی جگہ اس کے چہرے پر ایسا نور آ گیا تھا، جس کی اسے کوئی توقع نہ تھی... مگر یہ نور تھا جو نظیرے کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔

'پھر کوئی ایسی غزل سناؤ جو...' گل بانو کہتی ہوئی ٹھہری...' میرے اندر اس وقت آگ لگی ہے نظیرے، مجھے اس آگ سے باہر نکالو۔ میں بھسم ہو جاؤں گی.... نغمہ چھیڑو... جو میری روح میں اتر جائے... میری بے چینیوں کا مداوا بن جائے...'

'مجھے گانا نہیں آتا بے بی...'

گانے کو کون بول رہا ہے کمبخت... نغمہ... نغمہ کے لیے خوش لحن کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایسا نغمہ جو برچھی کی طرح سینے میں اتر جائے اور اس آگ کو کاٹ سکے جو اس وقت میرے اندر بھڑک رہی ہے...'

'سنو بے بی...' نظیرے نے آنکھیں بند کیں....

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے



ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا
میں بھی خائف نہیں تختۂ دار سے
میں بھی منصور ہوں کہہ دو اغیار سے
کیوں ڈراتے ہو زنداں کی دیوار سے
ظلم کی بات کو جہل کی رات کو
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا
پھول شاخوں پہ کھلنے لگے تم کہو
جام رندوں کو ملنے لگے تم کہو
چاک سینوں کے سلنے لگے تم کہو
اس کھلے جھوٹ کو ذہن کی لوٹ کو
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا

گل بانو نے گنگنایا.... ایسے دستور کو، صبح بے نور کو میں نہیں مانتا... رک کیوں گئے نظیرے.... روح چھلنی ہے... جسم بے چین... شرارے باہر آ رہے ہیں... کوئی آتش فشاں ہے جو دستک دے رہا ہے... آگے نظیرے... اور اس سے آگے....

نظیرے نے آنکھیں بند کیں....

تم نے لوٹا ہے صدیوں ہمارا سکوں
اب نہ ہم پر چلے گا تمہارا فسوں
چارہ گر دردمندوں کے بنتے ہو کیوں
تم نہیں چارہ گر کوئی مانے مگر
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا

گل بانو نے آنکھیں کھولیں...تم نے لوٹا ہے صدیوں ہمارا لہو...نظیرے....
بے چینی تو اور بڑھ گئی...کون ہے یہ... یہ کیا سنا دیا نظیرے....

’حبیب جالب...‘ نظیرے نے آہستہ سے کہا.... تقسیم کی شدت نے سرحدیں توڑ دیں...حبیب نے یہ گیت اپنے ملک میں گایا اور اب یہ ہمارے ملک کا نغمہ بن گیا ہے....

’یہ آزادی کا نغمہ ہے نظیرے.... یہ ساری دنیا کا نغمہ ہے...‘ گل بانو کو احساس ہوا، اس کی تکلیف کی شدت میں اچانک کمی آ گئی ہو۔ اس نے آہستہ سے گنگنایا۔ ایسے دستور کو، صبح بے نور کو... پھر پلٹ کر نظیرے کی طرف دیکھا۔

’کیا میں ہوں...؟ میرا وجود... نہیں، مجھے اس طرح دیکھنے کی ضرورت نہیں نظیرے.... کیا میری کوئی زمین ہے؟ کوئی جگہ.... یا میں نہیں ہوں... جیسا کہا جا رہا ہے...تم سن رہے ہو نا....‘

’ہم ہیں...‘

اس نے آواز سنی جیسے کسی گہرے کنویں سے کوئی چیخ بلند ہوئی ہو....

’مگر ہم کہاں ہیں نظیرے... کچھ لوگ...‘ گل بانو کو محسوس ہوا کہ اس کے الفاظ اس کے اندر ہی گھٹ رہے ہیں.... وہاں سے آنے کے بعد محسوس کر رہی ہوں کہ.... میرے پاؤں کے نیچے زمین نہیں اور یہ چہرہ میرا چہرہ نہیں۔ میرے ہاتھوں نے کام کرنا بند کر دیا ہے....اور میرے پاؤں چلنے سے محروم ہو گئے ہیں... خانہ بدوش...‘

’وہ آ چکے ہیں.... وہ تمہاری زمین پر اپنی چراگاہ بنا لیں گے۔ تم جانوروں کے ریوڑوں کی طرح....‘ نظیرے کے موبائل کی گھنٹی بجی...اس کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا۔ اس نے او کے کہا اور فون رکھ دیا...



’ایک آسامی کسٹمر ہے۔ نیرج گگوئی۔ بزنس مین ہے۔ وہ رات گیارہ بجے آئے گا۔ بہتر ہے کہ ہم اپنی دنیا میں واپس چلیں۔ اگر چل سکتے ہوں...‘

’آسامی...؟‘ گل بانو نے لمبی سانس لی...بہتر ہے... میں تیار ہوتی ہوں۔ گیارہ بجنے میں زیادہ وقت نہیں ہے۔ ٹھیک ہے نظیرے۔ اب تم جاؤ۔ میں کل ملتی ہوں....

نظیرے کے جانے بعد چندا یادو کا چہرہ دوبارہ اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ کچھ دیر تک وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھی رہی۔ پھر ٹی وی بند کر دیا...اب گل بانو کو آسامی کسٹمر کا انتظار تھا....

## (7)

سب کچھ ویسا نہیں ہے،
جیسا ایک اندھیری رات میں ہوتا ہے
جب ہم سوئے رہتے ہیں
آرام سے اپنے گھروں میں
کچھ لوگ اس وقت بھی
نیند میں چلتے ہوئے ہمیں ہلاک کرنے آجاتے ہیں...

گل بانو نے جو تفصیلات اکٹھا کی تھیں، اب وہ ان سے خوف محسوس کررہی تھی۔اس نے یونیورسٹی کے بارے میں تمام اطلاعات کا جائزہ لیا۔جس وقت وہ آنسو گیس کے دھواں سے گر پڑی تھی، پولیس نے یونیورسٹی کے اندر داخلہ لے لیا تھا۔ پہلے پولیس لائبریری کے اندر گئی۔ وہاں ایک نابینا شخص تھا، جس کو پولیس نے بندوق کے کنڈے سے مارا اور وہ زخمی ہوکر بیہوش ہوگیا۔ پھر پولیس نے وہاں موجود نوجوانوں کو ایک قطار میں ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہونے کے لیے کہا اور انھیں بندوق کی نوک پر آگے بڑھنے کے لیے کہا۔ دوسری طرف پولیس اور کچھ سپاہی عورتوں کے ٹائلٹ میں داخل ہوگئے۔ پولیس کے ایک جتھے نے گرلس ہوسٹل پر



دھاوا بولا....ٹی وی چینلز پر اینکر نفرت کی بارش کررہے تھے۔گل بانو نے پھر چندا یادو کو یاد کیا، جس نے کہا تھا کہ ہم لڑیں گے اور آخری سانس تک۔ وہ چندا یادو سے دوبارہ ملنے کی خواہش مند تھی۔

...اور اسی لیے جب گیارہ بجے بیل بجی اور اس نے دروازے پر نیرج گگوئی کو دیکھا تو اس کے چہرے پر پُراسرار مسکراہٹ تیر گئی۔اماں نور جہاں نے استقبال کیا۔گل بانو کسٹمر کو لے کر اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ دروازہ بند کیا....اور نیرج گگوئی کو غور سے دیکھا۔ وہ پستہ قد تھا۔ رنگ سانولا۔ بال گھنگریالے اور سیاہ۔ مونچھیں چھوٹی۔ چہرے پر ایک باغی رنگ....اور اس نے محسوس کیا، کسٹمر کی آنکھوں میں اسے دیکھنے کے باوجود بھی کہیں کسی خوشی کا اظہار نہیں ہے بلکہ وہ ایک روبوٹ کی طرح صرف جسم کی مانگ کو پورا کرنے کے لیے اس کے پاس آیا ہے...گل بانو نے اسی کشمکش کے عالم میں اس سے پوچھا....

'کیا تم مجھے دیکھ سکتے ہو.....؟'

'کیوں...؟'

'کیا میرے ہاتھ ہیں....؟'

'ہاں..'

'اور پاؤں....'

'پاؤں بھی ہیں..'

'اور میں نظر بھی آرہی ہوں...؟'

'ہاں یہ سچ ہے....'

گل بانو کو محسوس ہوا کہ ہندی الفاظ کی ادائیگی میں اسے پریشانی ہورہی ہے۔ یقیناً اسے اسمیا زبان میں آسانی ہوتی۔مگر وہاں کے لوگ ہندی بھی جانتے ہیں،

بس ان کا لہجہ دور سے پہچانا جاتا ہے۔اس بار نیرج نے گل بانو کا ہاتھ تھام کر اسے اپنی طرف کھینچا، یہ اس کی طرف سے محبت کا آغاز تھا اور اس نے گل بانو کو اپنی گود میں بٹھا لیا...

'ابھی ساری رات ہے...'

'ہاں...'

'پھر کچھ باتیں کرتے ہیں....دروازہ کھول دو۔ مجھے بند دروازے سے گھٹن ہوتی ہے۔'

نیرج کے کہنے پر گل بانو نے دروازہ کھول دیا....اس نے ذہن میں اس کسٹمر کو لے کر بہت سے سوال تھے اور جیسا کہ چندا نے بتایا تھا کہ اس شہریت معاملے کی شروعات ہی آسام سے ہوئی مگر گل بانو کو یہ معلوم نہیں تھا کہ نیرج کے سوچنے کی سطح کیا ہے یا نیرج کس پارٹی سے زیادہ تعلق رکھتا ہے مگر گل بانو مطمئن تھی کہ آج اس کو، اس کے بہت سارے سوالوں کے جواب مل سکتے ہیں، لیکن یہ پتہ لگانا ضروری ہے کہ آخر یہ اسامی کس خیال کا آدمی ہے۔ نیرج نے پیار سے اس کے ہونٹوں کو چوما اور ایک طرف پھیل کر بستر پر بیٹھ گیا۔

'تم نے کیوں پوچھا....کہ تم نظر آ رہی ہو یا نہیں....؟'

'سٹیزن....' گل بانو نے ٹھہر کر اس کے چہرے کا جائزہ لیا....

نیرج گگوئی کھلکھلا کر ہنسا۔ پھر سنجیدہ ہو گیا۔گل بانو نے محسوس کیا کہ اس کے اندر ایک جنگ چل رہی ہے۔ پھر نیرج نے آہستہ آہستہ بتانا شروع کیا۔اس وقت وہ آسام میں تھا اور اس کے آدمی کے ساتھ تھا، جس نے پہلی بار آسام میں یہ مہم شروع کی تھی اور اب اس کا خیال ہے کہ اس نے پاگل پن میں اپنی ساری زندگی برباد کر دی۔



نیرج بستر سے اٹھا اور ٹہلتے ہوئے اس نے بتایا، وہ ایک صحافی تھا۔آسام اسٹوڈنٹ یونین سے وابستہ۔اس نے آسام کے گھس پیٹھیوں کو نکالنے کی بڑی مہم شروع کی۔لیکن اسے اس بات کا پتہ نہیں تھا کہ وہ گھس پیٹھیوں کے نام پر جن کو ملک سے نکالنا چاہتا ہے، وہ لوگ کون ہیں؟ اور انھیں کس طرح نکالا جا سکتا ہے۔ ۱۹۷۹ سے ان کی تحریک شروع ہوئی۔۱۹۸۵ میں وہ صحافی آسام حکومت کا حصہ تھا۔ پھر وقت گزرتا چلا گیا۔آسام کے لوگ گھٹن کا شکار ہونے لگے۔اس درمیان انہیں سمجھایا گیا کہ گھس پیٹھیوں کو نکالنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ ان کی شہریت کی جانچ کی جائے....شہریت....

نیرج گگوئی نے قہقہہ لگایا....گل بانو کو اس کی ہنسنے کا انداز پسند نہیں آیا۔مگر وہ نیرج گگوئی کی باتیں غور سے سن رہی تھی۔ نیرج کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا۔ پھر اس نے بتایا۔ یہ آئیڈیا ہمارے اس صحافی کو اچھا لگا۔شہریت کا ڈرافٹ تیار ہوا تو خود میرے گھر والوں کے نام اور پتے غلط تھے۔میرے ساتھ کئی لوگوں کے نام اور پتے بھی صحیح نہیں تھے۔ جو تحریک چلا رہے تھے، وہ بھی مجبور تھے اور شہریت کی زد پر تھے۔ پھر برسوں کاغذوں کو جمع کرنے اور ویری فکیشن میں گزر گیا۔ایک ایک کاغذ کو بھرنے کے لیے آسام جیسے پاگل ہو گیا تھا، ایک ریاست سے دوسری ریاست تک دوڑ بھاگ جاری تھی۔کسی کے دادا، ۱۹۷۱ سے پہلے بنگال میں تھے تو پہلے بنگال جاتے، وہاں سے سرٹی فکیٹ لاتے۔ لاکھوں روپے خرچ کرنے کے بعد بھی فارم کو بھرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ کچھ لوگوں نے دباؤ میں خودکشی کر لی۔کئی لوگ قطار میں مر گئے۔میرا باپ بھی اس قطار میں تھا۔آج وہ نہیں ہے....

نیرج گگوئی نے گل بانو کی طرف دیکھا۔ بہت تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ حاصل کچھ نہیں ہوا۔میرے دوست صحافی اور مجھے بھی نہیں پتہ تھا کہ یہ مسئلہ انسانیت سے

جڑا مسئلہ بھی ہے۔ کیا ہم اتنے لوگوں کو بنگلہ دیش یا افغانستان بھیج سکیں گے؟ جیل میں رکھیں گے؟ کسی ڈیٹنشن کیمپ میں...؟ یا سمندر میں پھینک دیں گے... یا سب کو پرمٹ دیں گے... دراصل حکومت ہمیں ایک دوسرے سے کاٹ رہی ہے... اور یہ اچھا نہیں ہے.... آسام چھوڑو... کیا یہ طریقہ پورے ہندوستان میں رائج ہوسکتا ہے....؟ اس کے بعد اس نے آسامی میں کچھ کہا، جسے گل بانو سمجھ نہیں سکی۔ صرف اتنا اندازہ لگا سکی کہ اس نے اندر پوشیدہ نفرت کا اظہار کیا ہے۔

'ایک دن وہ ہمیں شودر بنا دیں گے۔ ایک دن یہاں صرف برہمن رہ جائیں گے..'

ایک چھپکلی تھی جو دیوار پر رقص دکھا رہی.... گل بانو نے کچھ نہیں سنا وہ مسلسل چھپکلی کو دیکھ رہی تھی... سفید دیوار پر رینگتی ہوئی چھپکلی، مگر سوال تھا، یہ چھپکلی کہاں سے آئی۔ وہ خوفزدہ تھی۔ اس نے نیرج سے اپنے ہاتھ کو علیحدہ کیا اور سرعت سے اچھلی۔ اچھلنے کے ساتھ ہی وہ میز سے ٹکرائی اور میز پر رکھا ہوا شیشے کا گلاس زمین پر آ گیا۔ زمین پر گلاس کے ٹکڑے بکھر گئے مگر ان بکھرے ٹکڑوں کو نظر انداز کرتے ہوئے گل بانو مسلسل چھپکلی کو دیکھ رہی تھی اور شاید چھپکلی نے بھی انسانی آنکھوں کی موجودگی کو محسوس کرلیا تھا وہ دیوار سے چپک گئی تھی مگر اس کا سر والا حصہ محتاط تھا اور اس کی آنکھیں بغور گل بانو کی حرکت کا جائزہ لے رہی تھیں۔ آیا وہ کیا کرنے والی ہے، یا اس کی طرف بڑھنے والی ہے یا اس کا شکار کرنے والی ہے۔ نیرج گگوئی حیرت سے گل بانو کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس وقت اس کی آنکھوں میں گل بانو کے لیے بے پناہ پیار سمٹ آیا تھا اور گل بانو اس سے بے فکر، سہمی ہوئی اب بھی ٹکٹکی لگائے چھپکلی کو دیکھ رہی تھی...

'کیا ہوا...'



'کچھ نہیں....'

'ہاتھی ہے.....؟'

'نہیں۔'

'شیر ہے....؟' نیرج گگوئی بیہودہ انداز میں ہنسا۔

'نہیں چھپکلی....'

'خوفزدہ ہو؟'

'ہاں۔'

'چھپکلی سے..'

'ہاں.... مگر یہ یہاں کیسے آئی... پہلے اس گھر میں نہیں تھی۔ کبھی نہیں تھی۔' گل بانو نے رُک رُک کر کہا اور اسے نیرج گگوئی کی سرد آواز سننے کو ملی... بہت کچھ پہلے نہیں تھا.... بہت کچھ... مگر اب...'

'پہلے چھپکلی نہیں تھی.....'

'مگر اب ہے.... آہ..' نیرج کی ڈوبتی ہوئی آواز نے اسے جگایا... پہلے ہم تھے۔ اب نہیں ہیں۔ پہلے وہ نہیں تھے۔ اب وہ ہیں...'

پہلے چھپکلی نہیں تھی۔ وہ زور سے چیخی.... میں اسے ماردوں گی....

'تم نہیں مارو گی...'

'میں اس سے ڈرتی ہوں..'

'اس لیے نہیں مارو گی۔'

'میں اپنے ڈر کو بھگانے کے لیے ماروں گی...'

'تم ایسا نہیں کرسکتی.... وہ غائب ہوجائے گی۔ مگر اس کمرے میں موجود رہے گی... وہ دوبارہ دیوار پر نظر آئے گی..'

'پھر.....؟'

'اب وہ آچکی ہے تو رہے گی اور کہیں نہیں جائے گی..''

'پھر...'

'دروازہ بند کردو۔ مجھے صبح نکلنا ہے۔ تب تک..'

'لیکن اس چھپکلی کی موجودگی میں....'

'اس چھپکلی کی موجودگی میں ہم جینا تو نہیں چھوڑ سکتے۔'

چھپکلی نے دیوار چھوڑ دیا۔ دھم سے زمین پر گری اور سرسراتی ہوئی غائب ہوگئی.....

'اب وہ نہیں ہے....' گل بانو نے آہستہ سے کہا.....

'مگر وہ ہے.....اور اس بات کو تم بھی جانتی ہو....'

'ہاں میں جانتی ہوں۔'

گل بانو نے روشنی گل کردی...ایک چھپکلی بستر پر تھی مگر اس کا جسم ابھی سناٹے میں تھا۔



## (8)

اماں نور جہاں نے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ تمہیں ان باتوں سے غرض نہیں ہونی چاہیے کہ زمانہ کون سی چال چل رہا ہے۔ گل بانو کو اماں پر ترس آیا کہ وہ جلتے ہوئے الاؤ کے درمیان بھی خود سپردگی پر یقین رکھتی ہیں اور ایسا کیسے ممکن ہے کہ جب تمام کھڑکیوں کی سلاخوں کو بند کردیا جائے تو اماں محفوظ ہوکر آزادی کا جشن منائیں۔ اسے صحن میں چلتے ہوئے فوجی نظر آئے۔ اور دوبارہ چھپکلی ڈرائنگ روم کی دیواروں پر فاتح انداز سے چڑھائی کرتی نظر آئی۔

رات ہوگئی تھی مگر گل بانو کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔

وہ کروٹ بدلتی ہے تو جسم میں انگاروں کے ساتھ، پستانوں سے آگ نکلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ گل بانو دوبارہ زرد آندھیوں کو دیکھتی ہے اور اچانک محسوس کرتی ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے ہزاروں جنگلی کیڑوں کے درمیان ہے اور یہ جنگلی کیڑے اس کے جسم کے چاروں طرف پھیل گئے ہیں اور جب رات کی سیاہ چادر آسمان پر پھیل گئی تھی اور دیر تک، اور دور تک اجالا ہونے کا نام ونشان نہیں تھا، شیشے کی کھڑکی سے وہ اس آدمی کو دیکھتی ہے جس کے تمغوں سے خون نکل رہا تھا اور جس کے ہاتھ اس کے پستانوں کو چھو رہے تھے۔ بیدار رہتے ہوئے اور نیند میں ہر بار وہ اس آدمی کو دیکھ کر انتقام کی بھٹیوں سے گزری تھی اور گل بانو کو احساس تھا، اس

باوردی بے رحم پولیس والے کے لیے اس کے اندر کی نفرت میں اضافہ ہوتا جا رہا
ہے۔ کھڑکی کے باہر سیاہ رات تیز ہواؤں کی طرح بہہ رہی تھی اور اسے حیرت تھی
کہ رات بہہ کیوں رہی ہے۔؟ دراصل اس کا وجود اس رات کا حصہ تھا اور رات
کے ساتھ بہتی ہوئی ہواؤں میں وہ ایسے مل گئی تھی یا جذب ہوگئی تھی کہ وہ خود بہہ رہی
تھی اور اسے اس وقت کسی قرار کی ضرورت نہیں تھی، جیسے وہ چاہتی ہے کہ جنگلی
کیڑے اسے اس قدر ڈنک ماریں کہ اس کا سارا جسم زہریلا ہوجائے۔ وہ دوبارہ
بستر پر لیٹی اور اسی وقت چونکی جب اس نے احساس کیا کہ ایک وردی والا للّی پٹ
ہے جو اس کے پستان پر کھڑا ہے اور اس سے مخاطب ہے کہ اس کی ملاقات جلد
ہوگی۔ وہ اس وردی والے کو للّی پٹ کی شکل میں ہی دیکھنا چاہتی تھی اور خوش تھی کہ
اس نے ایک تگڑے بے رحم انسان کو اس وقت رات کے اندھیرے میں للّی پٹیٹن
بنادیا ہے۔ ہوا تیز ہوگئی تھی، کیونکہ گل بانو کو احساس تھا کہ باہر درخت ہل رہے
ہیں اور اندر پردوں، دروازے اور کھڑکیوں میں ہلچل ہے اور ایک ہلچل اس کے
اندر ہے جس سے وہ جلد از جلد نجات پانا چاہتی ہے۔

دوسرے دن صبح آٹھ بجے نظیرے آ گیا۔ نظیرے آج گرے سوٹ میں تھا اور
دوسرے دنوں کی بہ نسبت آج اس کے چہرے پر نور نظر آ رہا تھا۔ اس کا سانولہ پن
بہت حد تک غائب تھا اور اس کی آنکھوں میں کسی میمنے جیسی مسکراہٹ تھی۔ کچھ دیر
تک نظیرے اماں سے بات کرتا رہا۔ اس نے سنا اماں کہہ رہی تھیں....

’مجھے معلوم ہے.... مگر تم جانتے ہونا کہ ہمارا پیشہ کیا ہے....‘

’معلوم ہے...‘

’معلوم ہے تو بے بی کو کیوں لے کر گئے؟‘



نظیرے کرسی پر بیٹھا بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ بے بی کے ساتھ میں بھی ایک نئی دنیا
دیکھنا چاہتا تھا۔

’کیا اس دنیا کو دیکھنے کی ضرورت تھی نظیرے؟‘

’ہاں خالہ...‘

’تم جانتے ہونا ہمارا پیشہ....‘

اس بار گل بانو نے نظیرے کی آواز کو سخت محسوس ہوا۔ یقیناً اس کے جبڑے
کھلے تھے اور اس نے لمبی سانس بھری ہوگی اور اماں کی طرف دیکھا ہوگا۔ وہ جہاں
کھڑی تھی، وہاں سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا مگر گل بانو اس مقام سے دونوں کی
باتیں سن سکتی تھی۔

’ہمیشہ۔‘ نظیرے نے کہا...’اس پیشے کے لوگ جنت میں جائیں گے۔‘

’کیسے؟‘

’کیونکہ اس پیشے میں سب سے معصوم لوگ رہتے ہیں جو دنیا کی دوزخ کو
نہیں جانتے...اور جو یہ دوزخ پالتے ہیں، اسے اپنے جسموں میں لے آتے ہیں...
پان کھاؤ گی خالہ....‘

’نہیں رے.... رہنے دے...مگر بے بی ان باتوں کے لیے بہت چھوٹی
ہے۔...‘

’انقلاب کے لیے عمر نہیں ہوتی۔‘

’انقلاب...‘ اماں نور جہاں نے غصہ سے کہا۔ تو پاگل ہوا ہے اور بے بی کو
پاگل بنا رہا ہے۔...‘

’انقلاب سب کا حصہ ہے اماں...میرا بھی۔‘

’تو تو دلاّ ہے...‘

’اس لیے میرا حصہ زیادہ ہے۔‘

گل بانو کو یقین ہے کہ اس بار، نظیرے کے اس جملے پر اماں نے یقیناً غور سے اس بادشاہ کی طرف دیکھا ہوگا اور اس وقت نظیرا اس کے لیے بے تاج بادشاہ کی طرح تھا، جو اماں کی تمام باتوں کا مناسب جواب دے سکتا تھا۔

’آج تیری باتیں سمجھ سے پرے ہیں نظیرے۔‘

اس کی وجہ ہے اماں کہ تم نے کبھی کھڑکی سے باہر نہیں دیکھا.... وہاں بھی نہیں یہاں بھی نہیں اور جو کچھ تمہیں ملا وہ تمھیں نصیب سے ملا۔

’ہاں یہ تو ہے... نصیب... مگر.. کھڑکی کے باہر...‘

’کھڑکی کی سلاخیں گرم ہیں اور باہر ایک دنیا ہے جو سلگ رہی ہے۔‘

’اس دنیا سے ہمیں کیا کام....؟‘

’جب آگ پھیلے گی خالہ تو وہ تمہارے گھر بھی آئے گی۔‘

اس دفعہ اماں نور جہاں نے سہمے انداز سے نظیرے کو دیکھا۔....

’ایسے مقامات پر آگ کا کیا کام....؟‘

’آگ تو پھیل چکی ہے اماں....‘

’ہاں، آگ پھیل چکی ہے۔‘

اماں نور جہاں نے نظیرے کی بات سن کر گل بانو کو آواز لگائی اور نظیرے کے پاس سے اٹھ کر، اندر کمرے کی طرف چلی گئی۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گل بانو نظیرے کے پاس آ گئی۔

’تو آگ پھیل چکی ہے...‘

’ہاں... کیونکہ اس وقت زمین جل رہی ہے...‘

’خبریں سن رہی ہوں.... زمین سلگ رہی ہے.... اسٹوڈنٹ اور انقلاب.....‘



گل بانو نے پراسرار نگاہوں سے نظیرے کی طرف دیکھا..’اور نظیرے کیا تمہیں اس دن وہ پولیس والا یاد ہے....‘

’ہاں اسے نہیں بھول سکتا۔‘

’بھولنا بھی نہیں چاہیے....‘ گل بانو کچھ سوچ رہی تھی... اور وہ لڑکی چندا یادو....؟

’ہاں....‘

’میں آج چندا یادو سے دوبارہ ملنا چاہتی ہوں... میں نے سنا ہے انقلاب زندہ ہے اور اب بھی وہاں لڑکے لڑکیاں موجود ہیں۔ ممکن ہے اس بھیڑ میں چندا یادو سے ملاقات ہو جائے۔‘

’میں چلوں گا بے بی۔‘

’نہیں تمہیں جانے کی ضرورت نہیں نظیرے، آج میں اکیلی جاؤں گی۔‘

نظیرے نے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

گیارہ بجے تک گل بانو تیار تھی۔ اس نے جینس اور کرتا پہنا۔ خود کو آئینہ میں دیکھا۔ اب وہ بہت حد تک چندا یادو سے مشابہ تھی۔ پورٹیکو سے گاڑی نکالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی، اس علاقے میں دور تک گاڑی پارک کرنا آسان نہیں ہوگا۔ باہر آ کر اس نے آٹو لیا اور آٹو میں بیٹھتے ہوئے اس نے آس پاس کا جائزہ لیا۔

دلّی کے موسم میں صبح سویرے گرد چھائی رہتی ہے اور کبھی کبھی گرد و غبار کا یہ طوفان اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ سڑک پر نکلنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس وقت ایسا کچھ نہیں تھا۔ سڑک پر ہلچل تھی۔ ٹریفک کا شور تھا۔ پیدل چلنے والوں کی قطار

تھی۔ بھاگتی ہوئی گاڑیاں تھیں۔ آٹو والے نے کچھ فاصلے پر اسے چھوڑ دیا۔ پولیس کئی مقام پر اونگھتی ہوئی نظر آئی۔ دور پر ایک پولیس وین بھی نظر آئی۔ بہت سارے نوجوان تیاریوں کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے نظر آئے۔ ان کے پاس تھیلے تھے اور یقیناً تھیلوں میں یا تو کھانے کے سامان ہوں گے یا سڑک پر بچھانے کے، یہ گل بانو نے قیاس لگایا کیونکہ ایسے مناظر وہ ٹی وی پر دیکھ چکی تھی۔ دو قدم چلنے کے بعد اسے لاؤڈسپیکر پر کسی کے بولنے کی آواز سنائی پڑی۔ اس آواز میں کچھ خاص تھا تو آزادی کے لفظ تھے اور یہ لفظ اب بار بار سنائی دے رہا تھا۔ سترہ برس کی چھوٹی سی زندگی میں گل بانو کے لیے یہ سوچنا مشکل تھا کہ آزاد ملک میں بھی آزادی کی بات دہرائی جاسکتی ہے۔ وہ آگے بڑھی اور اب وہ ان لوگوں تک پہنچ چکی تھی۔ زمین پر الگ الگ لڑکے لڑکیوں نے چادر، کمبل، لحاف تک بچھا رکھے تھے۔ سردی تھی مگر نوجوانوں کے اندر انقلاب کی چمک کے سامنے یہ سردی کچھ نہیں تھی۔ ایک لڑکی نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پانی کی بوتل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا... نام؟ گل بانو نے مسکراتے ہوئے نام بتایا پھر آگے بڑھ گئی۔ اس کی آنکھیں چاروں طرف چندا یادو کو کھوج رہی تھیں اسے شک بھی تھا کہ آخر وہ کیوں ملے گی۔ اسے کچھ اور کام بھی تو ہوسکتا ہے۔ مگر وہ اس وقت حیرت میں پڑ گئی جب دو چار لڑکیوں کے ساتھ اس نے چندا کو دیکھا۔ وہ عام جینس اور کرتے میں تھی۔ اس کے ہاتھوں میں کچھ کاغذات تھے۔ گل بانو تیزی سے آگے بڑھی۔ اس درمیان چندا اسے دیکھ چکی تھی اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ تھی۔

'تم....' چندا نے شکایتاً پوچھا۔ اس دن کے بعد آئی کیوں نہیں۔؟

'مجھے لگا آپ نہیں ملیں گی۔'

'جب تک یہ ملک ہمیں اجنبی بنانا نہیں چھوڑتا ہم آتے رہیں گے اور حق کے



لیے لڑتے رہیں گے....'

'صرف اجنبی.....؟'

'نہیں۔ نفرت کی سلاخیں۔ ان سلاخوں کو توڑنا ہے اور بھی بہت کام ہیں۔'

'ہاں بہت کام ہیں۔' گل بانو نے دہرایا.... آپ روز آتی ہیں۔

'ہاں..... کیوں...؟'

'کیا کوئی فائدہ ہوا...؟'

چندا نے چونک کر دیکھا گل بانو کو۔ 'مسکرائی.... یہ جنگ فائدہ نقصان کے لیے نہیں۔ یہ جنگ ہماری ہے کہ ہم سب ایک ہیں۔ ہمیں خانوں میں تقسیم مت کرو...'

چندا کو کچھ یاد آیا... اس دن تمہیں یاد ہے۔'

'ہاں آنسو گیس.... اور اس کے بعد....'

'تمہاری کچھ تصویریں ہیں...'

'تصویریں....'

'جب پولیس نے حملہ کیا، ہمارے کچھ دوست تصویریں لے رہے تھے اور کچھ ویڈیو بنا رہے تھے۔'

'اندھیرے میں اور آنسو گیس کے حملے میں...؟'

'ہاں چیلنج تو یہی ہے....' چندا نے مسکرا کر کسی کو آواز دی... راجیش، ذرا وہ البم لانا....

ایک پچیس برس کا نوجوان تیزی سے چلتا ہوا چندا یادو کے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک البم تھا۔ اس نے البم چندا کی طرف بڑھایا۔ چندا نے البم کے صفحے پلٹتے ہوئے ایک تصویر اس کی طرف بڑھائی... یہ تم ہونا۔

گل بانو نے تصویر دیکھی۔ اس کے پاس میں وہی وردی والا تھا اور اس کا چہرہ

واضح تھا۔ اس نے محسوس کیا جیسے پستانوں سے ہزاروں کی تعداد میں جنگلی کیڑے لپٹ گئے ہوں۔

’کیا ہوا؟‘ چندا نے اس کے تاثرات کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

’یہ آدمی؟‘

’یہ پولیس کمشنر ہے۔ اجیت سنگھ راٹھور....‘

چندا مسلسل اس کے تاثرات پر نظر رکھ رہی تھی۔ اچانک اس نے گل بانو سے پوچھا....

’کیا تم کچھ بولنا چاہو گی؟‘

’میں....؟‘

’ہاں تم....تم کو اپنی بات رکھنے کی پوری آزادی ہے۔‘

’مجھ کو...؟‘

گل بانو اپنی جگہ منجمد تھی۔ جیسے کوئی برف کی سلّی پگھل رہی ہو۔ جیسے آزاد پرندے ہوں، آسمان میں اڑتے ہوئے۔ نوجوان طلبا طالبات.... کچھ کھڑے ہوئے، کچھ کتابوں میں ڈوبے... کچھ آپس میں باتیں کرتے ہوئے اور ان سے دور کھڑے پولیس والے۔ گل بانو اچانک ان کے درمیان کا ایک حصہ بن گئی تھی... اور اس نے پھر چندا کی آواز سنی۔ چندا نے آگے بڑھ کر مائک تھام لیا۔ گل بانو کا ہاتھ تھامے ہوئے پہلے اس نے آواز لگائی... انقلاب زندہ باد... پھر گل بانو کا تعارف کرایا۔

’ملو۔ ہماری نئی دوست۔ گل بانو... اسٹوڈنٹ... ہماری عمر کا ہر شخص اسٹوڈنٹ ہے، جو سوچتا ہے، جو بولتا ہے، جو احتجاج کرتا ہے۔ دنیا کے سارے اسٹوڈنٹ ایک جیسے ہیں۔ اسٹوڈنٹ کا مطلب کسی یونیورسٹی کا حصہ ہونا نہیں ہے۔



گل بانو کسی یونیورسٹی کا حصہ نہیں، مگر ابھی بھی جہاں ایک بڑی دنیا سوئی ہوئی ہے، گل بانو جاگ رہی ہے۔ یہ اس دن بھی ہمارے ساتھ تھی جب ہمیں دشمن سمجھ کر پولیس کی ٹکری نے ہم پر حملہ بولا تھا۔ آنسو گیس چھوڑے تھے...اور اس آنسو گیس کا شکار ہماری دوست بھی ہوئی تھی۔ ہر شخص کے سینے میں کچھ الفاظ ہوتے ہیں، میرا دل کہتا ہے، گل بانو کے اندر بہت کچھ ہے۔ کیا ہمیں گل بانو کو سننا چاہیے۔؟

’ہاں۔‘ ایک ساتھ بہت سی آوازیں ابھریں۔ گل بانو نے بدن میں تھرتھری محسوس کی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ وہ اس وقت بھی کانپ رہی تھی، جب چندا یادو نے آگے بڑھ کر مائک اس کی طرف بڑھایا۔ اسے احساس ہوا سامنے بڑی تعداد میں اس کے دوست بیٹھے ہیں۔ وہ سب کو جانتی ہے...اور اسے خوف کے لباس کو اتار دینا چاہیے....اس نے مائیک سنبھالا...اس کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔

’پہلی بار بول رہی ہوں...اس لیے کچھ غلطی ہو جائے تو معافی چاہوں گی۔ یہ دنیا بہت بڑی ہے۔ لیکن جتنی زیادہ بڑی ہے اس سے زیادہ خوبصورت ہے۔ مگر کچھ لوگ ہماری اس دنیا کو بدصورت بنا دیتے ہیں...‘

گل بانو اچانک ٹھہری...چھپکلی...جنگلی کیڑے...اس دن میں یہیں تھی۔ جب وہ دشمنوں کی طرح آئے۔ حملہ کیا... اور ایک وہ تھا... وہ جنگلی کیڑوں کی طرح میرے پستانوں کو چھو رہا تھا۔ میری مرضی کے بغیر... وہ ایک پولیس والا تھا... کیا اسے یہ حق حاصل تھا؟ اتنے سارے لوگوں کے درمیان...اور دھویں کے درمیان ...اور لاٹھیوں کی گونج کے درمیان...اور فضا میں ابھرنے والی چیخوں کے درمیان مجھے پہلی بار لگا، یہ وہی آدمی ہے، جو ہمارے درمیان آ کر ہم کو الگ کرنے کی کوشش کرتا ہے... ہمارے لیے جنگلی کیڑے بھیجتا ہے۔ سرسوں کے کھیت میں آگ لگاتا ہے۔ محنت کرنے والے نوجوانوں کو دشمن سمجھتا ہے...ایسے کتنے لوگ ہیں؟ جنگلی

کیڑے... میں اس رات گھر گئی تو اس کے کھردرے ہاتھ اور میلے ناخن بار بار میرا تعاقب کر رہے تھے۔

گل بانو ایک لمحہ کو ٹھہری اور محسوس ہوا، ہر شخص دھیان لگائے اس کی باتیں سن رہا ہے...اور اس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ہے، جس کو وہ اچھال سکتی ہے، جیسے دوسرے اچھالتے ہیں۔ جو اسٹوڈنٹ ہیں اور اپنے حق کے لیے سامنے آجاتے ہیں...اس نے بولنا جاری رکھا۔

'اس دن... آنسو گیس کے گولے...دھند، کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہی لمحہ تھا، جب مجھے لگا، خانہ بدوش ہمارے ساتھ یہی کر رہے ہیں کہ ہم نظر نہ آئیں۔ ایک دوسرے کو دیکھ نہ سکیں... ایک دھند یا اندھیرے میں کھو جائیں...مگر اب ایسا نہیں ہوگا۔ مجھے اس دھند میں زندگی کے معنی کی تلاش ہے... میں یہ تلاش مکمل کر کے رہوں گی....

وہ کب خاموش ہوئی، اسے نہیں معلوم۔ وہ دیر تک بجتی ہوئی تالیوں کے درمیان رہی۔ چندا یادو نے اسے پیار بٹھایا...تم میں کرشمہ ہے...

'یہ وہم ہے...'

'وہم نہیں کرشمہ۔ اس کرشمہ کو زندہ رکھو...'

'مگر کیسے...'

'یہ مجھے بھی نہیں پتہ۔ مگر ہمت سے...طاقت سے...'

چندا یادو پھر مسکرائی اور گل بانو نے محسوس کیا، وہ اکیلی نہیں۔ وہ جس دلدل میں ہے، اس سے باہر نکل سکتی ہے۔ وہ پہلے کیوں نہیں نکلی... وہ نکل سکتی تھی۔ مگر شاید اس کے پاس نور نہیں تھا۔ اجالا نہیں تھا، جس کو ابھی وہ چندا کی شکل میں دیکھ رہی ہے۔ کرشمہ...اور جیسا چندہ نے کہا، وہ کرشمہ کر سکتی ہے...



اور اس شام گھر پہنچنے کے بعد اس نے نظیرے کو فون کیا... جہاں بھی ہو، آجاؤ...نظیرے ایک گھنٹے کے بعد اس کے سامنے تھا...

'کیا ہوا بے بی...'

'مجھے وہ آدمی چاہیے...'

'کون بے بی؟'

گل بانو کہیں اور دیکھ رہی تھی...اجیت سنگھ راٹھور....کمشنر ہے...

'مل جائے گا۔'

'مگر کیسے...؟'

'میرے کلائنٹ پولیس میں اس سے بھی بڑے بڑے پوسٹ پر ہیں۔ یہ تو کمشنر ہے۔ مل جائے گا۔'

گل بانو نے پلٹ کر نظیرے کو دیکھا۔ نظیرے کے چہرے پر مطمئن کر دینے والی مسکراہٹ تھی۔ لیکن اس مسکراہٹ کے اندر اتر کر نظیرے کو نہیں پڑھا جا سکتا تھا۔ وہ اس کے اندر اتر جانا چاہتی تھی اور اس دھوپ کو دیکھنا چاہتی تھی، جو اس دن اچانک یونیورسٹی میں پھیل گئی تھی۔ اچانک نہیں بلکہ پوری منصوبہ بندی کے ساتھ۔ جب احتجاج کو کچلنے کے لیے خانہ بدوشوں کی قیادت میں پولیس فورس نے چاروں طرف سے یونیورسٹی کو گھیر لیا تھا...اور وہ دو ہاتھ جو اس کے پستانوں پر پھیل گئے تھے وہ ان سانپ جیسے ہاتھوں کو اب بھی اپنے پستانوں پر محسوس کر رہی تھی...وہ چلانا چاہتی تھی مگر اس کے ہونٹ سوکھے تھے اور اس کی آواز اس کے سفید دانتوں تک پہنچ کر، گھڑ گھڑا کر دوبارہ اندر کو لوٹ جاتی تھی...گل بانو اس کیفیت سے باہر نکلنا چاہتی تھی۔

'تم نے کچھ کہا کیا...؟' اس نے پوچھا اور نظیرے کے جواب کا انتظار کیا۔ مگر

نظیرے کی آنکھیں چھت کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ بڑ بڑایا...وہ ایک نمبر کا حرامی ہے اور اس سے زیادہ بہتر لفظ ابھی اس کے پاس نہیں ہے۔اس نے سنا اور خاموش رہی۔اس نے کانوں میں بجتے ہوئے جھرنوں کی موسیقی محسوس کی اور اسے محسوس ہوا انگنت حرف ہیں جو آپس میں مل کر طاقت بھی بننا چاہتے ہیں،مگر کوئی طاقت ہے جو ان حروف کو آپس میں ملنے سے روک رہی ہے اور پھر اسے احساس ہوا کہ یقین کا گزر یا تو کبھی کبھی نیلے آسمان،کبھی سیاہ بادلوں کے درمیان ہوتا ہے اور بادل کے کچھ سیاہ ٹکرے اتنے ضدی اور بے رحم ہوتے ہیں جو چٹانوں کی طرح کھسکنے میں صدیاں طے کر دیتے ہیں اور اس نے سنا کہ منصور حلاج کی ایک رات میں صدیاں سما گئی تھیں جب انا الحق کی بیقراری نے اس کے سامنے جنوں کے سمندر کو لا کھڑا کیا تھا...اور اس نے موسیٰ کی حیرت کو دیکھا جب کشتی سے چوہے بھاگ رہے تھے،ایک لمحہ میں تاریکی و نور کی ان گنت چمک اور پرچھائیاں اس کے چہرے پر طلوع ہوئیں اور وہ اس وقت گہرے نیند سے بیدار ہوئی جب اس نے گولی چلنے کی آواز سنی اور بیقراری بھری حیرت سے پوچھا۔

’تم نے آواز سنی نظیرے...؟

’ہاں گولی چلی ہے...اور جب میں آ رہا تھا، راستہ بند تھا... چوراہے پر کچھ لوگ احتجاج کر رہے تھے اور ان کے ہاتھوں میں بینر بھی تھے اور مجھے یقین تھا...‘

’کہ گولی چلے گی...‘

’ہاں...اور یہ بھاگنے کی آوازیں...‘

’مگر ان لوگوں میں خوف نہیں ہوگا‘ گل بانو ابھی بھی چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں ان لوگوں کو دیکھ چکی ہوں....جان کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ کیونکہ جان ہوگی تو احتجاج ہوگا...اور یقین کا چاند...جیسا کہ تم بھی جانتے ہو نظیرے...‘



’یہ چاند کسی کو نظر نہیں آتا‘

’مگر... مجھے نظر آ رہا ہے...‘ گل بانو کے لہجے میں سختی تھی...مگر میں مطمئن ہوں ...اور ابھی میں بتانا نہیں چاہتی کہ وہ کون سے حروف ہیں، جو آپس میں لڑ کر مجھے پر اعتماد بناتے ہیں‘

’میرا اعتماد...‘ نظیرے نے ہنسنے کی کوشش کی...اس صورت میں جب ہم دتّے دیکھ رہے ہیں کہ ملک میں آگ لگی ہے اور سب سے بڑی ریاست کو ایک جاہل نے بارود کے ڈھیر پر کھڑا کر دیا ہے۔ پولیس مسلمانوں کے گھروں میں داخل ہو رہی ہے...اور قتل عام کر رہی ہے...‘

’ٹھہرو....نفرت.... یہ لفظ اعتماد کے لیے ہے۔ میں اس بارود سے اپنے لیے کچھ تیار کر رہی ہوں...اور ہاں سنو نظیرے، جیسا تم نے کہا اور اس شخص کا نام بتایا، میں اپنے اعتماد سے غسل کرنا چاہتی ہوں...اور گل بانو کو احساس تھا کہ اس وقت وہ اور نظیرے جن الفاظ کا استعمال کر رہے ہیں، وہ کسی سنگین ہتھیار سے کم نہیں، اور الفاظ کے بہت سے ٹکرے بے معنی ہیں۔ یہ اکثر عمر کے ساتھ ہوتا ہے کہ عمر کے چھوٹے پیمانے سے اکثر حروف اور الفاظ کی شراب چھلک جایا کرتی ہے اور گل بانو کو احساس بھی نہیں ہوا کہ کب نظیرے گیا اور وہ کتنی دیر تک خیالوں میں غلطاں و پیچاں رہی۔ وہ اس وقت چونکی جب اس نے اماں نور جہاں کی آواز سنی۔اس نے نظر اٹھائی تو اماں نور جہاں نظیرے کی نشست پر موجود تھیں۔ ان کی آنکھوں میں خوف تھا اور چہرہ ساکت۔ وہ مسلسل نور جہاں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

’تم ہونا....اس وقت....میرا خیال ہے....تم نہیں ہو.....‘

’ہاں میں نہیں ہوں۔مگر کیا آپ ہیں....اور اس وقت‘ گل بانو نے کھلکھلا کر اماں نور جہاں کو دیکھا.... ہم میں سے کوئی بھی نہیں ہے اور یہی ملک کی نئی رسم

ہے...علی بابا چالیس چور کا طلسم...کھل جا سم سم کہتے ہوئے دروازہ کھلا تھا؟'

'پرانی بات۔علی بابا نے کھل جا سم سم کہتے ہوئے دروازہ بند کیا تھا۔'

'ہاں۔اب دروازہ نہیں کھلتا۔' اماں نور جہاں کے لہجے میں ناامیدی تھی۔

'مگر تم جہاں دیکھ رہی ہو، وہاں مجھے خطرہ محسوس ہوتا ہے...'

'صرف تمہیں...؟'

'نہیں۔میرا خیال ہے تم کو بھی...؟' اماں نور جہاں نے آہستہ سے کہا...

'اور وہ سب جو اس وقت کھڑکی سے باہر ہیں؟'

'شاید ان کو بھی۔ جو کھڑکی کے باہر ہیں اور کھلے آسمان کے نیچے ہیں، ان کو بھی سزا دی جا رہی ہے۔'

'آزادی ایک سزا ہے...'

'کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ غلامی کے مزدور زندہ رہیں...'

'مگر اتنا پیچھے مت جاؤ۔ پیچھے گہرا کنواں بھی ہو سکتا ہے۔'

اماں نور جہاں کے جانے کے بعد بھی گل بانو دیر تک کرسی پر بیٹھی رہی...اور وہ اس خیال میں تھی کہ کنواں دھیرے دھیرے چلتا ہوا پیچھے سے آگے کی طرف آ رہا ہے۔...

اور اس کے ٹھیک دوسرے دن شام کے وقت نظیرے دوبارہ آ پہنچا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ مطمئن اور خوش تھا اور اس نے آتے ہی بتایا کہ اجیت سنگھ راٹھور نے بلایا تھا۔ اس کے ایک بڑے کلائنٹ نے، جو اجیت سنگھ راٹھور کو جانتا تھا، اجیت سے بات کی اور اجیت نے فون کر کے اسے ہوٹل بلایا تھا۔

'ہوٹل؟'



'ایسے لوگوں کا ایک گھر ہوٹل بھی ہوتا ہے...اور دلچسپ یہ کہ وہ دیر تک مجھے دیکھ کر ٹھہاکے لگاتا رہا.... پھر اس نے کہا کہ سالے، اس دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک وحشی موجود ہیں۔مگر تم سالے جنت کے حوروں کے درمیان رہتے ہو...'

گل بانو نے اس سے تفصیل پوچھی اور ملاقات کی ایک ایک تفصیل نظیرے نے سامنے رکھ دی۔اجیت سنگھ راٹھور نے اسے بلایا، دیکھا، پرکھا اور پھر پوچھا...'

'سالے کہاں تھا اتنے دن؟'

'میں؟'

'ہاں۔ یہاں کیا کمرے میں دوسرا ہاتھی ہے۔'

'نہیں سر۔'

'تیرے پاس حوروں کا خزانہ ہے سالے...اور تجھے اجیت سنگھ راٹھور ہی یاد نہیں۔'

راٹھور نے شراب کا ایک بڑا پیگ بنایا۔زور سے ٹھہاکا لگایا اور پھر کہا'....لیکن راٹھور کو مطمئن کرنا آسان نہیں۔'

'اگر آسان ہو تو...'

'نہیں ہے...'

'اگر آسان ہو تو...'

'نہیں ہے۔' وہ زور سے چیخا۔کیا تو جانتا ہے کہ راٹھور کو کیا چاہیے...؟

نظیرے نے بتایا کہ راٹھور کے سوال پر وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر موبائل سے گل بانو کی تصویر نکالی...اور تصویر راٹھور کی طرف بڑھا دی۔راٹھور دم بخود۔نشہ ہرن۔غور سے بہت دیر تک تصویر کو دیکھتا رہا...اور اچانک نظیرے کی طرف مڑا...
سالے، تو اسے کیسے جانتا ہے...یہی تو چاہیے...اس کے لیے تو میں لاکھوں لاکھوں

خرچ کرسکتا ہوں۔'

گل بانو سن رہی تھی... اچانک وہ چونک گئی۔ نظیرے کا چہرہ دھویں میں کھو گیا تھا اور باہر دھماکہ کی آوازیں تھیں۔ اس کا جسم ہوا میں اڑ رہا تھا اور پستانوں کے پاس سے تیزاب کی دھار بہہ رہی تھی... اس نے آس پاس کی زمینوں کو تیزاب کی دھار سے جلتے ہوئے دیکھا.... اور جب دھواں ٹھہر گیا۔ تیزابی سیال کا بہنا رُک گیا، اسے نظیرے کا چہرہ دھند سے پرے نظر آیا۔ پھر اس نے بس اتنا پوچھا۔ ملنا کب ہے۔

'کل شام میں....'

'کہاں؟'

'وہ ہوٹل میں ہی ملتا ہے۔ وہ کہیں اور نہیں ملتا۔'

گل بانو نے دوبارہ گولیوں کی آواز سنی۔ اسے احساس تھا کہ اس کے کان بج رہے ہیں... اور باہر دھماکے نہیں ہو رہے ہیں بلکہ امن ہے۔

'بے بی تم اپنا خیال رکھنا۔' نظیرے جاتے جاتے ٹھہرا... بلکہ میں کہتا ہوں، اپنا خیال مت کرنا۔'

نظیرے آندھی کی طرح آیا اور آندھی کی طرح چلا گیا... اس وقت وہ جگہ ساکت، جامد تھی۔ وہ ایک میلے میں تھی یہاں ایک دکان پر رنگین غبارے سجے تھے اور کچھ ننھی بچیاں ان غباروں پر نشانہ لگا رہی تھیں۔ بچپن میں اس نے بھی نشانہ لگایا تھا مگر اس کے سارے نشانے خطا گئے تھے...

گل بانو گنگناتی ہوئی اٹھی، گو اس موسم میں گنگنانے کا احساس ممکن نہیں تھا مگر اماں نور جہاں کا خیال تھا، وہ بہت برے موسموں میں بھی جی لگانے کو گنگنایا کرتی



تھیں کہ اس سے بہتر عمل کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ گل بانو نے دوبارہ گنگنانے کی کوشش کی مگر اسے فوراً احساس ہوا کہ نغمے اچھل کر اس کے ہونٹوں سے غائب ہو گئے اور اس سرد موسم میں دھواں رہ گیا ہے جو نغموں کی طرح اس کے ہونٹوں سے باہر چھلانگ لگا رہے ہیں۔

اجیت سنگھ راٹھور سے ملنے سے قبل گل بانو ایک بار پھر چندا یادو سے ملنا چاہتی تھی۔ اس نے سنا تھا کہ پولیس نے ایک بار پھر یونیورسٹی کے طلبا طالبات پر جان لیوا حملہ کیا تھا۔ اسے افسوس ہوا کہ اس نے چندا کا موبائل نمبر کیوں نہیں لیا۔ دوسرے دن صبح ہی صبح فریش ہونے کے بعد گل بانو یونیورسٹی کی طرف چل پڑی۔ گھر سے باہر نکلتے ہوئے اماں نور جہاں نے سہمی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا مگر پوچھا کچھ نہیں۔ آج گل بانو نے سرخ لباس پہن رکھا تھا۔ جمپر اور شلوار اور اس سے میچ کرتا ہوا دوپٹہ۔ باہر نکل کر آٹو کیا اور کچھ دیر بعد ہی وہ احتجاج کرنے والے لڑکے لڑکیوں کے درمیان تھی۔ اب یونیورسٹی طلبا طالبات اسے پہچاننے لگے تھے۔ ایک لڑکی اسے چندا یادو کے پاس لے گئی۔ چندا کے ہاتھوں میں پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ چہرے پر سوجن کے نشان تھا۔ چندا نے بتایا کہ دو دن قبل اچانک پولیس نے ایک بار پھر حملہ کیا۔ اس علاقے کے مسلمانوں کے گھروں میں داخل ہوئی۔ کچھ لوگوں کو، ان کے گھروں سے باہر نکالا۔ عورتوں کے ساتھ برا سلوک کیا اور جب احتجاج بڑھا تو پولیس نے طلبا طالبات پر لاٹھی چارج کر دیا۔

چندا مسکرائی، یہ سب ہوتا رہتا ہے... ڈونٹ وری۔ پھر چندا نے بتایا کہ پانڈیچری کے طالب علموں نے اس موقع پر صدر جمہوریہ ہند سے اپنی ڈگری لینے سے انکار کر دیا... اور یہی کام بنارس کی ایک یونیورسٹی نے کیا۔ چندا نے یہ بھی بتایا کہ حکومت کے ظالم رنگ اب پہلے سے کہیں زیادہ سفاک ہو چلے ہیں... اور ملک کو

اجنبی بنانے کی مہم میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ چندا اس بار بھی پیار سے ملی۔ کئی لوگوں سے ملوایا۔ گل بانو کو حقیقتاً اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ وہ ایک اسٹوڈنٹ ہے...اور یہاں آ کر، اس ماحول میں جو خوشی اسے ملتی ہے، وہ زندگی میں کہیں اور نہیں ملی۔ اسے زندگی سے کوئی شکوہ نہیں تھا اور وہ پرانے دنوں اور ماضی کو لے کر مرثیہ پڑھنے کی قائل نہیں تھی بلکہ اس نے آنے والے دنوں کے بارے میں بھی بہت کچھ سوچ رکھا تھا... چندا یادو نے اچانک اس کا ہاتھ تھاما... پیار سے بولی، تمھیں تاریخ پڑھنا چاہیے۔ وہ مسکرائی۔ تاریخ ایک مدفن ہے جہاں رحم دل اور جابر حکمراں سب ایک ساتھ رہتے ہیں۔ آقا، بادشاہ، مہلوک، قاتل، غلام سب ایک دوسرے کے برابر لیٹے ہوتے ہیں اور یہی حکمراں جب زندہ ہوتے ہیں تو ان کے سر پر شمشیریں نکل آتی ہیں۔

اس دن گھر آنے کے بعد بھی کافی دیر تک وہ چندا یادو کے سحر میں رہی۔ ادھر اس نے عالمی نظام اور حقیقتوں کے ادراک کے لیے تاریخ کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ ہزار برس کی تاریخ، سندھ کا علاقہ، محمد بن قاسم اور ہندوستان پر حملوں کی شروعات، مسلم بادشاہوں اور اسلام کی آمد اور اس کے ساتھ ہی چنگیز، ہلاکو سے لے کر مسولینی اور ہٹلر تک کے کارنامے، نازی افواج کے ظلم...پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی خونچکاں کہانیاں۔ اب گل بانو کو ان کہانیوں میں لطف نہیں آتا تھا بلکہ اس کے اندر کی اضطرابی کیفیت میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا تھا کہ سانس لینے والی نلی میں کچھ خوفناک حادثے اٹک گئے ہیں اور اسے سانس لینے میں پریشانی ہو رہی ہے۔ کبھی اسے احساس ہوتا کہ جنگوں کے تذکرے پڑھنے کے بعد وہ بارودی زہریلی گیس کی زد میں ہے اور اس قدر دھند ہے کہ اس کی آنکھیں بینائی



سے محروم ہو چکی ہیں، پھر اسے یہ بھی احساس ہوتا کہ اس کے پاؤں شل ہیں اور چلنے سے محروم اور اس کے ہاتھ فالج زدہ بیکار اور جسم صرف ایک منجمد ڈھانچہ اور اب اس ڈھانچے میں سے روح پرواز کر چکی ہے۔ وہ دیکھتی کہ چنگیز خاں اور ہلاکو کی فوج دھول اڑاتی ہوئی لوگوں کا قتل عام کر رہی ہے...اور پہلی بار اس نے سوچا کہ موت کیا ہے اور پہلی بار اسے خیال آیا کہ مردہ خانہ کیا ہوتا ہے۔ پہلی بار اسے کسی مردہ خانے کو دیکھنے کا خیال آیا۔ اسے یقین تھا کہ دنیا کے عجائب گھروں میں اب بھی چنگیز اور ہلاکو کی نشانیاں موجود ہوں گی۔ وہ ان نشانیوں کو دیکھنے کی خواہشمند تھی اور یہ سوچ بھی اسے پریشان کر رہی تھی کہ کیا ان نشانیوں میں ان بے رحم جلادوں کو وہ زندہ دیکھ سکے گی؟ اگر وہ زندہ دیکھ سکتی تو ان کا قتل اس پر واجب تھا....اور گل بانو کو یقین تھا، وہ ان کے قتل سے کبھی پیچھے نہیں ہٹتی۔

گل بانو نے خود کو تاریخ کے لامتناہی صحرا میں محسوس کیا جہاں چاروں طرف خون کی گرد اٹھ رہی تھی۔ اسی صحرا میں چنگیز خاں بھی تھا، جو بوڑھا ہو چکا تھا اور اسے اس بات کا احساس تھا کہ اس کے دشمن اس کی بوٹی بوٹی نوچ کر کھا جائیں گے وہ دوبارہ چین پر حملہ نہ کر سکا اور اسی عالم میں اس کی موت ہوگئی۔ مرنے کے بعد اس کی لاش کو قراقرم لایا گیا اور فوج نے جو بھی راستے میں آیا، اسے قتل کر دیا۔ ہدف یہ تھا کہ چنگیز خاں کی موت کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ صنوبر کے درخت کے نیچے اسے دفن کیا گیا۔ قبیلے کے لوگ باری باری سے اس کی قبر کے پاس پہرہ دیتے رہے۔ یہ اس شخص کا خوف تھا، جو انسانی سروں کے مینار تعمیر کرنے کا شوقین تھا اور جو انسانی سروں کی کھوپڑیوں کے پیالے میں شراب پینے کا عادی تھا مگر لاکھوں کے مجرم کو بیدردی کے ساتھ قضا اپنے ساتھ لے گئی۔

تاریخ کے لق ودق صحرا میں دفن کہانیوں میں ایک کہانی ہلاکو کی تھی اس کی فوج

کی کہانی تھی کہ وہ شہروں میں بھوکے گدھوں کی طرح ٹوٹ پڑتے۔ غضبناک بھیڑیوں کی طرح انسانی جسم کو روند دیتے۔ حرم کی عورتوں کو گلیوں میں گھسیٹتے اور ہوس کا نشانہ بناتے۔ ان میں ہر عورت تاتاریوں کے ہاتھ کا کھلونا بن کر رہ گئی تھی۔ دریائے دجلہ کے دونوں کناروں پر آباد شہر، الف لیلیٰ کی شہزادی کی داستان سنانے والا شہر بغداد میں جب ہلاکو کے قدم پڑے تو دو لاکھ سے زیادہ معصوم انسان موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ لیکن موت ہلاکو کے پیچھے تھی اور جب گھوڑے پر سوار اس کے پاؤں رکاب سے نکلے تو وہ گھوڑے سے نیچے گر گیا۔ سہا ہوا گھوڑا اس قدر بدک گیا کہ اس نے ہلاکو کو پتھروں میں گھسیٹ کر اس کا سر پتھروں سے پٹخ پٹخ کر مار دیا۔ جب لشکر ہلاکو کے پاس پہنچا تو ظالم حکمراں مر چکا تھا اور اس کی کھلی آنکھوں میں سے خوف جھانک رہا تھا۔

تاریخ کے لامتناہی صحرا میں ایک خوف زدہ کرنے والی کہانی ہٹلر کی بھی ہے جس نے خود کو گولی مار کر خودکشی کر لی۔ یہ وہ شخص تھا، جس کے نام سے ایک دنیا آج بھی لرزتی ہے۔

تاریخ کے عالیشان محل میں ایک قید خانہ تھا۔ عظیم الشان قید خانہ... اور گل بانو اس قید خانے کو دیکھ سکتی تھی۔ اس قید خانے میں اپنے اپنے وقت کے تمام سکندر موجود تھے... اور اس عظیم الشان قید خانے میں ایک قطار سے ان کی لاشیں سجی تھیں۔ ان سب کے چہرے بدنما، بدہیئت تھے اور اس وقت وہ کسی بھی قسم کا زلزلہ پیدا کرنے کی حالت میں نہیں تھے۔ مگر یقیناً، جب زندہ تھے، ان کا دماغ سازشوں کا گھر رہا ہوگا اور یہ سازشیں انسانی ہلاکت کا بازار گرم کرنے میں مصروف رہی ہوں گی مگر اب قید خانے میں یا سرد خانے میں پڑے تھے اور ان لاشوں سے بدبو پیدا ہو رہی تھی۔



گل بانو اپنی جگہ سے اٹھی، کھڑکی تک گئی، اس نے باہر کی طرف دیکھا۔ باہر ہیبت ناک خاموشی حاوی تھی... اور اب اسے اجیت سنگھ راٹھور کا انتظار تھا۔ کیوں انتظار تھا؟ اس بارے میں وہ نہیں جانتی تھی۔ مگر اسے انتظار تھا۔

●●

اور جب پورے ملک میں احتجاج کی آگ پھیل چکی تھی، ملک کی سب سے بڑی ریاست میں مسلمانوں کو ہلاک کیے جانے کا فرمان جاری ہو چکا تھا اور پولیس والے بے رحمی سے مسلمانوں کو قبرستان اور پاکستان بھیج رہے تھے، گل بانو اپنی گاڑی سے ہوٹل پارک ویو کے دروازے پر اتری۔ سڑک پر ٹریفک تھا۔ مگر ٹریفک کی آواز جنوری کی تیز ٹھنڈک میں گم ہوگئی تھی۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے اور ہوٹل پارک ویو کے اندر ایک قطار سے کھڑی گاڑیاں خاموش تھیں۔ اس نے ڈرائیور سے کچھ بات کی۔ اسے گھر جانے کو کہا، پھر گاڑی سے اتر گئی۔ اسے ساری رات ہوٹل میں اجیت سنگھ راٹھور کے ساتھ گزارنی تھی.... اس وقت بھی ایک کشمکش اس کے اندر چل رہی تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی بیک کر لی۔ وہ اسے دور تک اس وقت تک جاتے ہوئے دیکھتی رہی، جب تک گاڑی نگاہوں سے اوجھل نہ ہوگئی۔ گاڑی کے اوجھل ہو جانے کے بعد اس نے ہوٹل کے گیٹ کی طرف دیکھا۔ باوردی چوکیدار گیٹ پر کھڑا تھا۔ وہاں، گیٹ پر رکنے والی گاڑیوں اور ان سے اترنے والے مسافروں کو دیکھ کر وہ سیلوٹ کرتا اور دروازہ کھول دیتا... چوکیدار نے گل بانو کو سیلوٹ کیا اور اندر جانے کے لیے راستہ دیا۔ ہوٹل کے اندر چمکتی روشنیوں کا اس نے جائزہ لیا۔ ریسپشن پر گئی، روم نمبر ۷۰۴ کا حوالہ دیا۔ پھر لفٹ کی طرف بڑھ گئی۔ لفٹ ساتویں فلور پر رُکی۔ سامنے ہی دروازہ تھا اور دروازے پر ۷۰۴ کا ہندسہ چمک رہا تھا... وہ کچھ دیر تک کھڑی رہی۔ پھر اس نے بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔

قدموں کی آہٹ سنی اور دروازہ کھل گیا۔سامنے اجیت سنگھ راٹھور تھا۔اس وقت بھی وردی میں تھا اور اس کی کمر سے اس کا ریوالور جھول رہا تھا۔اجیت سنگھ راٹھور کے چہرے پر شیطانوں جیسی مسکراہٹ تھی... وہ کچھ بولنا چاہتا تھا مگر اس کی 'شیطانیت' خاموش تھی۔گل بانو کو احساس تھا کہ یہ شیطانیت کبھی بھی اس کے وجود سے باہر آسکتی ہے اور اسے راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کرسکتی ہے۔اجیت سنگھ راٹھور اس کے جسم کا اس طرح معائنہ کررہا تھا جیسے قصاب باڑہ میں تازہ اور باسی گوشت کی پہچان کرنے والے ہوتے ہیں۔راٹھور کی نگاہیں اس کے جسم کے ہر حصے میں چبھ رہی تھیں۔ یہ لمحے گل بانو کے لیے صدیوں کے برابر تھے اور وہ ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوتے ہی خود کو ایک معصوم کبوتر کے طور پر دیکھ رہی تھی اور برہنہ بھی محسوس کررہی تھی۔

اس نے دیکھا، اجیت سنگھ راٹھور قہقہہ لگا کر ہنسا۔اس کے دانت پیلے تھے اور اس وقت وہ کمشنر کی جگہ ایک عام اور اوباش انسان نظر آرہا تھا،جس کو اچانک اس کی من چاہی چیز مل گئی ہو۔ وہ ہنسا اور گل بانو کو اندر آنے کے لیے کہا... اور اس وقت راٹھور کے منہ سے عجیب سی ایک آواز نکلی تھی جو کبھی بچپن میں اس نے سہیلیوں کے منہ سے سنی تھی۔

گل بانو کے جسم میں ہلچل ہوئی۔اس کو سامنے کھڑے انسان سے کوئی مطلب نہیں تھا۔مگر اچانک اسے احساس ہوا، کہ کمرہ چلنے لگا ہو.... دیواریں چلنے لگی ہوں اور دیواروں پر اچانک کچھ تصویریں ابھرنے لگی ہوں۔ ہوٹل کی سفید دیوار اب سنیما ہال کا اسکرین تھا،جس پر وہ یونیورسٹی کے اس دن کا منظر دیکھ رہی تھی جب چندا یادو اس کے ساتھ تھی اور گل بانو نے دیکھا کہ چندا یادو کے ہاتھ کے کاغذات اچانک ہوا میں اڑ گئے ہوں۔مگر اچانک نہیں۔ اس کے سامنے ایک ڈراکیولا تھا جس کے



ہونٹوں اور جبڑوں میں خون لگا تھا اور جس کے بھیانک لمبے لمبے دانتوں میں انسانی گوشت کے ٹکرے تھے اور اس کے باوجود چندا یادو کے جسم میں کوئی خوف نہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں سامنے والے کے لیے تیز نفرت تھی۔چلتی ہوئی دیوار سے کوئی باہر کی طرف کودا تھا...اور گل بانو نے دیکھا کہ وہ ایک سیاہ فام بھیڑیا تھا جو کمرے میں آتے ہی بند دروازے سے باہر نکل گیا۔گل بانو نے جسم میں سرسراہٹ محسوس کی اور ٹھیک اسی وقت اس نے چھت کو زمین پر گرتے دیکھا اور اس سے قبل کہ اس کے ہونٹوں سے چیخ نکلتی، اس نے دیکھا کہ اجیت سنگھ راٹھور اپنے یونیفارم سے پستول نکال کر ہوٹل کے میز کی دراز میں ڈال رہا تھا۔اس نے دراز بند کیا اور گل بانو کی طرف دیکھا....اس کا لہجہ پھوہڑ تھا اور اس کی آواز میں وہی سنسناہٹ تھی جو گل بانو نے اس وقت محسوس کی تھی جب پرانے چکلہ ہاؤس کے قریب، بچپن میں اس نے سوّروں کو دیکھا تھا، گندے نالے میں منہ مارتے ہوئے۔ اس وقت سوروں کے ہونٹوں سے اسی طرح کی سنسناہٹ بھری آواز نکل رہی تھی...چھم ..پم...چھن... پم... بے ساختہ اس کے ہونٹوں پر ہنسی نمودار ہوئی اور اس نے دیکھا کہ اجیت سنگھ راٹھور کے چہرے پر سختی نمودار ہوئی ہے اور وہ بغور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا ہے...اور پہلا لفظ جو اجیت سنگھ راٹھور کے ہونٹوں سے چھلانگ لگا کر اس تک پہنچا ہے، اس میں گندے نالے جیسی بدبو ہے....

'میری چھمک چھلو....اور مجھے یقین نہیں ہوتا....'

گل بانو نے مسکرا کر اجیت سنگھ راٹھور کو دیکھا۔اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

'یہ کیا تم ہو...وہی یونیورسٹی والی، اسٹوڈنٹ؟ کیا وہاں کی ساری بلّیاں تمہاری جیسی ہیں؟'

اُف...اس کے ہونٹوں سے نکلنے والے بدبودار لفظوں نے گل بانو کے سلگتے

احساس پر پہلی بار تیزاب ڈالنے کا کام کیا۔اسے احساس ہوا، اس کا جسم اچانک تیزاب کی آنچ سے جلنے اور گلنے لگا ہے اور اس وقت اگر وہ نہ چیخی تو تیزاب کی دھاراس کا کام بھی تمام کرسکتی ہے۔اور پھراس کے اندر کی نفرت، سیّال بن کراس کے ہونٹوں پر آگئی اور گل بانو نے پھوہڑ انداز سے ہنستے ہوئے اجیت سنگھ راٹھور کو دیکھا۔

'بلّیاں... ساری کی ساری بلّیاں... وہاں تمہاری ماں کبھی پڑھی ہے....؟ تمہاری بہن....؟'

گل بانو کے سپاٹ چہرے پراس وقت چندا یادو کا چہرہ آگیا تھا۔

'چھنال...رنڈی....' اجیت سنگھ راٹھور چونک کر بولا۔

'معنی صاف ہے۔نہیں پڑھی۔ اگر پڑھتی تو تب وہ بھی تمہارے لیے بلّیاں ہوتیں۔معصوم بلّیاں...اورتم بلاّ بن کران کے پیچھے ہوتے....' وہ آرام سے راٹھور کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ کیا فرق پڑتا ہے راٹھور... بلّیاں... بلّے... گوشت... سب کے گوشت تو ایک جیسے ہوتے ہیں...لڑکیوں کے... عورتوں کے.... اپنوں کے....غیروں کے... کچے پکّے گوشت...کبھی اپنوں کے گوشت کو چھوا ہے... جیسے یونیورسٹی میں چھورہے تھے۔....؟'

'چھنال..' اس بار راٹھور نے ایک چانٹا گل بانو کے چہرے پر لگایا۔ پھر زور سے ہنسا۔ اس کا لہجہ مزید پھوہڑ بن چکا تھا۔اس وقت وہ کمشنر نہیں، گل بانو کی نظر میں ایک ٹچاّ بھکاری تھا جواس کے منہ سے کچھ بھی سننے کے بعد، کوئی بھی جواب دینے کے لائق نہیں بچا تھا۔اس وقت وہ نظیرے سے بھی گیا گزرا تھا...اور گل بانو کو احساس ہوا کہ اس نے نظیرے کی عظمت کو گرادیا ہے۔ یہ راٹھور کبھی زندگی میں نظیرے نہیں بن سکتا...اور اس وقت وہ ہنس رہا تھا، اس کی ہنسی ایک ایسے نفسیاتی



مریض کی ہنسی تھی کہ اگراس کے سامنے رشتے دار بلّیاں بھی ہوتیں تب بھی وہ ہر قیامت سے گزر گیا ہوتا...اور گل بانو نے سنا، راٹھور کہہ رہا تھا۔

'بول رنڈی... مجھے تعجب نہیں، میں نے سنا ہے، دیکھا بھی ہے۔ بہت سی رنڈیوں کے ساتھ رات گزاری ہے۔ رنڈیاں خوب گالی دیتی ہیں...اور مجھے اس موقع پر ان کا گالیاں دینا پسند ہے۔سن، گالیوں سے سیکس کا مزہ دوآتشہ ہوجاتا ہے۔ایک تو سیکس۔سالا کتا بن جاؤ...بھیڑیا بن جاؤ..آگ کا گولا بن جاؤ... بارود بن جاؤ...مگراس وقت تک سالا مزہ نہیں آتا، جب تک اس گولے یا بارود کو سلگانے والی ماچس کی تیلی نہ ہو... یہ گالیاں ہیں نا۔ مجھے سیکس کے وقت چاہیے...سنا میری حرامی بلّی...چاہیے مجھےاور تمہاری سسکیوں میں چاہیے...تمہاری سنسناہٹ میں اور تمہارے گوشت کے ہر حصے سے گالیاں نکلنی چاہئیں....اور نہ نکلیں تو میں نکلوانا بھی جانتا ہوں۔، میری پالتو بلّی۔بس آج مجھے خوش کردے...'

راٹھور پھر ہنسا اور گل بانو نے ایک بار پھر پورے کمرے کو چلتا ہوا محسوس کیا...

'پہلے کچھ کچھ پیتے ہیں۔ کچھ پیئے گی۔'

'نہیں' گل بانو نے انکار کیا۔

'ایک چھوٹی سی وہسکی بناتا ہوں تیرے لیے...'

'نہیں۔'

'انکار کرے گی تو....' ہنستے ہوئے راٹھور نے میز کی دراز سے ریوالور نکالا اور اس کے سر پر رکھ دیا...ابھی خالی ہے۔مگر گولیاں ہیں میرے پاس...'

'خالی کیوں رکھتے ہو؟' گل بانو نے پوچھا...

راٹھور نے قہقہہ لگایا۔

گل بانو نے پھر پوچھا...'اس وقت ریوالور کی طرح خالی تو نہیں؟

‘کیا مطلب ہے تیرا؟’

‘کچھ لوگ خالی ریوالور کی طرح ہوتے ہیں۔ گولیاں نہیں ہوتیں۔‘

گل بانو نے اس بار قہقہہ لگایا۔ راٹھور نے دوبارہ ایک چانٹا اس کے گال پر لگایا۔اس بار وہ کسی بھیڑیے کی طرح زخمی تھا اور وہ کہہ رہا تھا کبھی کسی مرد کی مردانگی کومت جگانا۔کسی دن ایسی باتیں کرنا تمہیں بھاری پڑ سکتا ہے...اس نے پھر رنڈی کا نام استعمال کیا۔مگر اس نام سے اس وقت گل بانو کو کوئی الجھن نہیں ہورہی تھی۔

گل بانو کو یاد آیا، یونیورسٹی احتجاج والے دن یہ راٹھور دوسری لڑکیوں کو بھی چھونے کی کوشش کررہا تھا۔کیا یہ ہماری پولیس کا اصلی چہرہ ہے؟ اس نے اس چہرے کو ہر جگہ دیکھا تھا... اور جیسا کہ وہ اب مطالعہ کرنے لگی تھی۔ اخبار پڑھنے لگی تھی۔ کتابیں بھی اور ٹی وی دیکھنے لگی تھی اور اسے معلوم تھا کہ بھیونڈی، مالیگاؤں، ہاشم پورہ، جمشید پور اور مظفر نگر... ہر جگہ یہی ہاتھ تھے جو ماچس کی تیلی بھی رکھتے تھے اور بلّیوں کو چھوتے بھی تھے بلکہ معصوم بلیوں کو ہلاک بھی کردیتے تھے۔اس بار گل بانو نے نفرت سے راٹھور کی طرف دیکھا...وہ انہماک سے پیگ بنانے کی تیاری کررہا تھا۔اس نے دو پیگ بنائے۔ایک پیگ مختصر تھا اور اس نے کہا بھی کہ مختصر اس لیے کہ وہ ہوش میں رہے۔ ہوش کھونے والی بلّیاں اسے پسند نہیں۔ ہوش میں رہیں گی تو بلّیاں گالیاں دینے کے لائق ہوتی ہیں۔ بے ہوشی صرف نیند کو آواز دیتی ہے۔

راٹھور نے گلاس ٹکرائے، چیئرس کہا اور پھر پھوہڑ انداز میں کہا۔

اس بلّی کے لیے جو اس وقت میرے ساتھ ہے...

ہاں تو...؟

میں نے اس بلّی کے لیے دعا مانگی تھی...

کہاں؟



یونیورسٹی میں.....راٹھور ہنسا... مجھے کیا معلوم تھا کہ بلّی آسانی سے پیسے دے کر مل جائے گی...ساری بلّیاں...

گل بانو دو گھونٹ بھر چکی تھی...گل بانو چیخی...ساری نہیں...ان میں تمہاری اماں بھی ہے... یونیورسٹی کی لڑکیوں کو کچھ مت کہو....

‘سا...لی..’ راٹھور ہنس رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے سنجیدہ ہوا...اس کے اندر کچھ کشمکش چل رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں...وہ دیکھا ہے نا... بلّی ، چوہیا کا کھیل...کھیلو... رات بھر کھیلو... پھر ایک بار میں سکسر مار دو بیٹ گھما کر...‘

‘سکسر ..’ گل بانو نے اس کی طرف دیکھا۔ایک بات پوچھوں...

‘پوچھو....؟’

‘کیا تم سارے ایسے ہو....؟’

‘سارے؟’

مطلب پولیس والے... عدلیہ... اور اس وقت وہ سارے لوگ، جو تمہارے جیسے ہیں...‘

‘تو کہنا کیا چاہتی ہے رنڈی....؟’

گل بانو کھلکھلا کر ہنسی... کیا سب نے اپنا اپنا کام چھوڑ دیا ہے۔سالا رنڈی باز...اس حکومت میں کون کام کرے گا۔کس کو کام کرنے دیا جائے گا...کیا سارا کام بھول کر جمورا بن گئے ہو تم لوگ۔ بول جمورا بول... بول جمورا ناچ..‘

‘تو تو پڑھی لکھی نکلی۔‘

‘یہ چھوڑ—میری بات کا جواب دے..‘

راٹھور ہنسا...اس وقت ہم سب کتے ہیں بس.....جمورا ناچے گا۔ اہاں ناچوں

گا۔ جمورا اٹھ۔ جمورا اٹھ گیا۔ دیکھے گی ناچ...

'دکھانا...'

شراب کے تین پیگ لگانے کے بعد راٹھور کے اندر کا جانور سامنے آنے لگا تھا۔ وہ کھڑا ہوا۔ لڑکھڑایا۔ پھر جھک گیا۔ جھک کے بندر بن گیا... وہ جبڑے ہلا رہا تھا۔ بندروں کی طرح کرر ہا تھا۔

جمورا ناچ...

جمورا اٹھ...

جمورا کھڑا ہو...

جمورا گھوم جا...

جمورا چل...

جمورا ناچ.... دیکھا....' راٹھور دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔' اس وقت ہم سب بیکار ہیں اور مفت میں پیسے لے رہے ہیں اور ہمارا کام ہے... جمورا اٹھ... جمورا چل.. جمورا دوڑ....'

'تمھیں اچھا لگتا ہے؟'

'برا بھی نہیں لگتا۔'

'برا اس لیے نہیں لگتا کہ بیکار کی روٹیاں پسند آنے لگی ہیں۔'

'ہاں... اور ان روٹیوں میں اپنی پہچان ہے....' اس نے گھوم کر گل بانو کو دیکھا...

'پہچانا...؟'

'ہندو راشٹر اور میری مسلمان بلّی ....'

اس وقت اچانک گل بانو چونک گئی۔ مسلمان بلّی .... راٹھور کے ہونٹوں سے



شراب کے بھبھکے پھوٹ رہے تھے... اس کی آنکھوں میں اس کی اصلیت اُتر آئی تھی۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا... لڑکھڑاتے ہوئے اس نے گل بانو کا ہاتھ تھامنا چاہا۔ گل بانو کو ایک بار پھر دیواریں چلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس نے پوچھا۔ ابھی تم نے کیا کہا راٹھور... میرے کتے...

'مسلمان بلّی..'

'میرے شرابی کتے.... یہ مسلمان بلّی کیا ہے....؟

راٹھور کو لگا۔ اس کا نشہ ہرن ہونے والا ہے۔ اس نے پھر ایک زور کا چانٹا گل بانو کو لگایا۔ بستر پر چل، پھر بتاتا ہوں۔ گل بانو نے استفسار کیا... ابھی بتاؤ۔ راٹھور کا نشہ کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا۔ اس نے وردی اتاری اور وردی کرسی پر پھینک دی۔ کمرہ گرم تھا۔ یا دھیرے دھیرے کمرہ اتنا گرم ہو چکا تھا کہ اس سردی کے موسم میں بلوور سے نکلنے والی گرمی نے راٹھور کو پریشان کر دیا تھا۔ اب اس نے صرف انڈر ویئر پہن رکھا تھا۔ اٹھنے کی کوشش میں وہ گرنے گرنے کو ہو گیا... اس کے باوجود اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ برقرار تھی... اور اس نے پھر اس لفظ کو دہرایا...

'میری مسلمان بلّی..'

'بلّیوں کا مذہب نہیں ہوتا...؟

'ہوتا ہے....' راٹھور نے قہقہہ لگایا اور اس بار خود کو سنبھالنے کی کوشش میں حقیقتاً وہ گر پڑا.... اور گل بانو نے جو کچھ سنا، اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ زمین پر گرے ہوئے راٹھور نے زور سے کہا۔

'جب کوئی مسلمان بلّی میرے نیچے آتی ہے تو لگتا ہے اسلام نیچے آ گیا ہو۔ تم سالے..' اس بار اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ اور کوئی غلطی نہیں کی۔ میز کا سہارا لیتے ہوئے اٹھا اور بستر پر بیٹھ گیا۔ اتنا ضرور ہوا کہ لڑکھڑاہٹ میں شیشے کا گلاس اس کے

ہاتھ سے چھوٹ گیا...اس وقت زمین پر گلاس کی کرچیاں بکھر چکی تھیں...لیکن گل بانو کے ذہن میں آندھیاں دوڑ رہی تھیں۔ اس کا گلاس خالی تھا اور اس کا نشہ اتر چکا تھا...اسلام...وہ بھونچکا تھی...اسے یقین نہیں ہو رہا تھا اور اس وقت یہ لفظ تیزاب سے زیادہ انگاروں والے تھے۔ اور وہ اچانک تیز تیز چلتی آندھیوں کی زد میں آ گئی تھی۔ کیا اس وقت سارے ہی یہی سوچ رہے ہیں پورا ملک؟ عدلیہ؟ الیکشن کمیشن، خفیہ ایجنسیاں....حکومت...حکومت میں شامل تمام محکمے...اسلام...؟ وہ اس لفظ پر آ کر پھر ٹھہر گئی۔ سرد احساس بارود کے انگاروں میں تبدیل تھے۔ وہ اٹھی اس کے جسم میں اس وقت شراب کا پیگ ختم کرنے کے باوجود کوئی لڑکھڑاہٹ نہیں تھی... آندھیاں ضرور تیز تھیں اور ان آندھیوں میں وہ بہہ رہی تھی

’ابھی تم نے کہا...‘ وہ ٹھہری۔ راٹھور کو دیکھا۔

’ہاں کہا...اب بھی کہتا ہوں...اور ایک دن تم لوگ کیمپوں میں ہو گے۔ بے شناخت...چھوٹے سے کمرے میں سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں...اور شراب سالی چڑھ گئی...تم لوگ ہو گے...اور میں تم لوگوں سے نفرت کرتا ہوں...اور یہ شراب کمبخت...سارا مزہ کرکرا کر دیتی ہے۔ تم سن رہی ہو۔ کپڑے اتارو اور.....میں ان دنوں سلی گوڑی میں تھا...وہ ایک نیپالی لڑکی تھی۔ اس دن بھی میں نے شراب پی رکھی تھی...کچھ نہیں ہوا۔ پیسے بیکار گئے۔ تم سن رہی نا...رنڈی...‘

اس بار آخری لفظ کی ادائیگی میں راٹھور کے ہونٹ سکڑ گئے تھے۔ گل بانو نے راٹھور کی طرف نفرت سے دیکھا۔ اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ ریوالور نکالتی۔ میز پر رکھی گولیاں ریوالور میں ڈالتی اور ساری گولیاں راٹھور کے جسم میں اتار دیتی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ ذہن ودماغ میں چلتی آندھیوں میں شدت آ چکی تھی، گل بانو کو یقین تھا، وہ اس مہذب دنیا کا حصہ نہیں ہے۔ اور اس وقت دیواروں سے، چھتوں



سے بدبو کا طوفان اٹھ رہا ہے۔ اندر آہستہ آہستہ دھواں جمع ہو رہا ہے۔ بدبو کی لہریں اس دھوئیں جذب ہو رہی ہیں۔ پھر اس نے سنا، راٹھور خرّاٹے لے رہا ہے۔ اس کے خرّاٹے پورے کمرے میں بج رہے ہیں۔ وہ اس لمحہ کا فائدہ اٹھا کر، دروازہ کھول کر باہر بھی نکل سکتی تھی...اور دوسرا یہ کہ دراز سے ریوالور نکال کر— مگر اس وقت وہ خود کو مجبور حالت میں محسوس کر رہی تھی اور اپنی مجبوری پر اسے رونا آ رہا تھا۔ راٹھور کے خرّاٹے بند ہوئے۔ اچانک اس نے آنکھیں کھول دیں۔ گل بانو نے بستر پر ایک سانپ کو سرسراتے ہوئے محسوس کیا۔ اس نے راٹھور کی چیخ سنی۔ اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ وہ اسے بھدّی بھدّی گالیاں دے رہا تھا۔ وہ کرسی سے اٹھی۔ کرسی اور بستر کے درمیان زیادہ کا فاصلہ نہیں تھا۔ راٹھور کے سخت ہاتھوں نے اس کا ہاتھ تھاما اور بستر کی طرف کھینچ لیا۔ وہ بستر پر اس کے بازو میں دبک گئی، مگر راٹھور نے جس مقصد سے ہاتھ کھینچا تھا، اس مقصد میں ناکام رہا۔ ایک بار پھر کمرے میں اس کے خرّاٹے گونج رہے تھے۔

## (9)

گولیاں چلنے کی خبریں مسلسل موصول ہورہی تھیں۔گل بانو کے لیے یہ سوچنا مشکل تھا کہ ایک بڑی اکثریت والی حکومت کو، جو ہر سطح پر نا کام ہے، یہ سب کرنے کی ضرورت کیوں پڑی۔نظیرے نے بتایا تھا کہ ہم ایک بار پھر غلام ہوجائیں گے۔ بینکوں سے پیسہ ختم ہو چکا ہے اور حکومت عوام کو ہندو مسلمان کے مسائل میں الجھائے رکھنا چاہتی ہے۔ہوٹل سے گھر آنے کے بعد اس نے کچھ دیر تک ٹی وی دیکھا۔ پھر ٹی وی بند کردیا۔اماں نور جہاں ان دنوں خاموش مجسمہ میں تبدیل ہوگئی تھیں اور گل بانو کی کوئی دلچسپی اب اماں میں نہیں تھی۔نظیرے کی حیثیت اب اس لیے ایک استاد جیسی تھی اور وہ یہ بھی سوچتی تھی کہ نظیرے اس پیشہ سے باہر کیوں نہیں نکل آتا۔ یہ سوال اس نے نظیرے سے بھی کیا تھا،مگر نظیرے نے یہ کہہ کر خاموشی اختیار کرلی ہے کہ اب وہ خواہش کے باوجود اس پیشے سے الگ نہیں ہوسکتا۔اب دیر ہوچکی ہے۔

دوسرے دن بھی گل بانو کو نظیرے کا انتظار رہا۔ اس نے کئی بار نظیرے کو فون لگایا۔مگر نظیرے کا فون بند آرہا تھا۔ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا، اسے حیرت تھی کہ نظیرے



کہاں گیا ہوگا؟ گیارہ بجے کے قریب ایک اسپتال سے فون آیا۔فون ایک لڑکی نے کیا تھا جو وہاں نرس تھی۔ اس نے بتایا کہ نظیرے زخمی ہے اور اسپتال میں ہے۔اس نے اماں نور جہاں کو بتایا تو وہ بھی نظیرے کو دیکھنے کے لیے پریشان ہوگئیں مگر گل بانو نے صاف کہہ دیا کہ وہ نظیرے سے ملنے جارہی ہے اور کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ اماں بھی اس کے ساتھ جائیں۔

ایک گھنٹہ بعد وہ کرشنا اسپتال میں تھی۔ ایمرجنسی وارڈ میں نظیرے کو رکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر اس کے بارے میں کچھ بھی بتانے سے کترا رہے تھے۔ یہ بات اسے حیرت میں ڈال رہی تھی۔ یہ بات اسے معلوم ہوچکی تھی کہ اسپتال میں کچھ دوسرے مریض بھی داخل ہیں جو پولیس کی لاٹھیوں سے زخمی ہوئے۔جنتر منتر پر ہزاروں کی بھیڑ جمع تھی۔احتجاج کو دبانے کے لیے پولیس نے لاٹھی اور آنسو گیس کا سہارا لیا۔ عورتوں کو بھی نہیں چھوڑا۔ بزرگ عورتوں کے ساتھ بھی برا سلوک کیا۔ جو زخمی ہوئے انھیں ادھر ادھر اسپتالوں میں بھرتی کیا گیا۔آٹھ لوگوں کے ہلاک ہونے کی خبر ہے۔گل بانو جب ایمرجنسی وارڈ میں داخل ہوئی تو وہاں ایک ڈاکٹر تھا، جو نظیرے کے جسم پر جھکا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نوجوان تھا....گل بانو سے اس نے آہستہ سے کہا۔ گولی لگی تھی۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں۔مگر ہم یہ بات باہر کسی کو بتا نہیں سکتے۔ اور آپ بھی خاموش ہی رہیے گا۔ کیونکہ میڈیا یہ بتانے کی کوشش کررہی ہے کہ پولیس نے گولی نہیں چلائی۔نوجوان ڈاکٹر مسکرایا، جبکہ گولی چلنے اور پولیس کی بربریت کے ویڈیو وائرل ہوچکے ہیں۔مگر کورٹ کو یہ باتیں کون بتائے گا۔ہم ایک پُر اسرار جہنم میں ہیں....اور اب اس جہنم میں رہنے کی خواہش نہیں ہوتی۔ اس کے بعد وہ رُکا نہیں۔ آگے بڑھ گیا۔نظیرے مسکرایا۔ اس نے بازو دکھانے کی کوشش کی۔، جہاں اسے گولی لگی تھی۔

'لیٹے رہیے۔'

گل بانو اس پر جھکی اور نظیرے کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔نظیرے نے ٹوٹتے لفظوں میں بتایا کہ وہ جنتر منتر گیا تھا۔ پولیس نے اندھا دھند گولیاں چلائیں اور ایک گولی اس کے بازو سے ہو کر گزر گئی۔ وہ کافی کمزور لگ رہا تھا اور اس کے بازو پر سفید پٹیاں چڑھی تھیں۔گل بانو نے ڈاکٹر سے مل کر اطمینان کیا کہ نظیرے ہر قسم کے خطرے سے باہر ہے اور شام تک وہ گھر جانے لائق ہو جائے گا۔ نظیرے کو احساس تھا کہ اب اس دنیا میں وہ اکیلا نہیں ہے کوئی ہے جو اس کا خیال رکھتا ہے۔ اسے تعجب تب ہوا جب نرس نے ہنستے ہوئے نظیرے سے کہا، لو جی آپ کی بہن آ گئی۔ اب تو خوش ہو۔گل بانو پہلے اس لفظ پر چونکی....اور اس نے دیکھا، نظیرے کے چہرے پر بچوں جیسی معصومیت کا رنگ ابھرا تھا۔تکلیف کے باوجود مسکرا کر اس نے اثبات میں سر ہلایا اور گل بانو نے نظیرے کے ہاتھوں کو چوم لیا۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔ یہی حال نظیرے کا بھی تھا۔

سات بجے تک اسپتال سے نظیرے کو چھٹی مل گئی۔ آسمان سیاہ ہو چکا تھا۔ موسم سرما میں یوں بھی سڑک پر چلتی گاڑیوں میں کمی آ جاتی ہے۔ شام پانچ بجے تک اندھیرا پھیل جاتا ہے اور سات بجے تک ایسا لگتا ہے جیسے آدھی رات گزر چکی ہو۔ گل بانو نے نظیرے کو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ابھی کچھ دن وہ اس کے گھر رہے گا اور نظیرے نے آرام سے گل بانو کی بات پر حامی بھر لی۔ یقیناً وہ بھی یہی چاہتا تھا۔آٹھ بجے تک گل بانو نظیرے کو لیکر گھر پہنچ گئی۔ دروازہ اماں نور جہاں نے کھولا۔ خیریت پوچھی۔ اماں کا بھی یہی خیال تھا کہ نظیرے کو کچھ دن آرام کرنا چاہیے۔ ڈرائنگ روم کے پاس والا کمرہ نظیرے کو دیا گیا۔ یہ کمرہ عام طور پر خالی



رہتا تھا۔ کمرہ کشادہ تھا۔ بستر کے ساتھ ساتھ صوفے بھی لگے تھے۔ دیوار پر بڑی سی پینٹنگس تھی۔ پینٹنگس میں کچھ بچے تھے جو پتنگیں لوٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ نظیرے کو محسوس ہوا کہ برسوں بعد، زندگی کی طویل عمر طے کرنے کے بعد اب جا کر وہ اپنے گھر کے کمرے میں آرام کر رہا ہے۔

اس رات نیم شب گل بانو نے پھر وہی خواب دیکھا۔ اس نے لق ودق صحرا دیکھا۔ اس کے پاؤں میں زنجیریں پڑی ہیں۔ زنجیروں کے سہارے جسم کو گھسیٹتی ہوئی وہ آگے بڑھ رہی ہے۔ اس کے جسم پر گندہ سا لباس ہے جو ریت سے اٹ گیا ہے۔ اس کے پاؤں، ہاتھ، یہاں تک کہ لوہے کی زنجیروں میں بھی ریت بھر گئی ہے۔ یہاں وہ اکیلے نہیں ہے، اس کے ساتھ بہت سے لوگ ہیں۔ لڑکے، لڑکیاں، بزرگ مرد، عورتیں... ہوا میں ریت اڑ رہی ہے۔ وہ کراہنے اور چیخنے کی آوازیں سن رہی ہے۔ ان میں بیشمار بچے بھی ہیں اور یہ سارے غیر ملکی ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو برسوں سے اسی ملک میں رہ رہے تھے۔ مگر گل بانو کے ساتھ ساتھ یہ تمام لوگ اب غیر ملکی تھے۔ یہ قافلہ لاکھوں افراد پر مشتمل تھا۔ کچھ بزرگ راستے میں ہی موت کے منہ میں چلے گئے... اور ایسے بیشمار تھے جو چلنے کے قابل نہ تھے اور موت کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ گل بانو نے اس قافلے میں اماں نور جہاں اور نظیرے کو بھی دیکھا۔ چہرے فق تھے۔ ہونٹ خشک تھے اور چہروں پر بھی ریت لگی تھی۔

گل بانو نے ایک شخص کے کراہنے کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ میرے پاس تو سارے شواہد تھے....

'مگر تمہارا لباس' ایک بزرگ آہستہ سے بولا....ہم اپنے لباس سے مارے گئے۔

شناخت.. لباس..؟

یہاں سب ایک جیسے لباس میں تھے... پھٹے پرانے ، چاک ، ریت میں اٹے ہوئے ،خون میں سنے ہوئے ....آسمان زرد تھا...اور چاروں طرف انسانی چیخیں جمع ہو رہی تھیں...

گل بانو نے اس ہجوم میں اس عالم کو دیکھا ، جس کے لباس چاک تھے۔ ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔اور خشک خون پر اڑتی ہوئی ریت نے قبضہ کر لیا تھا۔ گل بانو قریب آئی ، استفسار کیا' کہ آپ یہاں کیسے ؟ اور کیا ایسا پہلی بار ہوا ہے ......'اس کے ہونٹ تیس کروڑ کہتے ہوئے ٹھہر گئے ۔خوف زدہ کرنے والی گرم ریت کے باوجود اس نے محسوس کیا کہ عالم کے ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ ہے ......اور عالم نے کہا کہ ایسا پہلے بھی ہوا ہے......اور وہ اسی اُجڑے قافلے کا مسافر ہے ، اس لئے وہ بھی گرم ریت اور دھوپ کی تپش کے عذاب کو بھیجا گیا ہے اور پھر عالم نے اضطرابی کیفیت میں بتایا......آہ غرناطہ......کیا تمھیں تاریخ کی کچھ سمجھ ہے بانو۔گل بانو نے نفی کی کیفیت میں سر کو جھٹکا ، عالم نے ٹھنڈی سانس بھری ۔ یہ جو تاریخ ہے...... ہمیشہ سے بے رحم رہی ہے بانو ....۱۴۹۲ کا سال جب غرناطہ کو زوال آیا تھا۔آہ اندلس ......

کچھ دیر تک عالم اضطرابی کیفیت میں رہا......اور گل بانو زنجیروں سے بندھی ہوئی ایک ٹک اس کے جھلسے ہوئے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کرتی رہی ...... بزرگ عالم نے ہاتھوں کی ریت کو جھٹکا دیا۔آسمان میں شور کرتی اور چیختی سورج کی کرنوں کو دیکھا اور کہا' سنو بانو ! ساڑھے سات سو سال حکومت کرنے کے بعد، پورے اندلس میں صرف غرناطہ وہ شہر تھا جہاں مسلمانوں کی حکومت باقی بچی رہی تھی ۔پھر ایک ایک کر کے مسیحی برادران مسلمانوں کے ایک ایک علاقے پر قابض ہوتے گئے ۔آہ ......اسلام تو قائم رہا ، زوال تو مسلمانوں کو آیا۔سقوط غرناطہ کے بعد مسلمانوں سے



کہا گیا کہ زندہ رہنا چاہتے ہیں تو اپنا مذہب بھول جائیں۔خیر کا واحد راستہ یہ ہے کہ مسیحیت کو قبول کریں کہ مسیح ان کے پیغمبروں میں سے ایک ہیں ۔

گل بانو نے زنجیروں سے بندھے ہوئے نظیرے کی طرف دیکھا ، جو بندھے ہاتھوں کے باوجود، عالم کے ہاتھوں کا بوسہ لے رہا تھا۔اور نظیرے نے پلک جھپکاتے ہوئے دریافت کیا ، کیا مذہب کی قدر اتنی ہے کہ انسان چبھتی ہوئی ریت سے خوف زدہ ہو جائے۔

گل بانو نے عالم کی آنکھوں میں نمی دیکھی ۔ عالم نے پھر دہرایا۔آہ غرناطہ...... مسلمان جب اس کے لئے تیار نہیں ہوئے تو نئے مسیحی فرمان اور قانون لائے گئے ۔انہیں شہریت سے بے دخل کیا گیا،انہیں اذیت دی گئی ۔ بے شمار نفوس کو اسی صحرا کے حوالہ کیا گیا ، جہاں اس وقت ہم اور تم ہیں ۔ جلا دینے والی سورج کی تپش ہے ۔انگارے جیسی گرم ریت ہے......اور اس طرح اسپین سے مسلمانوں کو نکال کر انتقام کے ڈراؤنے خواب کی تکمیل کی گئی ۔

پھر کیا ہوا ؟ گل بانو کے لہجے میں درد سمٹ آیا تھا۔عالم نے گہری سانس لی ......مسلمان شمالی افریقہ کی طرف ہجرت کو مجبور ہوئے ۔ بھوکے پیاسے ...کربلا کا منظر...... بچے ،عورتیں ......بھوک سے تڑپتے ......اور پھر رہزنوں کا قافلہ......قتل عام ...... بیماریاں، تعفن ،غلاظت،اور قریب آتی ہوئی موت، جو مر جاتے ، انکے سگے رشتے دار جشن مناتے کہ اذیتوں کے لامتناہی سلسلے سے اس شخص کو نجات مل گئی ۔ اسپین سے مسلمانوں کے ساتھ یہودیوں کو بھی بے دخل کیا گیا ۔ یہودیوں کا متمول طبقہ ہجرت کر کے یوروپی ممالک کی طرف نکل گیا۔سلطنت عثمانیہ کی اجازت سے مسلمان ترکی اور مشرقی یوروپ میں پناہ گزیں ہوئے ۔ اس کے بعد غرناطہ میں مذہبی عدالتوں کا وجود ہوا۔ جو مسلمان مسیحی مذہب کو قبول کر لیتے وہ عذاب سے بچ

جاتے جونہیں قبول کرتے انھیں سلگتے الاؤ میں پھینک دیا جاتا ......عربی زبان پر
پابندی عاید کی گئی۔مسلمان بچوں کے گلے میں صلیبوں کا طوق ڈالا گیا۔عربی زبان
وادب کی ، ہزاروں برسوں کی کتابیں نذر آتش کر دی گئیں۔اوراس کے بعد اسپین
مسلمانوں سے خالی ہو گیا......

عالم نے گہری سانس لی......ہم تاریخوں کو مرتے ہوئے اتنی بار دیکھ چکے ہیں
کہ اب خوف زدہ نہیں......مگر ہمارے بچے ،العطش ،العطش ......

عالم خاموش تھا...... ریت نے اسکے چہرے پر قبضہ کر لیا تھا۔آنکھیں پتھرا گئی
تھیں ۔ وہ اچانک زمین پر گرا اور گل بانو کے ہونٹوں سے تیز چیخ نکلی۔لیکن یہ چیخ
ریت کی آندھی میں کھو گئی۔

ایسا بہت کچھ ہو رہا تھا، جو پہلے کبھی نہیں ہوا۔ پہلے کبھی اس طرح دھویں کے
پہاڑ چلتے ہوئے اس کمرے میں نہیں آئے۔ پہلے کبھی خوابوں میں، اس نے کبھی
شیر، ہرن، بارہ سنگھا، بھیڑیے، بندروں کی فوج کے درمیان خود کو نہیں دیکھا۔
بندروں کی فوج....گل بانو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی جگہ تلخی تھی۔اس نے بندروں
کو مختلف مقامات پر دیکھے تھے، لیکن یہ وہ بندر نہیں تھے۔ یہ دنیا کے سب سے
خطرناک بندر تھے۔ یہ گھروں میں چلے آتے، دکانوں میں داخل ہو جاتے۔سڑکوں
میں پھیل جاتے اور ان بندروں کا تماشہ ایک ہی تھا، قتل۔لوگوں کو ہلاک کرو۔ایک
بڑی آبادی کو مار ڈالو...اسے تعجب ہوا، جب اس نے مرحوم سپر اسٹار راجیش کھنہ کو
ان بندروں کے درمیان دیکھا...اور نیند کھلنے پر محسوس کیا کہ بہت سے خواب ایسے
بھی ہوتے ہیں، جن کا سر پیر نہیں ہوتا۔اب بندروں کے ساتھ راجیش کھنہ سپر مین
بن کر کھیل رہے تھے۔اس کے کیا معنی ہیں۔لیکن اس کے پس پشت کوئی تو کہانی



تھی۔مثال کے لیے اس وقت اس نے فلمیں دیکھنا بند کر دیا تھا، کیونکہ فلمی دنیا کی
بیشتر ہستیاں اس گینگ سے وابستہ تھیں، جہاں بندر تھے، شیر تھا، بھیڑیے تھے...اور
یہ دنیا ان بندروں کے قصیدے پڑھ رہی تھی، جن کے نام پر لق ودق صحرا کے
دروازے کھل رہے تھے اور گل بانو تیس کروڑ آبادی کو زنجیروں میں لپس اس صحرا
میں دیکھ رہی تھی...خود کو گھسیٹتے ہوئے۔زخموں کی پرورش کرتے ہوئے، لاچار، بے
بس، موت کے منتظر اور لق ودق صحرا میں چاروں طرف بے شمار لاشیں بچھی ہوئی
تھیں، گل بانو جن کی گنتی بھی بھول گئی تھی۔

اور، جو کچھ وہ سوچ سکتی تھی، ایسے خیالات اس کے ذہن میں پہلے کبھی نہیں
آئے۔ پہلے کبھی اس نے اس فٹ بال کو نہیں دیکھا جو پھولتے پھولتے ایک بڑے
غبارے میں تبدیل ہو گیا۔ پھر خاکی نیکر پہننے والوں کی فوج آئی۔ ہوا میں اڑتی
ہوئی زعفرانی چیزیاں تھیں، جو خاکی نیکر پہننے والوں کے گلے سے لپٹ گئیں، پھر
یکا یک تیز آندھی میں اس نے ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں کی تعداد میں شمشیروں کو
اڑتے ہوئے پایا....اور ایسی ایک شمشیر ہر اس خاکی وردی والے کے پاس آ گئی، جو
غبارے سے کھیل رہا تھا...اور ان میں ایک شخص تھا، جو گنجا تھا۔ ایک کی داڑھی
تھی....اور یہ دونوں ان کروڑوں خاکی نیکر والوں کی قیادت کر رہے تھے... اور
اچانک اس نے بڑے سے غبارے کو، جو کبھی چھوٹا سا فٹ بال تھا، پھٹتے ہوئے
دیکھا۔غبارہ ایسے پھٹا جیسے ایٹم بم پھٹتے ہیں۔ پھر گل بانو نے غباروں سے خون کی
دھار بہتے ہوئے دیکھا...اور یہ بھی دیکھا کہ خاکی نیکر والوں کی فوج تبرک کے
طور پر خون چاٹتی ہوئی نئے برس کے جشن میں شامل ہو گئی ہے۔

گل بانو خوفزدہ تھی کہ وہ مالیخولیا کے مرض میں تو گرفتار نہیں ہو گئی۔مگر وہ اچھی

خاصی صحت مند تھی۔ نیا سال دستک دے چکا تھا۔ کھڑکی کے باہر دھند تھی دھند کے باہر موت تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ غضب، کیا وہ شاعرہ بن گئی ہے... اس نے پھر دہرایا۔ کھڑکی کے باہر دھند.... دھند کے باہر موت، موت کے ہاتھ میں ٹوپی... جشن منائے گوپی...

کیا وہ پاگل ہورہی ہے؟ لق ودق صحرا، جہاں وہ زنجیروں میں تھی... اور جہاں اس کی ملاقات اس بزرگ عالم سے ہوئی تھی اور جہاں ایک طرف، دھند میں، زنجیروں میں قید اس نے چندا یادو کو بھی دیکھا تھا... اور یہ سب کیا تھا کہ وہ ایک نئی دنیا کی تخلیق، خیالوں میں کررہی تھی... اور یہاں خون چاٹنے والے آدم خور بندر تھے۔ نئے سال کے بطون سے خون پینے والے سور پیدا ہورہے تھے۔ خون پینے والے سور، آدم خور بندر اور نظیرے.... یہ کیا تک ہے۔ نظیرے کہاں سے آگیا؟ گل بانو آہستہ آہستہ چلتی ہوئی نظیرے کے کمرے کی طرف گئی۔ نظیرے کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کے چہرے کے آس پاس روشنی پھیلی تھی۔ اس روشنی کو دیکھ کر اسے خوشی کا احساس ہوا... اور پھر اسے یاد آیا، اس لق ودق صحرا میں، اس عالم نے کہا تھا، عذاب بھیجنے والے بندر زندہ ہیں، ایسا سوچنا مذاق ہے، کیونکہ خونی بندر اصل میں بدروحیں ہوا کرتی ہیں جو زندہ ہونے کا ڈھونگ کرتی ہیں... اور ایک دن جب اس لق ودق صحرا میں کچھ لوگ بچ جاتے ہیں اور وہ صحرا سے باہر نکل کر اپنی دنیاؤں میں پہنچتے ہیں۔ تو یہ بندر مرچکے ہوتے ہیں۔ عام موت نہیں، بھیانک موت، خودکشی، ہاتھی کے پاؤں کے ذریعہ کچلنے کے حادثے بھی ان ہلاکوؤں کے ساتھ ہوئے ہیں اور بانو، دہشت کی عمر زیادہ نہیں ہوتی، مگر جتنی ہوتی ہے، کسی عذاب سے کم نہیں ہوتی۔



دھند میں، اس نے کھڑکی کے باہر دیکھا تو ہوا تیز تھی۔ ہر شے اڑ رہی تھی... پتّے، چھتیں، کمزور درخت، کاغذ کے بے شمار ٹکڑے... اور ان واقعات کے درمیان اسے خبر ملی تھی کہ چندا یادو کو پولیس والوں نے مار دیا۔ یونیورسٹی میں احتجاج کے پورے بیس دن ہوگئے تھے... اور مارنے والے پولیس کے طور پر اجیت سنگھ راٹھور کا نام سامنے آرہا تھا۔ میڈیا کے مطابق، راٹھور نے بڑا کام کیا ہے۔ حکومت کا بیان تھا کہ مجرموں کو سزا دینا ہی پولیس کا کام ہے۔ ملک کی مختلف ریاستوں میں آدم خور بندروں کے کرشمے جاری تھے مگر چندا یادو.....

گل بانو کو سب کچھ یاد آگیا... اور وہ لمحے جو چندا کے ساتھ گزرے، وہ اس کی ملکیت تھے۔ چندا کا چہرہ، چندا کے الفاظ، چندا کے ہاتھوں کا لمس... یہ خبر اس نے ٹی وی پر سنی اور اسے یقین تھا، ایسا ہونا تھا اور ایسا ہوگیا۔ لق ودق صحرا میں چندا کو دیکھنے کے بعد اسے یقین ہوگیا تھا کہ چندا یادو زیادہ دنوں تک اس کے ساتھ نہیں رہے گی.... یہ اس کی چھٹی حس ہے، جو اکثر خاموشی سے ایسے پیغامات سنا کر اس کے جسم میں ہلچل پیدا کردیتی ہے۔

چندا یادو کی لاش اس کے خاندان والوں کے حوالے نہیں کی گئی۔ یونیورسٹی ایریا میں کرفیو لگا دیا گیا۔ احتجاج کچل دیا گیا۔ پہلے دن چار، دوسرے دن سات اور تیسرے دن یونیورسٹی کیمپس سے پورے پچاس لوگ غائب ہوگئے۔ خونی بندر۔ گل بانو کی آنکھیں نم تھیں اور بار بار چندا کا چہرہ اس کی نگاہوں کے آگے دوڑ رہا تھا۔ اس کی بے قراری زلزلہ کی نظر ہو جاتی، اگر نظیرے نے اس کے زخموں پر مرہم نہیں رکھا ہوتا...

چندا یادو... گل بانو کہتے کہتے رُک گئی...

'وہ ملک کی بیٹی تھی...'

'کیا وہ ہندو تھی؟'

'نہیں۔' نظیرے کی آنکھیں اس لمحہ چھت کو دیکھ رہی تھیں... وہ فرشتہ تھی اور فرشتے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ خدا کے بھیجے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہندو اور مسلمان نہیں ہوتے۔ وہ انسانوں کی حفاظت کے لیے انسانی بھیس میں آسمان سے اتار دیے جاتے ہیں۔ وہ سب کے ساتھ تھی۔ وہ تمہارے ساتھ تھی گل بانو۔ وہ میرے ساتھ تھی، دراصل وہ ان بے رحم آدم خور بندروں کے لیے آئی تھی۔ بے رحم، آدم خور بندر...اور تم سمجھ رہی ہو نا...'

' ہاں میں سمجھ رہی ہوں.....'

'تمھیں سمجھنا چاہیے...صرف کچھ برس...جنگل میں آگ لگ گئی۔جنگلی جانور ہمارے درمیان آ گئے۔غبارہ لے کر۔ان کا غبارہ میرے غبارے سے الگ کیوں؟ کون سا غبارہ؟ کس کے ہاتھ میں ہے؟ اب اسی غبارے سے انسان کی شناخت ہوگی...اور جو بے شناخت ہوں گے...' نظیرے رُکا۔ پھر مسکرایا...دیکھو، ان ہونٹوں پر ریت اب بھی جمع ہے...اور وہ لق ودق صحرا...تمھیں یاد ہے نا....؟'

'ہاں، سب کچھ یاد ہے۔لیکن چندا یادو...'

'جب وہ ماری گئی، اس وقت اس کے ہاتھوں میں ایک بینر تھا۔'

'بینر؟'

'ہاں۔'

'کیسا بینر...'

نظیرے کی آنکھیں کھڑکی کے باہر دیکھ رہی تھیں۔ جیسا اس دن، اس نے تمھیں یونیورسٹی میں دیا تھا اور مجھے بھی۔مگر وہ بینر یونیورسٹی والے بینر سے مختلف تھا۔ اس بینر پر لکھا تھا، کاش تم لندن سے آتے...اور دیکھو گل بانو میڈیا زور شور



سے قیاس لگانے کی کوشش کر رہا ہے کہ اس کے معنی کیا ہیں۔کاش تم لندن سے آتے، آخری بار چندا کے ہاتھ میں یہی بینر تھا۔میڈیا کے رجت یادو نے ایسا ہی بینر اسامہ کے ہاتھوں میں دیکھا تھا جب اسامہ روپوش تھا اور اس کا انگریز صحافی دوست اس کا انٹرویو لینے کے لیے زمین دوز گپھا میں گیا تھا...اور ہاں اس صحافی کا نام مسٹر شیلوس تھا اور شیلوس نے بتایا کہ وہ ایک چھوٹے سے بینر کو لیے کھیل رہا تھا اور اس پر لکھا تھا، کاش تم لندن سے آتے...'

' چندا یادو کے ہاتھ میں بینر...' تعجب سے گل بانو نے نظیرے کو دیکھا۔ 'مگر میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔کیا چندا یادو لندن جانے والی تھی؟'

' آہ نہیں' نظیرے ہنسا...' جیسا کہ یہ بندر عوام کو کنفیوز کرتے ہیں...تو سمجھ رہی ہونا...لق ودق صحرا ہے...اور نہیں ہے..کیمپ ہے....اور نہیں ہے...شہریت ہے اور نہیں ہے۔ بندر ہے اور نہیں ہے....غبارہ ہے...اور نہیں ہے....ٹھیک اسی طرح... مگر.....ایک اینکر نے ایک دلچسپ معاملہ اٹھایا ہے کہ ان دنوں آئی ایس آئی کے بندر لندن شفٹ کر چکے ہیں۔مختلف طرح کی قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں۔' کاش تم لندن سے آتے' کے تصور میں سلیمان ابراہیم کو بھی دیکھا جا رہا ہے۔...'

'سلیمان ابراہیم؟'

' وہ جو دبئی چلا گیا...' نظیرے ہنسا پھر خاموش ہو گیا۔ مجھے بھی کوفت ہے کہ آخر یہ لندن کا ماجرہ ہے کیا؟ اور مرتے وقت چندا کے ہاتھ میں یہ عجیب سا بینر کیوں تھا۔کاش تم لندن سے آتے؟ ہے نا عجیب وغریب۔ آخر اس کا کیا معنی ہوسکتا ہے۔...؟

' پتہ نہیں۔' گل بانو کا چہرہ زرد تھا۔ اس کے اندر ابھی ابھی طوفان اٹھ رہے

تھے... جو لندن سے آئے تھے، وہ لندن چلے گئے۔...اور یہ بندر... بے رحم آدم خور بندر.... طوفان تیز ہوگیا تھا... یہ بندر ہزاروں کو ساتھ لے گئے۔ ملک کو خونی غباروں سے بھر دیا اور اس کی پیاری دوست چندا یادو.... گل بانو نے محسوس کیا کہ اس کی پلکیں بھیگ چکی ہیں... آنکھیں بند ہیں اور بند آنکھوں کی پتلیوں پر چندا یادو آ کر بیٹھ گئی ہے... اور اس سے ذرا سے فاصلے پر اجیت سنگھ راٹھور کھڑا ہے....

گل بانو نے آہستہ سے پوچھا.. 'کیا یہ وہی دنیا ہے....؟'

'کیا خالہ نور جہاں کی دنیا وہی ہے....؟'

'نہیں؟'

'اور تمہاری دنیا گل بانو..'

وقت بدلتا ہے... وقت میں گھرنی لگی ہوتی ہے... اور کسی کو نہیں معلوم کہ وقت ان کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہے۔

'ہاں۔ چندا چلی گئی۔' نظیرے نے اس کے ہاتھوں کو تھام لیا۔ اس کی گرفت مضبوط تھی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ نظیرے اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا، وہ الفاظ کو سجانے میں مصروف تھا۔ اور پھر نظیرے نے اس کی طرف دیکھا۔

'ابھی تم نے کہا نا، کیا یہ وہی دنیا ہے... لق و دق صحرا... اجنبی لوگ... کروڑوں کی تعداد... آدم خور بندر... میں چاہتی ہوں... تم اب راستہ بدل دو۔'

'راستہ؟' گل بانو اچانک چونکی۔ اس نے حیرانی سے نظیرے کی طرف دیکھا... نظیرے... وہ بولتے بولتے رُک گئی۔

'آہ کردار بدل گئے... رشتے بدل گئے... اسپتال سے، جہاں تم مجھے دیکھنے گئی تھی... اور یہ گھر جہاں اب میں مہمان نہیں ہوں۔ میں تمھیں اب کسی راٹھور کے پاس جانے نہیں دوں گا۔...'



'ایک بار۔' گل بانو کہتے کہتے ٹھہر گئی۔

نظیرے نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ ہنسا... ایک دلاّ... مگر میں سمجھتا ہوں، علم میں طاقت ہے اور میں غباروں کی طرف چھلانگ لگا سکتا ہوں... اور خالہ کو اور تم کو گل بانو... تم سمجھ رہی ہونا، اگر تم اس کو اپنی آزادی پر قدغن نہ سمجھو....' اور پھر نظیرے نے ٹھہر کر کہا..' اور تم نے دیکھا۔ چندا چلی گئی۔ نئے برس کی صبح ہونے تک بہت سے لوگ چلے گئے... اور میں چاہتا ہوں تم کہیں نہ جاؤ۔ تم یہیں رہو... اور... میں روح کے پرانے لباس سے کچھ کیلیں نکال رہا ہوں... ایک نئے ماسک کے ساتھ... اور ابھی میں اس کی وضاحت نہیں کرسکتا...'

'ایک بار اور...' گل بانو ابھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی...' اور میں جانتی ہوں نظیرے، تم ان لوگوں سے بہتر ہو جو بندروں کا ماسک لیے گھوم رہے ہیں۔ تم سب سے بہتر ہو... مگر ایک بار....'

'ہاں، وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔ مگر میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔'

'راٹھور؟'

'ہاں..'

'اس سے بات کرو... بات کرو نظیرے...'

'وہ آج رات ہی ملنا چاہتا ہے... اور اسی ہوٹل میں....'

'میں ملوں گی اس سے....'

ٹھیک اسی وقت باہر سے دھماکے کی آواز بلند ہوئی تھی۔ باہر کہرا چھایا تھا اور گھنے کہرے میں اس وقت کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

## (10)

جب گل بانو ہوٹل کی طرف بڑھ رہی تھی، اسے یقین تھا کہ بندروں کی فوج مختلف چوک اور شاہراہوں پر حملہ کر رہی ہوگی... اور سرکاری آدمی گھر گھر جا کر شہریت کا فارم پُر کر رہے ہوں گے، جیسا کہ ان دنوں ہو رہا تھا اور زندگی اس مذاق میں شامل تھی، جہاں بندروں جیسے چہروں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔

یہ دلّی کا سرد ترین دن تھا۔ پرندے غائب تھے اور سڑکوں پر گاڑیاں بھی کم دوڑ رہی تھیں۔ ہوٹل گیٹ سے آگے بڑھ کر اس نے راٹھور کے کمرے کے دروازے کا بیل بجایا۔ دروازہ کھلا۔ سامنے راٹھور تھا۔ اس وقت بھی وہ وردی میں تھا۔ راٹھور نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ گل بانو نے کمرے کا جائزہ لیا... دیوار... چھت... پینٹنگز... میز، کرسیاں، صوفے، بستر، دراز کے اوپر راٹھور کا پستول پڑا تھا۔ ہوٹل آنے تک اس کے سر میں درد نہیں تھا۔ مگر اب وہ شدید درد محسوس کر رہی تھی اور اس درد کے عالم میں اس نے کئی بار کمرے کو جھولتے اور ڈولتے ہوئے محسوس کیا۔ اچانک اس نے دیکھا کہ راٹھور کے چہرے کا رنگ بدل رہا ہے۔ پہلے اس کا چہرہ



سرخ ہوا۔ پھر زردی مائل... پھر اس کے چہرے پر بے شمار لکیریں پیدا ہوئیں۔ ذاتی تجربے کی بنا پر وہ راٹھور جیسے شخص کا جسمانی تجزیہ آرام سے کر سکتی تھی۔ اسے کمرے میں کچھوے اچھلتے ہوئے نظر آئے تو وہ مسکرا پڑی۔ اور اس نے دو سانپوں کو دیکھا، جو لہراتے ہوئے اس کے جسم پر اپنا گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ یہ راٹھور تھا۔ اس پر جھکا ہوا... اس کے ہونٹوں پر۔ اس کے دانت پیلے تھے اور ہونٹوں سے بدبو پھوٹ رہی تھی۔ وہ اس ہاتھوں کو جھٹک نہیں سکتی تھی۔ یہ اس کے پیشے کے خلاف تھا۔ مگر اس وقت وہ سانپوں کی کریہہ آواز کو محسوس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ راٹھور اس پر جھکا اور دوسرے لمحے وہ اسے لے کر بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ بہت تیزی سے اپنی وردی اتار رہا تھا... اور یہ پہلا موقع تھا جب گل بانو کھلکھلا کر ہنسی۔

’کچھوے...‘

’کہاں...؟‘

راٹھور ننگا تھا۔ اس کی سانس تیز چل رہی تھی۔

’کچھوے تمہارے کمرے میں...‘

’پاگل ہو...‘ راٹھور نے اس بار زبردستی کی... اس کے جسم پر سوار ہو گیا۔ اس کے پاؤں پتلے اور بدصورت تھے۔ چہرے پر ایک کٹ کا بڑا سا نشان تھا۔ گل بانو کو احساس ہوا، وہ ایک سوّر کو راستہ دے رہی ہے... راٹھور اس کے سینے کے پاس جھک گیا۔ وہ خاصا عجلت میں تھا اور اس کے چہرے کا رنگ پھر سرخ ہوا اور زرد ہو گیا... وہ اس کیفیت کو پہچانتی تھی۔ اس بار گل بانو کھلکھلا کر ہنسی۔

’پیاز مہنگا ہو گیا۔ ایک سو چالیس روپے کلو...‘

’کیا...؟‘

راٹھور کا چہرہ غصے سے سلگ رہا تھا... پیاز... اور اس وقت...

'ٹماٹر مہنگا ہو گیا...' گل بانو کھلکھلا کر ہنسی۔

'ٹماٹر....؟' راٹھور کو پھر غصہ آیا۔

'تم نے سنا نہیں۔ کچھ عورتیں بینک کے لاکر میں زیورات کی جگہ ٹماٹر رکھ رہی ہیں۔...'

'سالی...' راٹھور نے گندی سی گالی بکی۔ 'ٹماٹر... پیاز... یہ وقت سبزی خریدنے کا ہے...' اس نے پھر گالی بکی اور گل بانو نے دیکھا، اس کے ہاتھوں کے سانپ غائب ہو گئے اور ان کی جگہ سوکھی ہوئی لکڑی نے لے لی۔ بچپن میں اس نے گیلی لکڑی کو چولھے پر سلگتے ہوئے دیکھا تھا۔ کچھ لکڑیاں گھنٹوں بعد بھی آگ نہیں پکڑتی تھیں۔

'کچھوا...' گل بانو نے آہستہ سے کہا... ہرا دھنیا، پودینہ...سب مہنگے ہو گئے۔

گل بانو کو اپنا پورا چہرہ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ راٹھور اس کے جسم سے اتر آیا تھا۔ اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ اس نے زور کا طمانچہ اس کے گال پر لگایا تھا۔ سالی...اس نے پھر گندی سی گالی بکی۔ گل بانو کو احساس ہوا۔ اس کی جانگھوں کے پاس کچھ تیر رہا ہے۔ چپ چپا سا۔ اس نے راٹھور کو دیکھا جو بستر پر گرا ہوا لمبی سانس لے رہا تھا... گل بانو اٹھی۔ ٹاول سے جانگھوں کو صاف کیا۔

راٹھور کو دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

'تم صرف چائے بیچ سکتے ہو...'

'کیا...' راٹھو کے جسم میں کوئی ہلچل نہیں تھی۔

'تم زیادہ سے زیادہ سموسے تل سکتے ہو، پکوڑے بنا سکتے ہو...'

'حرام...زادی...'

'اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے...' گل بانو نے قہقہہ لگایا... آج شراب نہیں



پیو گے؟'

'پیوں گا کیوں نہیں۔'

گل بانو مسکرائی۔ اب پی کر کیا کرو گے...' اس نے پھر شرارت سے کام لیا... 'تمہارے کمرے میں کچھوے آ گئے ہیں....'

'کیا بک رہی ہو' راٹھور ننگے جسم کے ساتھ اٹھا۔ ایک سگریٹ سلگائی۔ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ساری رات پڑی ہے....اور تم....حرّافہ...'

'گالیاں بھی گیلی لکڑی کو سلگا نہیں سکتیں....'

راٹھور اٹھا۔ ایک اور طمانچہ گل بانو کے گال پر لگایا۔ گل بانو کو اس بار بھی ساری دنیا گھومتی ہوئی نظر آئی۔ اس بار دیوار کی اسکرین پر اسے چندا یادو کا چہرہ نظر آیا۔ وہ راٹھور کی طرف مڑی۔

'چندا کو کیوں مار دیا'

'بس مار دیا'

'تم لوگوں کو اظہار رائے کی آزادی بھی پسند نہیں۔ کیوں مارا؟'

'اڑ رہی تھی سالی...'

گل بانو کو اس کا یہ جملہ پسند نہیں آیا... وہ اٹھی... اور ایک تھپڑ راٹھور کے چہرے پر لگایا۔ راٹھور کھلکھلا کر ہنسا... نو سو چوہے کھا کر....'

'تمہارا داؤں تم پر ہی آزما رہی تھی۔ چندا کو کیوں مارا؟' گل بانو غور سے راٹھور کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ اس سرد موسم میں بھی ہارے ہوئے کھلاڑی کی طرح، جو دور سے دوڑتا ہوا آ رہا ہو اور ناکام رہ گیا ہو، ایسے کسی کھلاڑی کی طرح اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں جھلملا رہی تھیں۔

گل بانو نے پھر پوچھا۔ 'چندا کو کیوں مارا...'

’آرڈر ہوا تھا۔سو دو سو کو مار ڈالو۔آندولن ختم ہو جائے گا۔‘
’تو تم نے خود سے نہیں مارا؟‘
’بغیر آرڈر ہم کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔‘ راٹھور ہنسا۔مگر وہ ایک خوبصورت گلہری تھی...ضدی تھی، ورنہ وہ بچ سکتی تھی۔کم از کم دس پندرہ راتیں تو.....‘
’دس... پندرہ...‘ گل بانو نے اپنے جسم میں تیزاب اترتے ہوئے محسوس کیا۔
وہ ہنسی...تمہارے کمرے میں کچھوے ہیں....
راٹھور کے پیلے دانت باہر آ گئے۔’بہت شرارتی ہو...‘
’یہ ہار کیوں جاتے ہو...؟‘
’تم سے......؟‘
’ہاں....‘
’کیکٹس کیوں نہیں بنتے۔‘
’نہیں بن سکتا...‘
’کیوں....؟‘
’تمہارے جسم میں...‘ راٹھور نے اشارہ کیا....اوپر کا حصہ بنگلہ دیش ہے، یہ حصہ افغانستان اور باقی...‘
’پاکستان...‘
گل بانو نے شدید نفرت محسوس کی۔میرے جسم میں لڑکی نہیں، ملک تلاش کر رہے تھے۔؟
’ہاں...‘
بنگلہ دیش اور افغانستان سے زیادہ پاکستان۔کیوں؟ تمہیں تو ہر جگہ پاکستانی نظر آتے ہیں...



گل بانو نے ٹہلتے ہوئے دراز پر رکھا ریوالور اٹھا لیا۔راٹھور زور سے چیخا۔ رکھو.... یہ بھرا ہوا ہے۔
’اچھا، چلتا بھی ہے؟‘
’ہاں کیوں نہیں۔‘
مسکراتی ہوئی گل بانو ریوالور لے کر اس کی گود میں بیٹھ گئی۔مجھے سکھاؤ۔
’کیا کرو گی سیکھ کر۔‘
’سکھا دو۔نیپال کو ماروں گی۔‘
’کیوں؟‘
’وہاں جمہوریت ہے۔‘ گل بانو زور سے ہنسی۔راٹھور نے بتایا کہ اس کے پستول کی تکنیک کیا۔وہ گھما گھما کر سمجھا رہا تھا۔پھر آہستہ سے بولا....رکھ دو.... یہ تیرے بس کا نہیں۔گل بانو نے اپنی تحقیر محسوس کی، مسکرائی لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔
اس وقت اس کا ذہن گھوم رہا تھا اور وہ الف لیلیٰ کے پیتل کے شہر میں تھی، وہ موسیٰ بن نصیر کو دیکھ رہی تھی جو اپنے آدھے لشکر کو لے کر پیتل کے شہر میں داخل ہوتا ہے اور اسے چاروں طرف موت نظر آتی ہے۔اس نے دیکھا کہ چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں بچھی ہیں۔ان میں بچے بھی ہیں، عورتیں بھی، اس کے ساتھی بھی۔اس کے بعد وہ بازار میں نکلا۔عالیشان عمارتیں، بڑی بڑی دکانیں، پیتل کے سامان، مگر سوداگروں کا ہجوم مرا پڑا تھا۔چاروں طرف مردے اور ایسے مردے کہ ان کی کھالوں سے بدبو اٹھ رہی تھی۔پھر موسیٰ ریشم کے بازار میں گیا۔ریشم وکمخواب کے ڈھیر مگر یہاں بھی اس کا واسطہ مردہ سوداگروں سے پڑا، جو فرش پر گرے ہوئے تھے اور ان کی موت کو برسوں گزر چکے تھے۔وہ جواہرات، موتیوں، یاقوت کے بازار میں گیا اور وہاں بھی لاشیں دیکھیں۔صرافوں کا بازار لٹا ہوا تھا۔دکانوں میں سامان

تھے مگر کسی مسافر کا پتہ نہیں۔ پھر وہ عطاروں کے بازار میں گیا۔ مشک، عنبر، عود، کافور کی بوریاں رکھی دیکھیں۔ مگر یہاں بھی اس کے آنے سے قبل موت شب خون مار چکی تھی۔ بازار، چورستے، دکانیں، فرش ہر جگہ لہو کے فوارے اور ان کے مالکان گہری نیند میں سوئے ہوئے... اور موسیٰ خیال کرتا ہے کہ جب سب اسباب رہ جائیں گے یہیں دھرے ہوئے تو پھر زندگی کیا ہے اور سفر کیا ہے؟ حکومت کیا ہے، بادشاہوں کے واہمہ کیا ہیں اور غرور کیا ہے.....

گل بانو نے دیکھا، راٹھور کا جسم بھی اس بازار میں مردہ پڑا ہے اور اس کی کھال سے بد بو اٹھ رہی ہے.... اس نے آہستہ سے کہا... چندا یادو... اور راٹھور ناراض ہوا کہ اس حسین رات چندا کے ذکر کا مطلب کیا ہے۔ گل بانو کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

اس دن تم ہماری قوم کے بارے میں.... اس نے سوال مکمل کیا، راٹھور کی طرف خالی نظروں سے دیکھا اور راٹھور نے اعتراف کیا کہ اسے شدید نفرت ہے بلکہ وہ کسی بھی مسلمان کو یہاں دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس نے ایک بھدّا سا قہقہہ لگایا اور گل بانو عطاروں کے محل میں تھی جہاں مشک عنبر تو موجود تھے مگر انسانی لاشوں کی بدبو سے سامنا کرنا موسیٰ کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے راٹھور کی طرف دیکھا۔ راٹھور ہنس رہا تھا.... اور اس نے کہا کہ تم لوگ یہاں کے نہیں لگتے... گھس پیٹھئے... سمجھتے ہونا... فارنر۔ تم لوگوں کو دیکھتا ہوں تو لگتا ہے ہلاکو اور چنگیز اپنی فوج کے ساتھ آ رہے ہوں۔ نظیرے نے گل بانو کو بتایا تھا کہ ہلاکو اور چنگیز مسلمان نہیں تھے۔ پہلے وہ ان دونوں کو بھی مسلمان سمجھتی تھی۔ گل بانو نے زور سے کہا۔ ہلاکو، چنگیز مسلمان نہیں تھے۔

'تیمور تو تھا۔ لنگڑا۔ تمہارے مغل..'



راٹھور کا لہجہ سخت تھا۔ میرا باپ بھی تم لوگوں سے نفرت کرتا تھا۔ وہ پولیس میں تھا اور کہتا تھا کہ زندگی میں اس نے پانچ مسلمانوں کو مارا۔ وہ اس بات پر خوش ہوتا تھا کہ اس نے پُنیہ کا کام کیا ہے اور ان سارے مسلمانوں کو مار دینا چاہیے...'

اس کے پیلے دانت نمایاں تھے... اور اس وقت اس کا چہرہ انتہائی کریہہ اور بد صورت نظر آ رہا تھا، گل بانو نے پوچھا۔ تمہارا باپ کیسے مرا راٹھور....

'ایک حادثے میں۔ ایک ٹرک اس کے جسم پر چڑھ گیا...'

'تمہارے باپ کے۔'

'ارے ہاں.... اور وہ سڑک پر ہی کچل کر مر گیا۔'

گل بانو نے قہقہہ لگایا۔' ٹرک سے کچل کر....؟ تم اس اذیت کو سمجھ رہے ہو راٹھور۔ نہیں سمجھو گے.. ٹرک... بھاری بھرکم ٹرک... اس کے وزنی پہیئے اور معمولی انسانی جسم... ذرا سوچو تو تمہارے باپ کی کیا حالت ہوئی ہوگی... اور میں کہتی ہوں، جن پانچ مسلمانوں کو اس نے مارا، ان مسلمانوں کو بھی اتنی تکلیف نہیں ہوئی ہوگی...'

راٹھور بستر سے اٹھا۔ سگریٹ سلگائی۔ اب وہ کمرے میں ٹہل رہا تھا... اور گل بانو کو گندی گندی گالیاں دے رہا تھا....

'کسی دن تم پر بھی کوئی ٹرک چڑھ جائے گا...'

راٹھور نے ایک زور کا تھپڑ اس کے گال پر مارا...

گل بانو نے برا نہیں مانا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی... 'ہاں، تم نے بتایا نہیں کہ تم نے چندا یادو کو...'

'یہ سب سالے...' اس کے سگریٹ کا دھواں کمرے میں پھیل رہا تھا... 'یہ سب...' وہ آگے بڑھ کر کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا.... کھڑکی پر شیشہ لگا تھا.... گل بانو نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر ریوالور اٹھایا... آدھی رات گزر چکی تھی... اس نے

نشانہ لگایا... راٹھور اب بھی شیشے کے پار دیکھ رہا تھا.... اس نے نشانہ سادھا اور ٹریگر دبا دیا.... پھر اس نے راٹھور کو چیخ کر گرتے ہوئے دیکھا۔ گل بانو کو یقین تھا کہ کچھ ہی دیر میں یہاں بھیڑ اکٹھی ہو جائے گی... سرد رات، پستول چلنے کی آواز... اس نے راٹھور کو زمین پر تڑپتے ہوئے دیکھا۔ اس کے قریب اس کی وردی پڑی تھی، جس پر تمغے مسکرا رہے تھے۔ گل بانو کے جی میں آیا کہ ان تمغوں کو نوچ کر پھینک دے، مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ دروازہ کھولا... وہ کانپ رہی تھی۔ اس نے لفٹ کا استعمال نہیں کیا۔ اسے یقین تھا کہ ممکن ہے گولی کی آواز کو سرد رات میں کچھ لوگوں نے پٹاخے یا آتش بازی کی آواز سمجھا ہو۔ کچھ نے گولی کی آواز سنی بھی ہو تو سرد موسم میں کمرے سے باہر نکلنا منظور نہ کیا ہو... ہوٹل کی گیلری میں خاموشی تھی، سناٹا۔ کوئی نہیں تھا۔ وہ نیچے آئی تو ریسپشن والی لڑکی سو رہی تھی۔ گیٹ کے چوکیدار نے گیٹ کے پاس ہی بستر بچھا لیا تھا۔ مگر گیٹ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ وہ تیز قدموں سے گیٹ کی طرف بڑھی اور ہوٹل سے باہر نکل آئی۔ اس کے سینے میں ابھی بھی ہلچل مچی تھی۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ مگر وہ مطمئن تھی کہ اس نے ایک گندگی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ رات آدھی گزر چکی تھی۔

سڑک سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ الف لیلیٰ کے اسی تیل کے بازار میں تھی جہاں موسیٰ بن نصیر نے اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ ڈالا تھا اور اسے سارا شہر مردہ نظر آ رہا تھا۔ سامنے ایک پارک تھا۔ ہوا خاموش۔ درخت چپ۔ پتوں میں جنبش نہیں۔ کہیں دور تک کوئی کتا تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ سڑک سے کبھی کبھی اکا دکا گاڑیاں پاس کر جاتیں... اس نے ایک دیوار کی آڑ لی۔ کیا سچ مچ پستول کی گولی کی آواز کسی نے نہیں سنی؟ اتنی دیر میں تو افراتفری مچ جاتی...



ٹھنڈ عروج پر تھی۔ گل بانو خوفزدہ تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ گرفتار کر لی جائے گی۔ اس لیے وہ گھر جانا نہیں چاہتی تھی۔ مگر سوال تھا کہ وہ کہاں جائے؟ کون اسے پناہ دے گا۔؟ اس وقت دماغ شل تھا اور تیز آندھیوں کی زد میں۔ اس نے ایک خالی آٹو والے کو ہاتھ دیا۔ آٹو والا رُک گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ گھر جا رہا ہے۔ مگر آگے گل مہر پارک تک وہ اسے لے جا سکتا ہے۔ وہاں سے کچھ نہ کچھ اسے مل جائے گا یا پھر وہ کیب کر لے۔ کیب والے آسانی سے کسی وقت بھی آ جاتے ہیں۔ اس نے آٹو والے کو چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ گھبرائی ہوئی آٹو میں بیٹھ گئی۔ ٹھنڈ اسے بالکل بھی نہیں لگ رہی تھی۔ مگر اسے پناہ چاہیے تھا۔

کیا حقیقت میں کہیں پناہ ہے۔؟

موسیٰ بن نصیر اپنے لشکر کے ساتھ لوٹ گیا تھا... کیا اسے کوئی پناہ دے گا، ان حالات میں، جب ایک مخصوص لباس نفرت کا حامل بن چکا ہے۔ جب ایک نام اچانک کچھ لوگوں کو چونکا دیتا ہے۔ جب ایک کردار، ایک شخصیت، ایک وجود کے ساتھ خوفناک قید خانے سامنے آ جاتے ہیں، جہاں ایک حکمراں سر عام ایک قوم کے لوگوں کی ہلاکت کا جشن مناتا ہے اور مخصوص نام والے آدمیوں کے لیے ڈیٹنشن سینٹر کے دروازے کھولتا ہے۔ جہاں ایک کال کوٹھری میں سو سے زیادہ لوگ ہوتے ہیں اور یہ لوگ آرام سے پاؤں بھی نہیں پھیلا سکتے... ان پر راتوں کی نیند تنگ ہوتی ہے اور بیداری کی اذیت کا عذاب بھیجا جاتا ہے اور پھر ان کال کوٹھریوں میں گئو موت... تعفن... بدبو کے ریلے اٹھتے ہیں۔ وہ موسیٰ بن نصیر کے لشکر کے ساتھ ہے یا تعفن زدہ کوٹھری میں پھینک دی گئی ہے۔... آٹو والا رُک گیا تھا۔ اس نے پیسے بھی نہیں لیے۔ گل بانو کو اتارا اور سناٹی سڑک پر اس کا آٹو اوجھل ہو گیا...

گل بانو کچھ دور چلتی ہوئی ایک درخت کے سایے میں ٹھہری۔ اس نے دیکھا دور کھڑا ایک کتا سردی میں کانپ رہا ہے۔ مگر اس سرد موسم میں کتا بھی اپنی آواز بھول گیا ہے۔... کیا وہ کسی کا دروازہ کھٹکھٹائے۔ فرض کیجیے دروازہ کھل گیا تو وہ کہے گی کیا؟ کہ وہ کسی کا قتل کر کے آ رہی ہے... اور کوئی اسے کوئی کیوں پناہ دے گا۔ اتنی بڑی سرزمین پر.... اور یہ سوچنا غلط نہیں تھا کہ اس کے لیے تمام دروازے بند ہو چکے ہیں۔ اور پناہ.... یہ لفظ لغت سے نکالا جا چکا ہے۔

اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اس وقت سیاہ بادلوں کا کارواں تھا، جس نے آسمان کو ڈھک لیا تھا۔ ممکن ہے، کچھ دیر بعد بارش بھی شروع ہو جائے۔ مگر وہ.... اس حال میں کہاں جائے گی...

وہ الف لیلیٰ کی داستانوں میں اس وقت پیتل کے بازار میں تھی.... اور اس کے لیے کہیں بھی جائے اماں نہیں تھی۔

یقیناً سیاہ بادلوں سے بارش کی بوندوں کا راستہ نکلے گا۔

پناہ.... اسے بارش کا انتظار نہیں تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ بارش ہونے سے قبل وہ خود کو محفوظ مقام پر دیکھنے کی خواہشمند تھی۔ اس کی سانس پھول رہی تھی... وہ تیز تیز دوڑنا چاہتی تھی، اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ابھی تک راٹھور کے قتل کو لے کر کوئی ہنگامہ نہیں ہوا ہے۔ مگر اسے اس بات کا یقین ہے کہ ہنگامہ ضرور مچے گا اور پھر اس کی تلاش شروع ہو گی۔ رات آہستہ آہستہ ڈوب رہی ہے۔ آسمان پر سیاہ بادلوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ بارش کسی وقت بھی ہو سکتی ہے۔

پناہ.... اسے خیال آیا کہ ایک پوری دنیا تبدیل ہو چکی ہے۔ وہ قاتل ہے تو اسے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اقتدار کو قتل و دہشت منظور ہے اور قاتل آزاد.... اور اس وقت اقتدار کا حصہ ہیں۔ اسے کچھ نہیں ہو گا۔ مگر اس کا نام....



اس کا لباس....

اس نے دیکھا، سامنے سے چلتا ہوا کتا اس کے قریب آ کر درخت کے سایے میں بیٹھ گیا۔ ٹھنڈ کتے کو بھی لگ رہی تھی اور شاید اسے بھی۔ احساس ہوا کہ بارش ہونے والی ہے....

یہاں دیر تک ٹھہرنا فضول تھا۔ لیکن پناہ کے نام پر سارے دروازے بند تھے۔ اس نے تیز تیز دوڑنا شروع کیا۔ اسے یقین تھا، اس عالم میں اسے دیکھنے والا کوئی نہیں ہے....

وہ کہاں جا رہی ہے، اسے پتہ نہیں....

خالی سڑک پر اس کے جوتے شور پیدا کر رہے تھے...

# باب چہارم

# مردہ خانہ میں عورت

(1)

گل بانو تھوڑا اور آگے بڑھی تو راستہ بند تھا۔ وہاں ایک چھوٹا سا پارک تھا...اور اس وقت سیاہ آسمان کی وجہ سے ہر شئے تاریکی میں ڈوبی تھی۔ پارک کے پاس لوہے کی جالیاں لگی تھیں اور یقین کے ساتھ کہا جاسکتا تھا کہ اس پارک میں دن کی روشنی میں بھی کم لوگ ہی آتے ہوں گے۔ اسے خوف بھی محسوس ہورہا تھا۔ سامنے ایک گھر تھا اور گھر کے اطراف میں بھی ایک قطار سے عمارتیں تھیں، لیکن سوال تھا کہ وہ جائے کہاں، کس سے مدد مانگے...اس نے دیکھا کہ پاس میں کچھ گرا ہوا ہے... یہ ایک بورڈ تھا۔ گل بانو نے بورڈ اٹھایا تو اس کے سارے جسم میں خوف سرایت کر گیا۔ بورڈ پر انگریزی میں مردہ خانہ لکھا تھا اور بورڈ کو بے دردی سے پارک کے اس خاموش گوشے میں پھینک دیا گیا تھا۔ اس نے بورڈ کی نیم پلیٹ کو دوبارہ پڑھا۔ مردہ خانہ...اس نے سامنے والے مکان کو دیکھا۔ وہاں تالہ پڑا تھا، مگر اس کے پاس سے ایک چھوٹا سا راستہ اندر کی طرف جاتا تھا۔ گل بانو آہستہ آہستہ اس چھوٹے سے راستے کی طرف بڑھی۔ اب وہ مکان کے پچھواڑے تھی اور



دروازہ بند تھا۔ بجلی کی کڑک کے ساتھ بارش شروع ہوگئی۔ اب اس کے پاس واحد راستہ تھا کہ دروازہ کو کھٹکھٹایا جائے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ جو کوئی بھی ملے گا، اس سے وہ رات گزارنے کی التجا کرے گی اور یہ کہے گی کہ وہ کافی دور سے آرہی ہے... اور اس شہر میں مسافر ہے۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور دروازہ کھٹکھٹانا شروع ہوا۔ ایک...دو...تین...چار... پانچ... بارش نے ٹھنڈک میں اضافہ کردیا تھا۔ گل بانو کو یقین تھا کہ اگر وہ بھیگ گئی تو مر جائے گی۔ اچانک اس نے قدموں کی آہٹ سنی...کوئی دروازے کی طرف آرہا تھا۔ دروازہ کھل گیا...سامنے ایک شخص کھڑا تھا...مگر.....

گل بانو نے کسی ملک کے عجائب گھر میں نصب شیطان کے ایک تصوارتی مجسمہ کے بارے میں سنا تھا۔ اس کا چہرہ وحشت کا عکاس اور خوفناک تھا اور اس چہرے پر باطن میں جگہ بنانے والی گندگی اور تعفن کو نہ صرف دیکھا جاسکتا تھا بلکہ کچھ لوگوں کا قیاس تھا کہ مجسمہ سے بدبو کی لہریں بھی اٹھتی ہیں۔ سامنے جو شخص تھا، وہ کوئی شیطانی مجسمہ نہیں تھا۔ مگر وہ عجیب تھا۔ اپنے چہرے اور لباس کے ساتھ اور تاریکی میں اس کا چہرہ صاف پڑھا جاسکتا تھا۔ وہ سفید لباس میں تھا، جیسے لباس مردے پہنتے ہیں۔ اس کی آنکھیں مردے کی آنکھیں تھیں اور جسم کے کسی حصے یا اس کے کھڑے ہونے کے انداز سے یہ قیاس لگانا مشکل تھا کہ وہ زندہ ہے۔ جو شخص سامنے تھا، اس کی آنکھوں کی پتلیاں ساکت تھیں اور ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ایک روبوٹ ہے۔ جس نے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سنی اور دروازہ کھول دیا اور وہ اس سے زیادہ اپنے کام سے واقف نہیں۔

'باہر بارش ہورہی ہے...'

مسیح سپرا خاموش رہا.....

'بہت سردی ہے اور میں ذرا سا بھیگ چکی ہوں...'

مسیح سپرا اس بار بھی خاموش رہا...

'تم مجھے ڈرا رہے ہو...کون ہو تم...'

مسیح سپرا...آواز سرد تھی....

'اندر آجاؤں...'

'آجاؤ...'

مسیح سپرا نے جگہ دی۔گل بانو اندر آگئی۔مسیح سپرا نے دروازہ بند کیا...گل بانو قتل کرنے کے بعد بھی اس قدر خوفزدہ نہیں تھی، جس قدر خوفزدہ گھر کے ماحول کو دیکھ کر تھی۔اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔کہیں کوئی کھڑکی یا دروازہ نہیں تھا۔ پورے گھر میں کھڑکی اور دروازوں کو سفید چادروں سے بند کر دیا گیا تھا۔کمرے میں گہرا سناٹا تھا...اور اندھیرا...مگر ہلکی روشنی کا احساس ہو رہا تھا جس سے وہ بخوبی اس کمرے کو دیکھ سکتی تھی...اور اچانک گل بانو چونک گئی۔چادر کے قریب ایک مجسمہ تھا۔مجسمہ پر بھی سفید چادر پڑی تھی اور یہ مجسمہ اس وقت اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

یہ ایک عورت کا مجسمہ تھا...

'یہ کیا ہے....'؟ خوفزدہ ہو کر اس نے پوچھا...

'موت کا فرشتہ...'

'تم کیا ہو....؟ عیسائی'

'نہیں...'

'مسیح سپرا'

'یہودی ہو؟'

'نہیں۔'



'پھر کیا ہو...؟'

'مردہ...؟' گل بانو اپنی جگہ سے اچھلی۔تیز سنسناہٹ اس نے سارے جسم میں محسوس کی۔اس کے ہونٹ لرز رہے تھے....ہے....اے....ڈراؤ نہیں۔مگر تم تو زندہ ہو...اور میرے ساتھ کھڑے ہو....'

'واہیات...میں مردہ ہوں...'

'مردے بولا نہیں کرتے...'

'بولتے ہیں...'

'سنا نہیں کرتے...'

'سنتے ہیں...'

'کیسے؟'

'تم نے کبھی قبر میں جھانک کر کسی مردے کو دیکھا ہے....؟'

'نہیں...'

گل بانو کو احساس تھا کہ وہ کسی الف لیلوی دنیا میں آگئی ہے۔اس نے پوچھا...'باہر اسے ایک نیم پلیٹ ملی تھی۔نیم پلیٹ پر مردہ گھر لکھا تھا...'

'وہ میری نیم پلیٹ ہے...'

'پھر اسے پارک میں کیوں پھینک دیا...'

'زندوں کے درمیان مردے نہیں ہوتے...'

'یہ کس نے کہا....؟'

'پولیس نے...'

'اوہ...'

اس کا خوف آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا۔سامنے جو بھی شخص تھا، دلچسپ تھا۔مگر

خودکو مردہ کہہ رہا تھا۔گل بانو نے مسیح سپرا کا جائزہ لیا...اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات
سے عاری تھا۔مسیح سپرا غور سے گل بانو کو دیکھ رہا تھا اور سمجھنے سے قاصر تھا کہ ساری
دنیا میں اس لڑکی کو اس کا گھر ہی کیوں نظر آیا۔مسیح سپرا نے آواز سنی۔گل بانو نے
لمبی سانس لی۔پھر کہا۔

'میں ایک قتل کر کے آئی ہوں..'

'یہاں کوئی زندہ نہیں۔'

'میں نے ایک قتل کیا ہے اور مجھے پناہ چاہیے....'

'پناہ نہیں ہے.... یہ مردہ خانہ ہے..'

'اگر میں مردہ ہو جاؤں....؟'

'تم نہیں ہو سکتی..'

'کیوں...؟'

'کیونکہ تم میں زندگی نظر آ رہی ہے..'

'اگر زندگی اتار دوں تو....؟'

'پھر یہاں رہ سکتی ہو....مگر شرط ہے..'

'کیا...؟'

'تمھیں مردوں کی طرح رہنا ہوگا۔'

'مردے کیسے رہتے ہیں؟'

'مردے سوچتے نہیں... بولتے نہیں... سنتے نہیں۔'

'لیکن تم نے تو آواز سنی۔دروازہ بھی کھولا....اور اب میری بات کا جواب بھی
دے رہے ہو....'

'مردے سوچتے نہیں۔بولتے نہیں۔سنتے نہیں..' مسیح سپرا نے دہرایا...



'تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا...'

گل بانو نے جگہ تلاش کی کہ وہ کہیں بیٹھ سکے۔ سیاہ رات میں جھولتی سفید
چادریں۔ باہر بارش شروع ہو چکی تھی۔بجلی تیز آواز میں کڑک رہی تھی۔گل بانو
سردی کے احساس سے باہر نکل آئی تھی۔فریز کے پاس ایک چھوٹا سا ڈائننگ ٹیبل
تھا...اور صرف ایک کرسی پڑی تھی۔ یقیناً یہ مردہ۔اور اس بات پر اس عالم میں بھی
گل بانو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تیر گئی کہ یہ کھانا بھی کھاتا ہوگا۔کھانا بناتا بھی
ہوگا...اس نے آہستہ سے پوچھا۔

'بھوک لگی ہے....کچھ کھانے کے لیے ہے۔..'

'مسیح سپرا نے فریز کی طرف اشارہ کیا۔کچھ سینڈوچ پڑے ہوں گے'

'مگر یہ سب لاتے کہاں سے ہو؟'

'بازار سے۔'

'مردے بازار جاتے ہیں۔؟'

'ہاں...تم نے سنا نہیں۔بازار میں ہوتے ہیں۔ہزاروں لاکھوں کے درمیاں،
شاپنگ بھی کرتے ہیں۔'

'مردے شاپنگ کیوں کرتے ہیں؟'

'مردوں کو بھی ضرورت پڑتی ہے۔'

گل بانو، مسیح سپرا کے انداز میں بولی۔ واہیات۔مرجانے کے بعد مردوں کو
کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑتی۔

'ابھی تم مری نہیں ہو۔اس لیے نہیں جانتی۔..'

'اچھا ٹھہرو...' گل بانو نے ادھر ادھر دیکھا۔سیاہ کمرے کا جائزہ لیا۔ایک وہ
دروازہ جس سے وہ آئی ہے۔ پیچھے کا دروازہ۔ایک آگے کا دروازہ جہاں تالہ بند

ہے۔اس کے لہجہ میں تجسس تھا۔

’باہر کس راستہ سے جاتے ہو؟‘

سپرا نے اشارہ کیا....

’اس کی کنڈی تو اندر سے ہے....؟‘

’ہاں۔‘

’ پھر؟‘

’دروازہ کھول کر جاتا ہوں۔‘

’ڈر نہیں لگتا۔کوئی چور آجائے۔‘

’نہیں...‘

’مردوں کے گھر میں چور نہیں آتے...؟‘

’نہیں‘

’مردہ گھر سب کے لیے ہے، چور، ڈاکو...لٹیرے...‘

’فرض کرو کبھی چور آگئے.....؟‘

’نہیں آئیں گے‘ مسیح سپرا مطمئن تھا۔آنے جانے کے درمیان کا وقفہ زیادہ نہیں ہوتا۔وہ اپنے لیے مہینے بھر کی شاپنگ کرلیتا ہے۔...باہر جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

گل بانو نے فریز کھولا...ایک سینڈ وچ نکالا۔اسے خوشی ہوئی کہ اس کا ہینڈ بیگ اب بھی اس کے کندھے سے جھول رہا تھا۔اس درمیان وہ اپنے بیگ کو بھول گئی تھی۔یعنی گولی چلانے کے بعد اور دروازہ سے باہر نکلنے سے قبل اس نے بیگ کندھے پر ڈال دیا تھا لیکن آٹو میں بیٹھنے اور سڑک پر بھٹکنے کے دوران اسے اس بات کا احساس تک نہیں تھا کہ بیگ اس کے کندھے سے جھول رہا ہے۔سینڈوچ



فریز میں ہونے کے باوجود تازہ تھی اور گرم کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک سینڈوچ کھانے کے بعد ہی وہ مطمئن تھی کہ اب بھوک نہیں لگے گی اور رات آسانی سے گزر جائے گی۔فریز کے قریب کیچن تھا۔کیچن کی کھڑکی پر بھی موٹے سفید پردے پڑے تھے۔اندھیرے میں اس نے پانی کا گلاس تلاش کیا۔کیچن میں سامان کم تھے، اس لیے پانی کا گلاس اور اکوا گارڈ تلاش کرنے میں اسے دیر نہیں ہوئی۔تازہ دم ہونے کے بعد وہ مسیح سپرا کے سامنے دوبارہ آکر کھڑی ہوئی۔مسیح سپرا حقیقت میں کسی مجسمہ یا کسی مردے کی طرح کھڑا تھا۔گل بانو نے تجسس سے پوچھا۔

’تم مردہ کیوں ہو...‘

’سب مر گئے۔میں بھی...‘

’سب...؟ سب کون...‘

’سب...؟ انسان...عزیز...رشتے دار...‘

’اور باہر؟‘

’باہر بھی مردے ہیں۔‘

لیکن باہر تو گاڑیاں دوڑ رہی ہیں۔لوگ سڑکوں پر چل رہے ہیں...اور بارش کے موسم میں کروڑوں نفوس اپنے گھروں میں لحاف اور کمبل میں دبکے ہوں گے...

’یہ لوگ بھی مرجائیں گے...‘

مسیح سپرا نے کہا تو گل بانو کے جسم میں سرسری دوڑ گئی۔ابھی کچھ دیر پہلے اجیت سنگھ راٹھور زندہ تھا اور مسلمانوں سے اپنی قدیم دشمنی نکال رہا تھا۔اس کے سفاک چہرے پر حیوانیت تھی۔ وہ ساری رات سیکس کرنا چاہتا تھا جبکہ وہ ایک امپوٹنٹ یا نامرد تھا اور راٹھور کو اس بات کا احساس بھی تھا مگر وہ صرف عورت کے

تصور سے خوش رہنے والا ایک درندہ تھا اور وہ کچھ گھنٹے قبل تک زندہ تھا اب وہ ایک مردہ تھا اور اس وقت وہ ہوٹل کے کمرے میں مرا پڑا تھا... یہ لوگ بھی مر جائیں گے۔ مسیح سپرا کی آواز اس کے کانوں میں گونجی....اس نے ٹھنڈی سانس لی...' کیا تم ہمیشہ ایسے ہی رہو گے...'

'ہاں...'

'کیوں...'

'مردوں کی زندگی نہیں بدلتی....مردوں کی زندگی میں یکسانیت رہتی ہے۔ وہ سوئے رہتے ہیں۔ گہری نیند....اور کبھی اٹھ بھی جاتے ہیں۔ اپنی اپنی قبروں سے باہر بھی نکل آتے ہیں اور کبھی کبھی زندوں پر سوار بھی ہو جاتے ہیں۔'

'ہونہہ....'

گل بانو نے اپنے اندر کی سرنگ میں جھانکا۔ الف لیلوی کردار موسیٰ بن نصیر کا لشکر موجود تھا مگر یہ لشکر خوفزدہ تھا۔ پیتل کے بازار میں صرف مردے تھے۔ دکانیں تھیں مگر یہاں بھی مردے۔ بارونق بازار تھے... بارونق اس لیے کہ دکانیں سجی تھیں مگر رکھوالی کرنے والے فرش پر مردہ پڑے تھے۔ خوبصورت سڑکیں تھیں، مگر یہاں بھی چاروں طرف لاشیں تھیں۔ بڑی بڑی عمارتوں کے مکین لاشوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ مردے....مردہ خانہ...سرد خانہ...گل بانو کو احساس ہوا کہ وہ قتل کر کے بھاگی اور اس سرد خانہ میں آ گئی۔ مگر اب؟ اب وہ کہاں جائے گی؟ اماں نور جہاں اور نظیرے کا خیال آ رہا تھا اور ساتھ ہی چندا یادو کا بھی۔ چندا جو اب مردہ تھی اور جسے راٹھور کی گولی نے مردہ لاش میں تبدیل کر دیا تھا اور اب راٹھور بھی وہیں پہنچ گیا۔ مسیح سپرا نے کچھ غلط نہیں کہا۔ مگر یہ شخص پراسرار ہے....اور ایک حقیقت۔ یہ بھی ہے کہ وہ یہاں رہ سکتی ہے۔ گل بانو کو یقین تھا کہ اماں نور جہاں اس کا انتظار



کرنے کے بعد تھک گئی ہوں گی۔ پھر نظیرے کو فون لگایا ہوگا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اس کے بیگ میں اس کا موبائل ہے اور موبائل سے اس کے ٹھکانے کو ٹریس کیا جا سکتا ہے۔ اس نے بیگ کھولا۔ موبائل نکالا...اور موبائل کے سم کے ٹکرے کر دیے۔

'ڈسٹ بن ہے....؟'

'ہاں۔' مسیح سپرا نے کہا...'اور خدا کے لیے موبائل کو ڈسٹ بن میں ڈال دو۔ یہ مردہ گھر ہے اور یہاں موبائل کی ضرورت نہیں۔'

'اچھا....'

گل بانو اٹھی۔ اندھیرے میں ڈسٹ بن تلاش کیا۔ ڈسٹ بن کیچن کے کونے میں سمٹا ہوا تھا۔ اس نے موبائل اور سم کے ٹکرے ڈسٹ بن میں ڈال دیے...وہ دوبارہ سپرا کے سامنے تھی اور اس نے استفسار کیا۔

'کیا یہاں لائٹ نہیں...میرا مطلب ہے روشنی....'

'نہیں۔'

'کیوں؟'

'لائٹ ہے مگر ضرورت نہیں'

'کیوں؟'

'کہا نا، مردوں کو روشنی کی ضرورت نہیں پڑتی۔'

'اوہ...' گل بانو مسکرائی۔ تو مجھے بھی اسی طرح یہاں رہنے کی عادت ڈالنی ہوگی۔

مسیح سپرا نے غور سے لڑکی کا جائزہ لیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس لڑکی کو کیا کہے۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ لڑکی کی موجودگی نے ایک مردے کی تنہائی کو زخمی کیا ہے یا اس کی موجودگی سے اس پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ لڑکی اسے معصوم

لگ رہی تھی... اور اس نے قتل بھی کیا تھا اور قتل کرنے کے بعد پناہ کی تلاش میں اچانک وہ اس مردہ خانے میں آ گئی تھی۔ اسے خدا پر یقین نہیں تھا مگر اسے لگا، شاید اس میں خدا کی مصلحت ہو اور اسے اس بات کا بھی یقین تھا کہ لڑکی کی ذات سے اسے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ بلکہ ایک خیال، اسے مردوں کی صفت سے محروم کر رہا تھا اور وہ یہ تھا کہ لڑکی کی آمد سے سرد خانے کے مزاج میں تبدیلی آئی ہے اور وہ اس تبدیلی کو محسوس کر رہا ہے۔ مگر لڑکی مردہ خانے میں اس طرح نہیں رہ سکتی.... اسے گل بانو کی آواز سنائی پڑی۔

'باہر پولیس میری تلاش میں ہوگی۔ قتل کئے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ گزر چکے ہیں۔ ممکن ہے پولیس کے آدمیوں نے مجھے تلاش کرنا شروع کر دیا ہو۔ اور اس حالت میں، میں کہیں جا نہیں سکتی۔ کیا تم مجھے پناہ دو گے..؟'

'مردہ خانہ سب کے لیے ہے مگر...'

'مگر کیا..؟'

'یہاں رہنے کے کچھ قانون ہیں اور تمھیں اس پر عمل کرنا ہوگا'

'کیسے قانون....؟'

مسیح سپرا نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ 'تمھیں مردوں کی طرح رہنا ہوگا۔ تمھیں مردوں کی طرح زمین پر سونا ہوگا اور یہ لباس جو اس وقت تمہارے جسم پر ہے، یہ لباس مردہ خانہ میں نہیں چلے گا۔ تمہارے لیے لباس لانے ہوں گے۔ شاپنگ کرنی ہوگی۔ مردہ کا لباس سفید کفن ہوتا ہے، جیسا میرے جسم پر ہے۔'

'سفید... کفن...' گل بانو خوفزدہ تھی۔ مگر آہستہ آہستہ وہ خوف سے باہر نکل آئی ... یہ سب مزیدار تھا۔ یعنی جو کچھ ہو رہا تھا... زندوں کی طرح رہ کر اس نے بہت دیکھ لیا۔ اب مردوں کی طرح رہ کر دیکھنا ہے۔ اور وہ باہر نہیں جا سکتی۔ باہر کبھی بھی



پکڑی جا سکتی ہے... اور یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ مردہ خانہ۔ اگر فرض کرو کوئی آ گیا تو وہ چیختا ہوا بھاگ جائے گا۔ وہ یہاں محفوظ ہے۔ وہ جب تک چاہے یہاں رہ سکتی ہے۔ مگر ... اسے حراست کا خوف ہے تو پھر اسے اماں نور جہاں اور نظیرے کے خیال سے الگ ہونا ہوگا۔ اس نے ایک منظر دیکھا۔ اماں نے پریشان ہو کر نظیرے کو فون کیا ہے۔ نظیرے آیا تو اماں نور جہاں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ نظیرے اماں کو لے کر پولیس اسٹیشن جانا چاہتا تھا مگر اماں نے منع کیا کہ اس کے پیشہ کی عورتیں اور پولیس میں عداوت ہے۔ اس لیے جب تک گل بانو نہیں آ جاتی، اماں انتظار کریں گی۔ پھر ایک دوسرا منظر سامنے تھا۔ ہوٹل کے کمرے میں پولیس ہی پولیس ہے۔ پولیس والے ہوٹل کے منتظمین سے گفتگو کر رہے ہیں۔ گل بانو کا خیال تھا کہ پولیس، اماں نور جہاں تک ضرور پہنچ جائے گی۔ اس مردہ خانے میں قدم رکھنے کا خیال پولیس کو نہیں آئے گا۔

باہر بارش تیز ہو گئی تھی۔ بارش کی بوندیں چھت اور دروازوں سے ٹکرا کر جو موسیقی پیدا کر رہی تھیں، ان میں کرختگی شامل تھی۔ گل بانو نے سوچا، کیا برف گر رہی ہے۔ دلی میں کئی موقعوں پر پانی کے ساتھ برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی گرے تھے۔ اس وقت وہ پرانے چکلہ گھر میں تھی اور کھڑکی سے ہاتھ بڑھا کر اس نے کئی برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو اپنی ہتھیلیوں میں جکڑ لیا تھا۔ یہ ٹکرے فوراً پگھل جاتے ہیں۔ زندگی بھی فوراً پگھل جاتی ہے۔ مسیح سپرا اس کے سامنے کھڑا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت وہ کیا کرے۔ مگر گل بانو کی موجودگی سے مسیح سپرا کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس نے پھر دہرایا...

'تم مردہ ہو اور تم کو مردے کی طرح..؟'

گل بانو نے اس کی بات نہیں سنی۔ وہ آگے بڑھ گئی۔ مجسمہ کو اس نے غور سے دیکھا۔ پھر پوچھا....

'یہ کیا ہے؟'

'موت کا فرشتہ...'

'یہ کیا کرتی ہے؟'

'روح قبض کرتی ہے...'

'پھر روح قبض کرنے کے بعد گئی کیوں نہیں؟' اندھیرے میں گل بانو کے چاندی جیسے دانت چمکے۔ گل بانو نے قہقہہ لگایا۔ اس کا مطلب ابھی تم زندہ ہو۔ اگر موت کے فرشتہ نے روح قبض کر لی ہوتی تو پھر یہ موجود نہیں ہوتی...

'یہ احساس ہے...'

'کیا مردہ ہونا بھی احساس ہے....؟'

'ہاں...'

'اور باقی لوگ جو اس زعم میں ہیں کہ زندہ ہیں...'

'انہیں خوش فہمی کا احساس ہے...'

'ممکن ہے...'

گل بانو نے دو تین بار دہرایا۔ اب ایک منظر اس کی آنکھوں میں ابھرا۔ ایک پولیس والا تھا جو ریسپشن گرل سے دریافت کر رہا تھا۔

'تم اس وقت کہاں تھی؟'

'میں سو رہی تھی۔'

'کیا ہوٹل کا اندرونی دروازہ بند نہیں تھا؟'

'چوکیدار وہیں پر سو رہا تھا...'



'ہونہہ...'

پولیس والے نے حیرت سے پوچھا...'بے رحمی سے گولی ماری گئی۔ کیا گولی چلنے کی آواز کسی نے نہیں سنی؟'

'بارش ہو رہی تھی....'

'ایک بج کر ۲۰ منٹ... پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق، اس وقت بارش نہیں ہوئی تھی۔ بارش ڈیڑھ گھنٹے بعد شروع ہوئی۔'

'سردی بہت تھی۔'

'کیا سردی میں گولی کی آواز نہیں گونجتی....؟'

منیجر کی آواز کمزور تھی۔ میں نے بھی اور ہوٹل میں موجود لوگوں نے بھی سمجھا کہ پٹاخے چھوٹ رہے ہیں۔

'کیا دیوالی کی رات تھی؟'

'نہیں۔'

پولیس والے کی آواز میں سختی تھی.... جانتے ہو، کس کا خون ہوا ہے؟ پولیس کمشنر کا۔ سرد ترین رات...مگر وہ لڑکی...وہ لڑکی کس ذات سے تھی؟'

......منیجر خاموش تھا۔

...... پولیس والا چلایا۔ وہ لڑکی کس قوم سے تعلق رکھتی تھی....

پولیس والے تفتیش کے بعد لوٹ گئے۔ گل بانو نے جسم میں سنسناہٹ محسوس کی۔ اب ایک دوسرا منظر سامنے تھا۔ اماں نور جہاں کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ نظیرے ہاتھ باندھے خاموش کھڑا تھا۔ اماں نور جہاں پوچھ رہی تھیں...

'مگر میری لڑکی گئی کہاں؟ کچھ خبر تو ملے۔ وہ کس حال میں ہے۔ کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ کیا ہوا...ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا نظیرے....'

'ہاں اور جو ہوا ہے وہ بھی کبھی نہیں ہوا...؟ نظیرے کی آواز سرد تھی۔
'مگر کیا ہوا ہے....؟'
'خون...' نظیرے کی آواز گونجی۔
'خون؟'
'گل بانو پولیس والے کا خون کر کے ہوٹل سے فرار ہے....'
'ہائے اللہ' اماں نور جہاں زور سے چیخیں۔ اب کیا ہوگا نظیرے....
'خالہ پولیس آتی ہوگی۔'
'پولیس....'
'مگر گل بانو نے کچھ بھی غلط نہیں کیا' سردی سے نظیرے کے دانت بج رہے تھے۔
'ہمارا کیا ہوگا نظیرے؟'
'خالہ...اللہ ہی حافظ ہے۔ اس دور میں جب ہمارے پاس ہمارے ہونے کا کوئی ثبوت نہیں۔ اور وہ کاغذ دکھانے کو کہہ رہے ہیں۔'
'اور جو ثبوت ہوا تو....؟'
'وہ ثبوت والے کاغذات کے ٹکڑے کر دیں گے۔ پھر ثبوت مانگیں گے۔'
'اللہ رحم....گل بانو کا کیا ہوگا....'
'کچھ نہیں کہا جا سکتا خالہ....'

گل بانو سکتہ کی کیفیت میں تھی۔ اس نے دیکھا، مسیح سپرا اس کے چہرے کا غور سے جائزہ لے رہا ہے....اس نے پوچھا....
'کیا تمہیں نیند آ رہی ہے۔'
'نہیں۔ مردے لمبی نیند میں ہی ہوتے ہیں۔'



'ہونہہ' گل بانو نے ٹھنڈی سانس لی۔
'مجھے بھی نیند نہیں آ رہی۔'
'کیونکہ تم بھی مردہ ہو۔'
'ہونہہ' اس بار گل بانو نے سردی سے بجتے دانتوں کی آواز سنی۔ اس نے کہا کچھ نہیں۔ یہ اندھیرا اسے بہتر نظر آ رہا تھا۔ باہر کی روشنی اسے گراں گزر رہی تھی۔ وہ خوش تھی کہ اندھیروں نے اسے پناہ دی ہے...اور وہ نہیں جانتی کہ اندھیروں میں سمٹ کر اسے کب تک رہنا ہوگا۔ اسے نیند آ رہی تھی۔ مسیح سپرا نے اشارہ کیا۔ ایک سفید چادر اس کے حوالے کی۔ زمین پر بچھا دو۔
زمین ٹھنڈی تھی۔ گل بانو چادر بچھا کر لیٹ گئی۔ اس نے دیکھا۔ مجسمہ والی عورت ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

(2)

## صبح گیارہ بجے—

مسیح سپرا اس وقت بھی سفید لباس میں تھا۔ گل بانو سوئی ہوئی تھی۔ مسیح سپرا نے گل بانو کو اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور باہر آ گیا۔ اسے کچھ ضروری شاپنگ کرنی تھی۔ اس نے سفید لباس پہن رکھا تھا۔ سفید تہہ بند اور سفید کرتا اور اسے اس بات کا احساس نہیں تھا کہ دیکھنے والے اس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ وہ ایسی تمام باتوں سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ سڑک پر ایک ہنگامہ برپا ہے۔ دکانوں کے شٹر جلدی جلدی گر رہے ہیں۔ کچھ لوگ حواس باختہ بھاگ رہے ہیں اور کچھ پولیس والے ہیں جن کے ہاتھ میں کاغذات ہیں وہ مسافروں سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں لیکن کوئی بھی مسافر رُکنے کو تیار نہیں۔ پولیس والے بے تحاشہ لاٹھیاں چلا رہے ہیں۔ سڑک کے کنارے چار پولیس کی بڑی وین کھڑی نظر آئی۔ ان میں سے، قطار سے پولیس والے اتر رہے تھے۔ اس نے ایک شخص کو روکا، جس کی داڑھی تھی اور اس وقت جس کے چہرے



سے خون ٹپک رہا تھا۔ مسیح سپرا نے جاننا چاہا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ سامنے والا شخص ایک لمحہ کو رُکا، اس کی طرف دیکھا اور بتایا کہ تم دابہ کے بارے میں جانتے ہو۔

’ہاں‘

’دابتہ الارض.... قیامت کی نشانیوں میں سے ایک....اور ایک جانور تمہارے لیے بھیجا جائے گا جو تمہاری شناخت کرے گا.....‘

’ہاں ‘

’شناخت ہو رہی ہے۔ مگر یہ خدا کے بھیجے گئے دابہ نہیں ہیں۔ ان کی شناخت کے کاغذات میں ہم نہیں ہیں۔ خدا کے لئے بھاگ جاؤ۔‘

مسیح سپرا آگے بڑھا تو دو پولیس والوں کی زد میں آ گیا۔ ایک پولیس والے نے لاٹھی کے زور پر اسے روکا....

’قومیت؟‘

سپرا چپ رہا...

’شہریت؟‘

سپرا اس بار بھی چپ رہا....

’کاغذ لائے ہو...؟‘

’ہاں‘

دکھاؤ..... پولیس والے نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

’مردہ ہوں...‘

’مردہ.....؟‘ پولیس والا گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹا اور اتنا وقت مسیح سپرا کے لئے کافی تھا۔ اس نے کھل جا سم سم کا ورد کیا اور ان کے پاس سے غائب ہو گیا۔ اب وہ

ان پولیس والوں کی حرکتوں کا لطف لے سکتا تھا۔

پہلے پولیس والے نے پوچھا۔'وہ کہاں گیا۔۔۔۔۔؟'

دوسرے نے کہا....'غائب....'

پہلے والے کا لہجہ سہا ہوا تھا....'ہاں'، اس نے کیا بتایا۔

'وہ مردہ ہے....'

دوسرے والے کا لہجہ اب بھی سہا ہوا تھا۔ مردہ غائب.....

پہلا پولیس والا بولا.... سنتے ہیں کہ سڑکوں پر انسانوں کے ساتھ مردے بھی ہوتے ہیں۔

مسیح سپرا نے دیکھا کہ کچھ پولیس والے ایک دکان کا تختہ توڑ رہے تھے اور دکان کا مالک زور زور سے چلّا رہا تھا۔ پولیس والا مسلسل اس پر ڈنڈے برسا رہا تھا۔ پھر مسیح سپرا نے دکاندار کو ایک زور کی چیخ کے ساتھ زمین پر گرتے ہوئے دیکھا۔ اس نے سوچا، کیا تمام جگہوں پر یہی ہو رہا ہے؟ اسے یقین تھا، یہ سب مردے ہیں اور وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے وہ ماضی کی اسکرین ہے۔ یہ پولیس والے بھی مر چکے ہیں۔ وہ آگے بڑھا تو اس نے ایک جلوس کو آتے ہوئے دیکھا۔

وہ ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک گھر ہے مگر ویران....گھر کے باہر جلے ہوئے سامان پڑے ہیں۔ دو عدد عورتوں کے پہننے والی جوتیاں۔ ایک سائیکل...اور جلے ہوئے کاغذات....دروازہ ٹوٹا پڑا تھا۔ تجسس نے آواز دی تو مسیح سپرا نے گھر کے اندر قدم رکھا۔ چاروں طرف سے جلنے کی مہک آ رہی تھی۔ مکین نہیں تھے، اس کا مطلب، مکان کو آگ لگانے کی کارروائی میں زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ دھواں اب بھی نکل رہا تھا اور گھر کی تمام اشیا خاک ہو چکی تھیں۔ مسیح سپرا کو



گھٹن محسوس ہوئی۔ سانس لینا دوبھر ہو گیا تو وہ باہر آ گیا۔ باہر آ کر محسوس کیا کہ اس نے ہزاروں برسوں کا سفر طے کر لیا ہو۔ ہر شئے بدل گئی ہو۔ ہزاروں برس قبل اصحاب کہف کا واقعہ اس کو یاد آ گیا۔ ابھی مسیحی دین پھیلا نہیں تھا، سات نوجوانوں نے ایمان قبول کیا اور قیصر روم نے ان کے نام سزا کا اعلان کیا۔ یہ ساتوں نوجوان بھاگ کر جس گاؤں میں آئے، اس کا نام کہف تھا۔ یہاں ایک غار میں ان لوگوں نے پناہ لی اور تھکان کے باعث جلد ہی ان نوجوانوں کو نیند آ گئی۔ جب بیدار ہوئے اور غار سے باہر نکلے تو صدیاں گزر چکی تھیں۔

ٹوٹے ہوئے دروازے، جلا ہوا مکان.... کیا صدیاں گزر گئیں.... اور یہ پولیس والے ...سامنے سے آتا ہوا جلوس...اس نے پولیس والوں کو دیکھا اور ان چاروں وین کو جن سے نکل نکل کر پولیس والے ایک قطار میں جمع ہو رہے تھے۔ ان کی کندھے سے جھولتی بندوقیں اب ہاتھوں میں آ گئی تھیں۔ پھر جلوس ٹھہر گیا۔ مسیح سپرا نے دیکھا، جلوس میں سو سے زیادہ لوگ ہوں گے۔ یہ سب نوجوان تھے۔ ان کے ساتھ نوجوان لڑکیاں بڑی تعداد میں تھیں۔ ان نوجوانوں کو پولیس کا ذرا بھی خوف نہیں تھا۔ اصحاب کہف کا غار اور مسیح سپرا ابھی ابھی اس غار سے باہر آیا تھا۔ وہ مردہ خانے میں تھا اور اسے احساس بھی نہیں تھا کہ ملک میں اس حد تک کہانی تبدیل ہو چکی ہے.... اس نے دیکھا، پولیس کے ہجوم سے چار پولیس والے نکلے۔ ان چاروں نے بندوقیں اتار کر زمین پر رکھ دیا۔ یہ چاروں آگے بڑھے...اور نوجوانوں کے ہجوم میں شامل ہو گئے۔ نوجوانوں کے ہجوم سے ایک لڑکی آگے بڑھی۔ اس نے مائیک سنبھال کر ادھر ادھر دیکھا...اور اب وہ بلند آواز میں کہہ رہی تھی....

ہم دیکھیں گے....

لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے۔

نوجوانوں کے ساتھ ان چار پولیس والوں نے بھی دہرایا۔

ہم دیکھیں گے....
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوح ازل میں لکھا ہے
جب ظلم وستم کے کوہ گراں
روئی کی طرح اڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے
جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑ کے گی
اور اہل حکم کے سر اوپر
جب بجلی کڑ کڑ کڑ کے گی

مسیح سپرا نے محسوس کیا کہ حقیقت میں بجلی چمک رہی ہے۔وہ ایک طرف الیکٹرک پول کے قریب کھڑا ہوگیا۔ یہاں سے سارا منظر صاف تھا۔ جولڑکی سب سے آگے تھی، اس کا رنگ گیہواں تھا۔اس نے جینس اور گرم جیکٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے ساتھ اسی کے عمر کے نوجوان تھے اور سارے مل کر گا رہے تھے۔ ایک پولیس والے نے بندوق کو ہاتھ لگانا چاہا تو دوسرے نے مسکرا کر روک دیا....سالے گانا سن۔ اچھا لگ رہا ہے۔دوسرے پولیس والے نے دہرایا۔ ہاں اچھا لگ رہا ہے۔ پہلے نے کہا۔ یہ سالے اربن نکسل وادی ہیں۔ دوسرے نے پوچھا۔ یہ اربن نکسل وادی ہوتا کیا ہے؟ پہلا ہنسا۔ زیادہ مت سوچا کر۔ کچھ ہوتا ہوگا۔مگر، ہمارے لوگ کہہ رہے ہیں۔حکومت کہہ رہی ہے تو ضرور یہ کچھ خطرناک لوگ ہوں گے۔



پہلے نے استفسار کیا، کیا ان کے پاس ہتھیار بھی ہوں گے۔؟ دوسرا مطمئن تھا، ہوسکتا ہے، ورنہ پولیس کو دیکھ کرتو بڑے بڑوں کی.... گیلی ہوجاتی ہے۔مسیح سپرا نے ان دونوں پولیس والوں کے چہروں کا جائزہ لیا۔ یہ پولیس والے اسے بے حد معصوم لگے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے....اور اس نے دیکھا کہ ایک چمگادڑ ہے جو ان پولیس والوں کے درمیان اڑ رہا ہے مگر پولیس والے انہماک سے نوجوانوں کو سننے میں گم تھے۔نوجوانوں نے مل کر ترانہ کو آگے بڑھایا...دھوپ نکلی ہوئی تھی...اور اس کھلی دھوپ میں کسی خوبصورت پینٹنگ کی طرح وہ اس منظر کو دیکھ رہا تھا.... احتجاج کرنے والے نوجوان، پولیس کا ہجوم اور چمگادڑ....اور جھکی ہوئی بندوق....اور اس عالم میں نوجوانوں کی آواز بلند ہوئی۔ گیہواں رنگ والی نوجوان لڑکی الف لیلوی کردار کی شہزادی معلوم ہورہی تھی جس نے ایک ظالم بادشاہ شہریار کو طویل نہ ختم ہونے والی داستان کی زنجیروں میں سمیٹ لیا تھا۔ نہ رات ختم ہوگی نہ قصہ نہ کوئی قتل ہوگا، نہ لڑکیوں کی تعداد کم ہوگی، نہ لڑکے موت کے سفر پر نکلیں گے...ایک ہزار سے زائد راتوں میں قتل واذیت کو پناہ دینے والے شہریار کو پریشانی تھی کہ قصہ آئندہ کون سا رنگ لے گا....اور شہزاد کی زندگی میں نئی صبحوں کے طلوع ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ مسیح سپرا نے آواز سنی، اب نوجوانوں کا لہجہ تلخ ہو چکا تھا۔ آواز فلک شگاف مگر پولیس والوں کے دلوں میں زیادہ شگاف بناتی ہوئی۔

جب ارض خدا کے کعبے سے
سب بُت اٹھوائے جائیں گے
ہم اہل صفا مردود حرم
مسند پہ بیٹھائے جائیں گے
سب تاج اچھالے جائیں گے

سب تخت گرائے جائیں گے
بس نام رہے گا اللہ کا
جب ارض خدا کے کعبے سے
سب بُت اٹھوائے جائیں گے

مسیح سپرا اچانک چونک گیا..... اس نے پولیس والوں کو دیکھا۔ مسلّح پولیس والے....اور وہ پولیس والے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

’تم نے سُنا....‘ پہلے نے پوچھا۔

’ہاں...‘ سب بُت اٹھوائے جائیں گے...‘

’ان کی ہمت دیکھو...‘

’بس نام رہے گا اللہ کا...‘

وہ ایک نوجوان تھا اور اس نے زعفرانی لباس پہن رکھا تھا۔ وہ ان دونوں پولیس والوں کے پاس آیا....وہ کہہ رہا تھا....اربن نکسلائٹ... یہ اللہ کا نام لے رہے ہیں۔ بتوں کو اٹھوانے کی بات کررہے ہیں۔انہیں اٹھواؤ۔ گولیاں چلاؤ، ہم اپنی لیب میں ان گانوں کا ٹیسٹ کریں گے...‘

’کیسے؟‘ پہلے پولیس والے کو حیرت تھی۔

’یہ زیادہ مشکل نہیں ہے۔‘ زعفرانی لباس والے نوجوان نے بتایا...’ہم سرخ رنگ کا ایک کیمیکل تیار کرتے ہیں اور اس میں ان شبدوں کو کاغذ پر لکھ کر ڈال دیتے ہیں۔اگر کاغذ کا رنگ سرخ ہوجاتا ہے تو....‘

’اچھا یہ مشکل کام ہے۔؟‘

’کرنا پڑتا ہے....‘ زعفرانی لباس والا چلاّیا۔ دیکھ کیا رہے ہو۔ گولیاں چلاؤ۔

’یہ اچھا گا رہے ہیں۔‘ پولیس والے کا چہرہ معصوم تھا۔



دوسرے پولیس والے نے کہا... ہاں اچھا گا رہے ہیں۔ان کو ذرا سن تو لیں۔

پولیس والوں کے ساتھ زعفرانی لباس والے نوجوان نے بھی دھیان کیا۔ ترانہ میں زور آ گیا تھا۔سب مل کر گا رہے تھے۔

’بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے حاضر بھی
جو منظر بھی ہے ناظر بھی
اٹھے گا انا الحق کا نعرہ
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو
اور راج کرے گی خلق خدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو....‘

زعفرانی لباس والے نوجوان کے صبر کا باندھ ٹوٹ چکا تھا۔ وہ پولیس والوں کو دیکھ کر چلایا۔’سنا تم نے....خدا راج کرے گا....ان کا خدا راج کرے گا اور تم لوگ دیکھ رہے ہو۔ میں کہتا ہوں گولیاں چلاؤ۔ یہ سالے افغانستان اور پاکستان کی باتیں کررہے ہیں۔‘

’مگر افغانستان کا ذکر آیا تو نہیں؟‘ دوسرے پولیس والے نے تعجب کیا۔

’راج کرے گا خدا کیا ہے؟ یہ خدا افغانستان میں ہے....‘

’اور پاکستان میں؟‘ پہلے والے نے استفسار کیا۔

’وہاں اللہ ہے۔اس کا بھی ذکر ہے...گولیاں چلاؤ...‘

الیکٹرک پول کے قریب کھڑے مسیح سپرا کو احساس ہو چکا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔مگر اسے علم نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔اس نے اپنی بڑھی ہوئی داڑھی پر

ہاتھ پھیرا۔ پھر اس نے دیکھا، پولیس والے ایک قطار میں کھڑے ہو گئے ہیں۔

جھکی ہوئی بندوقیں اب سامنے تن گئی ہیں۔ نوجوان بے فکر ہیں اور اب بھی ایک سُر میں گا رہے ہیں۔ پولیس والے اشارے کے منتظر ہیں۔ ایک بڑے افسر نے انہیں اجازت دے دی۔ انہوں نے ایک ساتھ فائرنگ شروع کی۔ بھگدڑ مچ گئی۔ مگر یہ بھگدڑ پولیس والوں کے درمیان مچی تھی اور جو کچھ ہو رہا تھا، مسیح سپرا کے لئے وہ سب چونکانے والا عمل تھا... اور یہ عمل اس نے مذہبی فلموں اور سیریل میں دیکھا تھا اور اسے یقین نہیں تھا کہ یہ سب اس کی آنکھوں کے سامنے ہوسکتا ہے۔ وہ گولیاں چلا رہے تھے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے مذہبی سیریلس میں راکچھس یا دیو منہ سے انگارے نکالتا ہے اور میزائلیں چلاتا ہے اور دیوتا ہنستے ہوئے ان میزائلوں کو راستے میں روک کر تباہ کر دیتے ہیں۔ گولیاں زنّاٹے سے چل رہی تھیں۔ مگر گولیاں نوجوانوں کی طرف جا کر، یا پلٹ کر واپس آ رہی تھیں... اور معمولی آتش بازی کی طرح یہ گولیاں ناکارہ ثابت ہو رہی تھیں۔ یہ درمیان میں ہی روک لی جا رہی تھیں جیسے کوئی غیبی طاقت ہو۔

ایک پولیس والا چلایا... 'یہ کیا ہو رہا ہے۔'

دوسرے نے کہا... 'ایسے کام تو صرف دیوتا کرتے ہیں۔'

زعفرانی لباس والے کو حیرت تھی۔ ہماری گولیاں واپس آ رہی ہیں۔

ایسا کیسے ممکن ہے؟ پولیس افسر کو حیرت تھی۔

مسیح سپرا کو بھی حیرت تھی.. اور اس نے دیکھا، پولیس والے خوفزدہ ہیں۔ بندوق کی نالیں پھر جھک گئیں۔ پولیس والا افسر سامنے آیا۔ اب وہ پولیس والوں سے خوفزدہ آواز میں کہہ رہا تھا۔ کچھ گڑ بڑ ہے۔ میں کہتا نہ تھا کہ کچھ گڑ بڑ ہے۔ ان کے ساتھ دیوتا آ گئے ہیں۔ یا پھر یہ نکسل جادو سیکھ گئے ہیں۔ ہم ان پر حملہ نہیں



کر سکتے۔

دوسرے پولیس والے نے خوف سے پوچھا۔ ہم اپنے آقاؤں سے کیا کہیں گے؟

پولیس افسر کا لہجہ سخت تھا، پہلے ہم اپنی جان تو بچالیں۔ اب ان کے ساتھ دیوتا ہیں... اور مجھے لگتا ہے، دیوتا ہم سے ناراض ہیں۔ ہم نے اپنے دیوتاؤں کو ناراض کر دیا ہے... اور اس لئے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے ہم پولیس والے یگیہ کریں گے اور یگیہ میں نیوی اور فوج کے لوگوں کو شامل ہونے کے لئے کہیں گے۔

ایک دوسرے افسر نے دریافت کیا۔ کیا فوج والے ساتھ دیں گے۔؟

ہم یگیہ کریں گے۔ مہا یگیہ۔ دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے فوج اور نیوی کو بھی ساتھ میں آنا پڑے گا۔ مگر یہ یگیہ ہم کب شروع کریں گے...'

' ہم آقاؤں سے بات کریں گے۔ کل صبح سے سارے پولیس والے سوریہ نمسکار کریں گے۔ دیوتا کو خوش کریں گے۔ دیوتا خوش نہیں ہوئے تو اربن نکسلائٹ کے ساتھ آجائیں گے۔ دیوتا تو کسی پر بھی مہربانی کر سکتے ہیں۔'

' کیا ہم ایک بار پھر فائرنگ کر کے دیکھیں؟'

'اس کی ضرورت نہیں۔ اب ضرورت مہا یگیہ کی ہے۔'

مسیح سپرا چوک سے نکلا تو پولیس کی ناکامی اور اربن نکسل ہجوم کی فتح کی خبریں میڈیا پر چھا چکی تھیں۔ سردی کے باوجود سڑک پر ٹریفک بڑھ چکا تھا۔ ایک بڑی سی الیکٹرانک شاپ کے قریب آٹھ دس لوگ کھڑے تھے۔ مسیح سپرا چلتا ہوا ان کے ہجوم میں شامل ہو گیا۔ ٹی وی پر خبریں آ رہی تھیں۔ دیوتا ناراض۔ مہا یگیہ کی تیاری۔ اربن نکسلائٹ ہجوم کا جادو یا چمتکار۔ دیوتا کس کے ساتھ ہیں، بڑا سوال۔ مگر آج

کے اس واقعہ نے بھگتوں میں سنسنی پیدا کردی تھی....مسیح سپرا نے وہاں رُکنا مناسب نہیں سمجھا۔اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔آج دھوپ نکلی ہوئی تھی۔سردی کم تھی اور اسے شاپنگ کرنی تھی۔آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا وہ ایک چھوٹی سی کپڑوں کی دکان کی طرف بڑھا۔دکان کے قریب دوگائیں بندھی ہوئی تھیں۔اس نے گائیوں پرنظر ڈالی۔دکان کے اندر جانا چاہا تو چوکیدار نے روک دیا۔

'فارم بھرا ہے؟'

'فارم؟'

'شناختی کاغذ لائے ہو؟'

'شناختی کاغذ؟'

'برتھ سرٹیفکیٹ؟'

'برتھ؟' مسیح سپرا کی زبان لڑکھڑائی۔'ڈیتھ سرٹیفکیٹ چلے گا.....'

مسیح سپرا نے چوکیدار کو دیکھا۔اس کے چہرے کا رنگ ایک لمحہ کو اڑ گیا تھا۔اس نے سپرا کے لباس کو دیکھا۔'تمہارے پاس ڈیتھ سرٹیفکیٹ ہے۔؟'

'ہاں۔دکھاؤں....'

'تم مرے ہوئے ہو...؟'

'ہاں۔کیوں....'

چوکیدار کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔اب دکانوں سے بغیر سرٹیفکیٹ کے سامان نہیں ملیں گے۔اس نے اضافہ کیا۔مردوں کو بھی۔

'لیکن کیوں....؟'

'ایک خاص پارٹی کا بہشکار کیا گیا ہے۔'

'بہش.....کار...؟ مطلب...'



'مطلب...' چوکیدار نے اگلتے ہوئے کہا۔انہیں کوئی سامان نہیں دیا جائے گا۔چوکیدار نے ایک بار پھر سپرا کو دیکھا۔

'کہاں رہتے ہو؟'

'مردہ گھر....'

چوکیدار کا چہرہ زرد تھا۔'مجھے ڈرا رہے ہو۔'

'نہیں میں مردہ ہوں۔'

'پھر اندر جاؤ۔بہشکار زندوں کے لیے ہے۔'

مسیح سپرا نے اس کو عجیب نظروں سے دیکھا۔پھر دوکان کے اندر داخل ہوگیا۔یہاں بھی ٹی وی چل رہا تھا۔دوکاندار نے مسیح سپرا کے لباس کو غور سے دیکھا۔کچھ کہا نہیں۔دوکان میں کھڑے لوگ مہا یگیہ کے بارے میں باتیں کررہے تھے۔مسیح سپرا نے ان کی باتیں سنیں۔وہاں کھڑے ایک بزرگ کے مطابق اب دستور کی جگہ مذہبی کتابیں لائی جائیں گی۔ہم پرانی دنیا میں واپسی کریں گے۔کیلے کے چھلکوں پر ہماری کتابیں ہوں گی۔درسگاہوں پر تالہ لگ جائے گا۔ہماری گائیں ہمیں انیہ دیں گی اور اس سے زیادہ ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوگی۔

مسیح سپرا نے کچھ زیادہ ہی سفید لباس خرید لیے۔ان میں سفید کفن بھی تھا۔جس کو چھو کر وہ مطمئن ہونا چاہتا تھا کہ اس کو پہننے کے بعد خیالات منجمد رہیں گے اور فکر کے تمام راستے بند رہیں گے۔دوکاندار نے یہ لباس اسے مہا یگیہ کے نام پر دیے تھے اور بتایا کہ مہا یگیہ کی تیاریاں شروع ہوچکی ہیں۔نیوی اور فوج کے لوگ بھی مہا یگیہ میں شامل ہوں گے...اور اس کے علاوہ ہر گھر میں یگیہ ہوگا۔دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے۔

کھانے پینے کے سامان کے لیے مسیح سپرا نے اپنے ہم مذہب دکان کو ترجیح دی اور اس کی وجہ تھی کہ سماجی سطح پر بہشکار کے بعد اب اپنی قوم کا ہی آسرا تھا اور ہم مذہب یا قوم کے نام پر مسیح سپرا کی سمجھ صرف اتنی تھی کہ جن لوگوں کے درمیان وہ پیدا ہوا ہے اور جس مذہبی تعلیم کے سایے میں وہ بڑا ہوا ہے اور مخصوص لباس جو اس قوم کی شناخت ہے....اور اسے یہ بھی احساس تھا کہ اچانک یہ زمین دو حصوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ زمین کا ایک حصہ اس وقت ذرا گڈھے میں چلا گیا تھا، یا دھنس گیا تھا اور اس کا تعلق اسی حصے سے ہے۔

مسیح سپرا آگے بڑھا۔ اس کے ہم مذہب دوکاندار یہاں سے کچھ دوری پر تھے اور وہاں تک پہنچنے میں اسے تنگ گلیوں کا سفر بھی طے کرنا ہوگا۔

وہ باہر نکلا تو چوکیدار اب بھی خوفزدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ایک بار پھر چوکیدار نے لڑکھڑاتے الفاظ میں پوچھا۔

'کہاں رہتے ہو؟'

'مردہ خانہ۔ ابھی بتایا تو تھا۔'

'تم زندہ ہو؟'

'نہیں مردہ۔'

اس کے بعد مسیح سپرا ٹھہرا نہیں۔ اس نے پلٹ کر چوکیدار کے تاثرات کو دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔



## (3)

# گیلی گولیاں اور ناراض دیوتا

گولیاں گیلی تھیں، اس لیے نہیں چلیں۔ فوج کے پاس اور پولیس کے پاس جو بندوق، پستول اور اسلحے ہیں، وہ سب پرانے ہو چکے ہیں اور ضروری ہے کہ پوجا پاٹھ اور مہا یگیہ کے ذریعہ اسلحوں کو شدھ کیا جائے۔ پولیس کے گولیاں چلانے اور گولیوں کے واپس آنے کے معجزہ پر خبروں کا بازار گرم ہو چکا تھا۔ کچھ دانشوروں کا کہنا تھا کہ ایسے معجزے اب نہیں ہوتے۔ یقیناً گولیاں گیلی تھیں اور اس لیے گولیاں نہیں چلیں۔ مگر ایک بڑا طبقہ اس واقعہ کو دیوتاؤں کی ناراضگی سے وابستہ کر رہا تھا۔ مسیح سپرا دکان سے نکلا تو اسے سڑک پر چاروں طرف گیلی گولیوں اور دیوتاؤں کے تذکرے سنائی پڑے۔

ایک خوبصورت سی دکان کے قریب وہ ٹھہرا۔ ایک بڑے سائز کے ٹی وی پر خبریں چل رہی تھیں اور ان خبروں میں مہا یگیہ کے طریقوں کو سمجھایا جا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑا رہا۔ آگے بڑھا تو سڑکوں پر بھی یگیہ کی تیاریاں ہوتی نظر آئیں۔ سپرا

کوامید نہیں تھی کہ دنیا اس حد تک تبدیل ہوچکی ہے اور وہ اصحاب کہف کے غار میں لمبی نیند سے بیدار ہوکر جب اس دنیا کو دیکھنے چلا ہے تو وقت کی سوئیاں تیزی سے آگے بڑھ گئی ہیں۔کیا حقیقت میں؟ وقت کی سوئیاں آگے بڑھ گئی ہیں۔یقینی طور پر سب مردے ہیں۔ وہ بھی۔ اور مردوں کو بھی حقیقت کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ وہ مطمئن تھا۔ وہ آگے بڑھا تو سڑک پر ایک ہجوم بھاگتا ہوا نظر آیا۔ وہ پھر کنارے ہوگیا... اور اس نے آواز سنی، دیوتا پتھروں سے نکل کر باہر آگئے ہیں۔ بھاگتے ہوئے ہجوم کے پیچھے ڈھول بجاتا ہوا ایک قافلہ تھا۔اس قافلہ میں شامل لوگوں نے دیوتاؤں جیسے ماسک چڑھا رکھے تھے۔ یہ شلوک پڑھ رہے تھے اور ان کے ہاتھوں میں تیر کمان تھے۔ سپرا نے غور سے دیکھا، یہ تیر اور کمان کاغذ سے بنائے گئے تھے اور امیر حمزہ کی داستان میں عمر وعیار کے پاس اس نے ایسے تیر کمانوں کو دیکھا تھا۔ عمروعیار جنگ کے میدان میں اسی تیر کمان کا استعمال کرتا تھا اور غائب ہوجاتا تھا۔ اسے یہ تماشہ پسند آرہا تھا اور اسے کوئی تعجب نہیں تھا کہ رفتار اور وقت بتانے والی گھڑی اچانک پیچھے کی طرف مڑ گئی تھی۔

آسمان میں گولیوں کی آواز گونجی۔نقلی دیوتاؤں کے پیچھے کچھ پولیس والے تھے۔ دس بیس کے قریب۔ان کے جسم کے اوپر پولیس کی وردی تھی۔مگر وردی کے نیچے پہنے ہوئے پینٹ کا رنگ زعفرانی تھا۔ان میں سب سے آگے جو شخص تھا، یہ وہی پولیس افسر تھا، جس نے گولیاں چلانے کا حکم دیا تھا۔افسر نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے گولیاں چلائیں اور خوشی کا اظہار کیا کہ گولیاں گیلی ہوتیں تو ابھی بھی نہیں چلتیں اور ان کے دھماکے کی آواز دور تک گئی ہے۔اس کا مطلب صاف ہے کہ گولیاں گیلی نہیں تھیں بلکہ دیوتا ناراض ہیں، یہ بات صحیح ہے.... اور ممکن ہے کہ مخصوص لباس والے ان کے دیوتاؤں پر قبضہ کرنے کے بارے میں سوچ رہے



ہوں اور یقیناً ان میں اربن نکسل بھی ہیں اور ایسا ہے تو اب ان کے خلاف بڑی جنگ کی ضرورت ہے۔

ان باتوں میں مسیح سپرا کی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے گل بانو کا خیال تھا۔گل بانو کو بغیر بتائے وہ شاپنگ کے لیے آگیا تھا... اور اس وقت وہ اس اجنبی مسافر کی طرح تھا جو کسی نئے دیس میں آگیا ہو۔اچانک اس نے پشت سے ایک آواز سنی۔ کوئی اس کا نام لے کر آواز دے رہا تھا۔مسیح سپرا مڑا۔لیکن اس کی آنکھیں کسی بھی طرح کی چمک سے بے نیاز تھیں۔وہ پہچان گیا۔یہ عبداللہ تھا۔بچپن کے زمانے کا اس کا دوست۔اس عرصہ میں عبداللہ کا چہرہ بھی کافی حد تک بدل گیا تھا۔وہ دبلا لگ رہا تھا۔ اسے شوگر کا مرض تھا اور یقیناً اس کا وزن شوگر کی وجہ سے ہی کم ہوا ہوگا۔عبداللہ تقریباً دوڑتا ہوا اس کے قریب آیا... وہ غور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

'تم بدل گئے ہو۔'

'ہاں۔' مسیح سپرا نے آہستہ سے کہا۔

'اور یہ سب... یہ حلیہ... شاید بھابھی کی موت کا تم نے کچھ زیادہ ہی اثر قبول کیا۔'

'ہاں...'

'وہ دیکھو...' عبداللہ نے اشارہ کیا۔ وہ تعداد میں بیس پچیس تھے اور ان کے سروں پر ٹوپیاں تھیں۔ وہ مخصوص لباس میں تھے۔ان کے چہرے پر گھنی داڑھیاں موجود تھیں وہ تیزی سے کہیں جارہے تھے۔

سپرا نے پوچھا... 'یہ کہاں جارہے ہیں؟'

'ان کی قیادت چھین لی گئی۔ جب قیادت نہیں تو حکومت نے فنڈ دینا بند کردیا۔ چائے پیوگے؟'

'نہیں' سپرا آہستہ سے بولا۔ وہ بھوک پیاس کی محبت سے دور نکل آیا تھا۔ مگر مجبوری تھی، اس لیے حسب ضرورت پیٹ کی مانگ پوری کر لیتا تھا مگر اب وہ ذائقوں سے محروم تھا۔

عبداللہ آہستہ سے بولا۔ 'بہت کچھ تیزی سے بدلا ہے۔'

'ہاں۔'

'ایک پرانی دنیا... پرانے دستور..... پرانے کاغذات...' وہ ہنسا... 'پرانی دنیا میں پرانے کاغذات ہی تو ہوں گے...'

'تم دفاع کر رہے ہو.....؟'

'نہیں، انہیں سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔' عبداللہ ہنسا۔

دونوں تھوڑی دور تک ساتھ چلے۔ اس درمیان سپرا بھی خاموش رہا اور عبداللہ بھی۔ آگے پولیس کی وین کھڑی تھی۔ جہاں پولیس والے بیدردی سے کچھ مخصوص لباس والوں کو کھینچتے ہوئے وین میں ٹھونس رہے تھے۔ عبداللہ نے بتایا کہ ان کے پاس کاغذات نہیں اور انہیں کیمپوں میں بھیجا جا رہا ہے۔ مسیح سپرا نے ان کے چیخنے چلانے پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ اب اسے مردہ گھر لوٹنا تھا۔ انسانی بستی میں اسے الجھن ہو رہی تھی۔ عبداللہ نے ٹھہر کر اس کی طرف دیکھا۔

ایک بات کہوں۔ 'یہ لباس پہننا بند کر دو۔'

'نہیں۔' سپرا کا لہجہ سرد تھا۔

'کیوں۔'

'میں مردہ ہوں۔'

مسیح سپرا آہستہ سے بولا اور اس کے بعد اس نے عبداللہ کو غائب ہوتے ہوئے دیکھا۔ پتہ نہیں وہ اچانک کہاں غائب ہو گیا۔ مسیح سپرا کو احساس تھا کہ زندہ



لوگ بہت مشکل میں ہیں اور جو زندہ ہیں وہ یقیناً مارے جائیں گے.... اور یہ آس پاس جو لوگ ہیں یہ سب مردہ ہیں۔ عبداللہ بھی جو اچانک غائب ہو گیا۔

گھر کے قریب آنے کے بعد وہ رُک گیا۔ ایک جلوس گزر رہا تھا۔ ان کے لباس زعفرانی کم سرخ زیادہ تھے۔ ان کے نعرے اشتعال سے بھرے تھے اور یہ مخصوص قوم کے لیے جلا وطنی کا فرمان لے کر آئے تھے۔ اور ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کے بس میں ہو تو یہ سڑکوں پر خون کی ندیاں بہا دیں.... اور جن کے بارے میں یہ نعرے لگا رہے ہیں، انہیں ابھی ملک سے باہر کر دیں۔ مسیح سپرا کے اندر بے چینی تھی۔ اسے محسوس ہوا، قدم شل ہیں اور ایک تیز آندھی اسے قوم عاد کے قریب لے گئی ہے۔ قوم عاد کی سرکشی حد سے تجاوز کر گئی تو اللہ نے قحط بھیجا۔ وہ سارا غلہ کھا گئے۔ سانپ بلی کھا گئے اور جب کچھ کھانے کو نہیں بچا تو فاقہ کشی پر مجبور ہو گئے... اور پھر ان کا وفد حضرت ہودؑ سے ملا اور کہا کہ اپنے رب سے کہو، ہمارے لیے پانی برسائے.... اور اللہ نے جواب میں ہود کو تین بادلوں میں سے ایک کے انتخاب کا کام سونپا۔ سفید بادل، سرخ بادل، سیاہ بادل۔ قوم عاد نے سیاہ بادلوں کا انتخاب کیا.... اور سیاہ بادلوں کے عذاب میں قوم عاد کو نافرمانی کی سزا مل گئی.... سیاہ بادلوں کا رنگ.... مسیح سپرا نے دیکھا تو جلوس میں شامل افراد کے لباس اس بار اسے سیاہ محسوس ہوئے اور یہ بھی احساس ہوا کہ تیز آندھی ہے اور اب جلد از جلد اسے گھر واپس ہونا چاہیے۔ مگر قوم عاد پر بھیجے گئے سیاہ بادلوں کا ہجوم راستہ میں تھا۔ کل بارش ہوئی تھی۔ کیا آج بھی بارش ہو گی۔ سردی میں اچانک اضافہ ہو گیا تھا۔ اور پھر اس نے دیکھا کہ کچھ لوگ اچانک ہاتھوں میں تلوار، ہاکی اسٹیک لے کر نکل آئے۔ ان کے چہروں پر نقاب تھے۔ نقاب کے باوجود ان چہروں کی شناخت کی جا سکتی تھی۔ وہ تعداد میں بیس تھے۔ تیس، اس سے زیادہ چالیس یا سو بھی ہو سکتے تھے۔ اور یقیناً

انہیں پہلے سے پتہ تھا کہ آزاد کارواں کے سپاہی اس سمت کو آنے والے ہیں۔
وہی، جنہیں یہ اربن نکسل کہتے ہیں۔مسیح سپرا کے چہرے پر مردنی چھا گئی گو کہ وہ
خوفزدہ نہیں تھا اور وہ مردہ تھا، اس لیے خوفزدہ ہونے کی بات بھی نہیں تھی مگر وہ ٹھہر کر
دیکھنا چاہتا تھا کہ ان نقاب پوش، اسلحوں سے لیس فوج کی منشا کیا ہے....اور پھر
اس نے دیکھا کہ پولیس کی ایک بڑی سی وین وہاں اتری۔ پولیس والوں نے
نقاب پوشوں کو سیلوٹ کیا....اور ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ کچھ پولیس والوں نے
بھی اپنے چہرے کو رومال سے چھپا لیا تھا۔اب ان میں اور نقاب پوشوں کے
درمیان کوئی فرق نہیں تھا۔ جو فرق تھا وہ صرف وردی کا تھا۔
مسیح سپرا نے خود کو ایک بند دکان کی چھت کے نیچے چھپا لیا۔ گو کہ وہ اس
تماشہ سے واقف تھا اور اسے حیرانی بھی نہیں تھی مگر وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس تماشہ
سے کیا نکل کر سامنے آتا ہے...اور اتنی دیر میں میڈیا چینلز کی کئی گاڑیاں ایک قطار
سے کھڑی ہو گئیں۔ نیوز اینکر ہاتھ باندھے ہوئے، مائیک تھامے ہوئے باہر نکلے
اور نقاب پوشوں کو سلام کیا۔نقاب پوشوں نے کچھ کہا، لیکن الفاظ تک رسائی مسیح سپرا
کی نہیں ہو سکی۔ وہ اتنے فاصلے پر تھا کہ ان کی آواز کو سننا مشکل تھا۔ تاہم اب وہ
تعداد میں بڑھ چکے تھے۔ نقاب پوش، پولیس والے اور میڈیا۔اب ان کی طاقت کا
اندازہ لگانا مشکل تھا۔اس کے بعد مدھو مکھیوں جیسی کچھ آوازیں ابھریں۔ پھر آہستہ
آہستہ آوازیں تیز ہوتی چلی گئیں۔ مسیح سپرا نے کچھ گھنٹے قبل بھی ان آوازوں کو سنا
تھا اور اب آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ پھر مسیح سپرا کو دور سے انسانی سر نظر آئے اور
کچھ دیر بعد انسانی سروں کا قافلہ قریب آیا تو اس نے دیکھا کہ یہ سب نوجوان تھے
اور وہی نوجوان جن کے پاس سے گولیاں لوٹ گئی تھیں۔ اور جن کے بارے میں
اس نے سنا کہ دیوتا ناراض ہیں اور پورے ملک میں یگیہ ہوگا۔ بلکہ راستے میں کئی



جگہوں پر یگیہ کی تیاری کرتے ہوئے لوگ بھی نظر آئے تھے۔

میڈیا والوں نے پولیس کو اشارہ کیا۔ یہ اشارہ گولیاں چلانے کا تھا۔ پولیس
والوں نے بندوق سیدھی کی اور ایک ساتھ کئی فائر کیے۔ میڈیا والوں کے کیمرے
حرکت میں تھے۔گولیاں چلیں۔ بہت تیز آواز ہوئی مگر گولیاں آدھے راستے میں
ہی روک لی گئیں۔ اس نے آواز سنی۔ یہ ایک پولیس والا تھا جو کہہ رہا تھا۔ ایسا تو
صرف بھگوان ہی کر سکتے ہیں۔کیا یہ بھگوان پرش ہیں؟ بھگوان پتر....گولیاں کہاں
گئیں۔؟انہوں ایک ساتھ کئی فائر کئے۔ گولیاں بندوقوں سے نکلیں اور آدھے
راستے میں غائب ہو گئیں۔
’حملہ ....‘ پولیس والوں نے نقاب پوشوں کو اشارہ کیا۔ نقاب پوشوں کے
ہاتھوں میں اسٹیک لہرائی۔ تلوار چمکی۔انہوں نے زور سے مذہبی نعرے لگائے،
مگر....وہ لڑ کھڑا رہے تھے۔ مسیح سپرا نے محسوس کیا کہ ان کے پاؤں زمین سے
چپک گئے ہیں اور ان کے چہروں پر خوف طاری ہے۔ اچانک میڈیا والوں کے
ہوش اڑ گئے۔ کیمرے تڑخنے۔ٹوٹنے کی آوازیں تیز تھیں۔ میڈیا والے خوف سے
چیخنے کی کوشش کر رہے تھے مگر ان کی آوازیں گلے میں گھٹ گئی تھیں۔ اس کے
باوجود مسیح سپرا نے کچھ مکالمے سنے، جوان لوگوں کے ہی تھے۔ پولیس والے، میڈیا
والے اور نقاب پوش۔ آواز اب صاف سنائی دے رہی تھی۔
’کچھ ہو رہا ہے.....‘
’ہاں یہ بھیانک ہے۔‘
’دیوتا ناراض ہیں۔‘
’اس بار بندوق بھی اصلی اور گولیاں بھی۔‘

’پہلے بھی بندوقوں میں کوئی کمی نہیں تھی۔‘

’مگر ہم سب گواہ ہیں، گولیاں چلیں اور بھگوان نے روک دیا۔‘

’ہم انہیں مارنے نکلے اور ہمارے قدم زمین نے روک لیے۔‘

’ہمارے آقا۔‘

ایک میڈیا والی لڑکی تھی۔ اس نے خوفزدہ ہوکر آقا کا نام لیا۔ وہ حیران تھی اور بلکہ یہ خیمہ حیران تھا کہ اچانک کیا ہورہا ہے۔ اور اچانک لڑکی نے ادھر ادھر دیکھا اور اس نے دکان کی آڑ میں چھپے مسیح سپرا کو دیکھا۔ وہ مائیک لے کر آگے بڑھی۔

’کیا تم نے بھی وہ سب دیکھا، جو ہم دیکھ رہے تھے؟‘

’ہاں......‘

’کیا گولیاں نقلی تھیں؟‘

’ہاں......‘

’کیا......لڑکی اب خوف زدہ تھی۔ اور بندوق......کیا وہ بھی نقلی۔؟‘

’ہاں......‘

’کیسے کہہ سکتے ہو؟‘

’مسیح سپرا نے آسمان کی طرف اشارہ کیا......سیاہ بادل......‘

’یہ سیاہ بادل کیا ہے......‘

’پتہ نہیں......‘

’تم کون ہو؟‘

’پتہ نہیں۔ مسیح سپرا کے دانت بج رہے تھے......‘

’کیا ہم نیند میں ہیں، خواب دیکھ رہے ہیں یا ایسا ہوا ہے؟‘

’نیند......‘



’نیند میں......‘

’ہاں...... یہ تمہارا خوف ہے۔ مسیح سپرا کی آنکھیں بند تھیں......‘

’تم کون ہو؟ سچ سچ بتاؤ؟‘

’مردہ......‘

مسیح سپرا نے میڈیا والی لڑکی کو خوفزدہ ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹی۔

وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ پولیس والوں اور نقاب پوشوں کی طرف جاتے ہوئے اس نے دوبارہ مسیح سپرا کی طرف دیکھا......مسیح سپرا اپنی جگہ مطمئن تھا۔ مگر یہ خیال اسے رہ رہ کر آرہا تھا کہ ایسا کیوں ہوا۔ یہ واقعہ ایک ہی دن میں دوبار ہوا۔ اور یقیناً اب یگیہ کی تیاریاں زور وشور سے ہورہی ہوں گی۔ سوریہ نمسکار، یگیہ، گائیں، مذہبی دستور، سادھوسنیاسی، گائے کا گوبر، قدیم تام پتر......اور یقیناً وہ ایک نئے ملک میں تھا یا مردہ ملک میں۔ جہاں مسلسل چمتکار ہورہے تھے۔

مسیح سپرا نے دیکھا، پولیس والوں، نقاب پوشوں اور میڈیا والوں سے ہوکر نظمیں پڑھتا، گاتا نوجوانوں کا قافلہ آگے بڑھ گیا۔ کچھ کے چہرے خون سے سنے تھے۔ کچھ کے بازو زخمی تھے۔ کچھ کو گولیاں پاؤں میں لگی تھیں......اور زیادہ تر ایسے تھے کہ ان کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ میڈیا، پولیس والوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کیا گولیاں چلی تھیں؟ نہیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے۔ نقاب پوشوں نے نظمیں گاتے ہوئے نوجوانوں کو دیکھا، ان کے ہاتھ کے اسلحے ہاتھ میں رہ گئے۔ قدم شل کہ وہ آگے نہیں بڑھ سکے۔ پھر ان نوجوانوں کو زخمی کس نے کیا۔؟

یہ زندہ نہیں۔

کافی دیر بعد سپرا نے میڈیا والی لڑکی کو دیکھا۔ جو چلا رہی تھی...... یہ سب مردہ ہیں اور اس نے انگلی سے مسیح سپرا کی طرف اشارہ کیا۔' وہ بھی...... بھاگو...... ہم مردوں کے درمیان میں ہیں۔'

'کیا مردے گاتے ہیں؟'

'گا سکتے ہیں۔'

'چل سکتے ہیں؟'

'ہاں......'

'بول سکتے ہیں؟'

'ہاں......'

'کیا مردے دوبارہ مر سکتے ہیں......؟'

'پتہ نہیں۔'

لڑکی اس بار خوفزدہ تھی...... مسیح سپرا خود اس سیاست میں الجھ گیا تھا۔

گولیاں نہیں چلیں۔ مگر نوجوان زخمی تھے اور گا رہے تھے...... اور خون کی بو یہاں تک محسوس ہو رہی تھی۔ مسیح سپرا خوش تھا۔ اچھا ہوا، وہ مر چکا ہے...... وہ اس نظارہ کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اور شاید؟ بھگوان اور دیوتا بھی اس سیاسی کھیل میں شامل ہو گئے ہیں اور مزے لے رہے ہیں۔

اب مسیح سپرا کے پاس ٹھہرنے کا کوئی جواز نہیں تھا......وہ آگے بڑھا......اور کچھ دیر بعد ہی وہ اپنے گھر کے پچھواڑے تھا۔

اس نے دیکھا، دروازہ بند تھا۔ اس کا مطلب صاف تھا کہ اجنبی لڑکی جاگ گئی ہوگی اور اس نے تحفظ کے خیال سے دروازہ بند کر لیا ہوگا۔



## (4)

کمرے کی بند کھڑکی، روشن دان اور روزن سے سناٹے اور ویرانی کے چھوٹے چھوٹے گچھے نکلے اور سفید چادروں پر چھا گئے......اور جب مجسمہ والی پر اسرار عورت ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہی تھی، گل بانو اس روشنی کو محسوس کر سکتی تھی، جو کھڑکی، روشن دان، دروازے اور روزن سے اسے دکھائی دے سکتی تھی۔ اگر مردہ خانے کی دیواروں پر سفید چادریں نہ ہوتیں۔ اس کمرے سے صرف قیاس لگایا جا سکتا تھا کہ کتنا بجا ہوگا۔ سردی سے ٹھٹھرتا سورج آسمان پر غائب ہو گیا ہوگا یا دھوپ نکلی ہوگی؟ باہر گھنے کہرے کی چادر تنی ہوگی یا روشنی نے سڑکوں پر چہل پہل شروع کر دی ہوگی۔ یہاں موبائل بھی نہیں، گھڑی بھی نہیں، ٹی وی بھی نہیں اور گل بانو کی نیند کھلی تو اس نے سوچا، کیا حقیقت میں کوئی طاقت زندگی کا حساب رکھتی ہے یا وقت ہمیشہ کی طرح مردہ خانے میں منجمد ہے جہاں شب و روز اور گھڑی کی بڑھتی سوئیوں کی ضرورت نہیں۔ ایک مردہ جسم وقت کے مین ہول میں پھینک دیا جاتا ہے اور وقت وہیں ٹھہر جاتا ہے......اچانک جب نیند ٹوٹی تو وہ سب کچھ بھول چکی تھی۔ اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور رات اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا۔ نیند

کھلی تو اس پر اندھیرے کا سایہ تھا اور سفید چادروں سے اڈتی خاموشی بھیانک لگ
رہی تھی اور پھر اس کی نظر اچانک مجسمہ کی طرف گئی تو اس کے ہونٹوں سے تیز چیخ
بلند ہوئی اور پھر ایک ایک کر کے سارے مناظر اس کے سامنے زندہ ہوگئے۔ وہ قتل
کر کے فرار ہوئی تھی۔ پھر وہ اس مردہ خانے تک پہنچی...... اور پھر وہ مسیح سپرا سے
ملی۔ اور اس وقت مسیح سپرا غائب ہے۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ بند ٹوائلٹ
کو، کچن کو۔ تین کمرے تھے اور ان تینوں کمرے کی دیوار، روزن اور روشن دانوں پر
چادریں چڑھی تھیں مگر مسیح سپرا کا کچھ اتہ پتہ نہیں تھا۔ وہ اندھیرے میں
اٹھی۔ کمرے میں روشنی کرنے کا خیال آیا تو اسے احساس ہوا، روشنی کی جاسکتی ہے
مگر سپرا کو یہ پسند نہیں ہوگا۔ پاور ابھی تک کاٹا نہیں گیا، بجلی ہے۔ مطلب زندگی کی
حرارت ہے۔ اس نے پیچھے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ کھلا تھا یعنی سپرا
باہر گیا ہوگا...... اور جیسا اس نے کہا تھا کہ اسے شاپنگ کرنی ہے اور مردہ خانے کے
لیے یہ لباس موزوں نہیں جو گل بانو کے جسم پر ہے۔ جب تک سپرا نہیں آجاتا۔ وہ
روشنی کرسکتی تھی۔ اس نے روشنی کی۔ اور روشنی میں مردہ خانہ کسی فلم کے سیٹ جیسا
نظر آیا--آرٹ ڈائرکٹر نے محنت سے موت کا کمرہ تیار کیا تھا...... اور موت کا
فرشتہ...... گل بانو نے فریج کھولی۔ فریج میں کھانے کے سامان پڑے تھے۔ اس
نے اطمینان کی سانس لی۔ سردی میں غسل کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ باتھ روم میں اسے
ٹوتھ پیسٹ نظر آگیا۔ اس نے منہ دھویا۔ چہرے پر ٹھنڈا پانی مارا۔ ہاتھ کی انگلیوں
سے بال سنوارے جبکہ مردہ گھر میں اس کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ فریج سے ایک
ویج برگر نکالا اور مسیح سپرا کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ اسے یقین تھا کہ اب تک
اجیت سنگھ راٹھور کے قتل پر ہنگامہ کھڑا ہو چکا ہوگا۔ پولیس کی تفتیش شروع ہو چکی
ہوگی۔ اسے اماّں نور جہاں اور نظیرے پر ترس آرہا تھا۔ یقیناً پولیس نے ان دونوں



سے رابطہ کیا ہوگا۔ ممکن ہے، دونوں کو اذیتیں بھی دی گئی ہوں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ
ان حالات میں وہ نہ اماّں سے مل سکتی ہے اور نہ نظیرے سے۔ مگر راٹھور کے قتل
کا اسے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا۔ اس کے برخلاف وہ مرحومہ چندا یادو اور یونیورسٹی
سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کے بارے میں سوچ رہی تھی اور یہ بھی کہ پتہ نہیں
کہ ان کا احتجاج کس موڑ پر ہوگا یا کچل دیا گیا ہوگا۔ تاہم اسے اطمینان تھا کہ وہ اس
سیاہ موت کی کوٹھری میں آگئی اور اس سے بہتر پناہ گاہ اس کے لیے کوئی دوسری
ثابت نہیں ہوسکتا۔

اب کمرے میں روشنی تھی۔ اور اس وقت گھر میں کوئی نہیں تھا۔ وہ بڑے آرام
سے پورے گھر کی تلاشی لے سکتی تھی۔ اخلاقی اعتبار سے پہلے یہ خیال اسے مناسب
نہیں لگا۔ گھر میں سامان زیادہ نہیں تھا، اس کا مطلب سپرا نے زیادہ تر سامان
فروخت کر دیے تھے یا کسی کو دے دیا تھا۔ دو الماری تھی، جس میں تالہ بند نہیں تھا۔
اس نے تلاشی لی۔ اس تلاشی میں اسے بچوں کے کچھ کھلونے نظر آئے۔ ایک ڈائری
تھی جس پر کچھ لکھا ہوا نہیں تھا۔ ایک میز کی دراز میں ایک کالی ڈائری تھی۔ ڈائری
کے ساتویں صفحہ پر صرف اتنا لکھا تھا۔ ۲۲ فروری جمعہ۔ دوسری دراز میں ایک خاتون
کی تصویر تھی۔ جو ایک کاغذ میں موڑ کر رکھی گئی تھی۔ گل بانو نے قیاس لگایا کہ یہ سپرا
کی اہلیہ ہوگی۔ پورے گھر میں اس سے زیادہ کوئی سامان نہیں تھا۔ وہ باہر بھی نکلنا
چاہتی تھی مگر اسے خوف پکڑے جانے کا تھا۔ اگر اس کی خبر ٹی وی چینلز پر دکھائی
جا چکی ہو تو باہر نکلنے کے بعد کوئی نہ کوئی آسانی سے پولیس کو خبر کرسکتا تھا۔ اس لیے
باہر جانے کا خطرہ مول لینے میں گل بانو کو پریشانی ہو رہی تھی۔
سرسراتی چادروں کے درمیان مجسمے والی عورت اب بھی اس کی طرف دیکھ رہی

تھی۔ گل بانو نے غصے سے کہا، ایک دن میں تمہیں توڑ ڈالوں گی موت کی اینجل۔مجسمہ سہی،لیکن وہ اس مجسمہ سے بات کرسکتی ہے۔گل بانوکوتقویت ملی کہ اگر اس موت کے فرشتہ سے وہ دوستی کرلے تو وقت آسانی سے کٹ سکتا ہے۔اسی خیال کے تحت وہ مجسمہ کے سامنے جا کر کھڑی ہوگئی۔مسکرائی۔آہستہ سے بولی۔

-تمہیں یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔

-تم حکمرانوں کی روح کیوں نہیں قبض کرتی ؟

- جب سینکڑوں کی تعداد میں لوگ قتل ہوتے ہیں،تم اچانک ان سینکڑوں تک ایک وقت میں کیسے پہنچ جاتی ہو؟

- کبوتر......غوں......غوں......

-تم سن رہی ہوموت کا فرشتہ۔؟

اب گل بانو کومزہ آرہا تھا۔ایک دلچسپ کھیل مل گیا تھا۔وہ کبھی منہ چڑھاتی۔ کبھی اس کے لباس کو چھوکر دیکھتی۔وہ خوش تھی کہ وہ موت سے کھیل رہی ہے۔اور اس نے ایک قتل کیا ہے اوراب وہ موت سے کھیل رہی ہے۔

گانا سنوگی....؟

کبوتر جا....جا...جا...مجھے گانا نہیں آتا......اور میرا گلہ بھی بے سُرا ہے......اور اس مردہ گھر میں تم اکیلی ہو جس سے میں سارا دن بات کرسکتی ہوں۔

وہ خوش تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو گل بانو سمجھ گئی کہ مسیح سپرا آ گیا ہے۔اس نے دروازہ کھولا۔مسیح سپرا کے دونوں ہاتھ سامانوں سے بھرے تھے۔اس نے روشنی کی طرف دیکھا اور زور سے چلاّیا......لائٹ بند کرو۔اس مردہ گھر کے کچھ قاعدے قانون ہیں اور اگر نہیں رہنا ہے تو تم جا سکتی ہو....تم



انسانوں کی طرح نہیں رہ سکتی۔وہ چلاّیا۔میں مین سوئچ ہمیشہ کے لیے آف کردیتا ہوں۔سنا تم نے۔

سپرا نے سوئچ پر ہاتھ رکھا اور اندھیرا کردیا۔اب یہ مردہ گھر اندھیرے میں ڈوب چکا تھا۔سفید چادروں سے البتہ روشنی پھوٹ رہی تھی۔ یہ سفید رنگ اندھیرے کونگل جاتا ہے۔اس نے سپرا کے ہاتھوں سے سامان لینا چاہا تو سپرا نے منع کردیا۔سپرا نے سفید چادریں اس کی طرف بڑھائیں اور کھانے پینے کا سامان فریج کے حوالے کردیا۔اس نے کچھ بھی بولنا یا پوچھنا مناسب نہیں سمجھا اور اس کے بعد وہ مجسمہ کے قریب لیٹ گیا۔

یہ تو مر گیا...گل بانو دل کے اندر ہی اندر ہنسی....

’مسیح سپرا نے آنکھیں بند کرلیں۔وہ دیر تک اس کشمکش میں رہا کہ بجلی کٹوادے یا مین سوئچ آف رہنے دے۔آج وہ کافی دیر تک زندوں کے درمیان رہا۔گل بانو کی موجودگی اسے پسند نہیں آرہی تھی۔گل بانو نے مردہ گھر کی تنہائی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے۔یہ اس کا خیال تھا مگر وہ اس لیے خاموش تھا کہ مردہ گھر میں کوئی بھی آسکتا ہے مگر جو بھی آئے اس پر واجب ہے کہ زندوں کے طور طریقے کو بھول جائے۔آج وہ کئی گھنٹے باہر رہا....اور دو واقعے ایسے تھے، جو اس کو پریشان کرنے کے لیے کافی تھے۔ پہلے نوجوانوں کا ہجوم، پولیس کا گولیاں چلانا اور گولیوں کا واپس آجانا۔دو گھنٹے بعد میڈیا، پولیس اور نقاب پوشوں کا حملہ۔اس بار بھی فائرنگ ہوئی مگر گولیاں واپس آگئیں۔مگر گولیاں نہیں لگنے کے باوجود نوجوانوں کے لباس خون سے سنے تھے اور جب وہ چل رہے تھے تو ایسا معلوم ہورہا تھا کہ انہیں احساس بھی نہیں ہے کہ انہیں گولیاں لگ چکی ہیں۔تو کیا حقیقت میں

گولیاں چلی تھیں؟ یا نہیں چلی تھیں۔ اور جیسا یگیہ کے بارے میں کہا گیا کہ دیوتا
ناراض ہیں۔ اسے کئی شہروں میں بھول بھلیوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا مگر اب جو
بھول بھلیوں کی عمارت تھی، اس کے کارنامے وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ ایسا صرف
کہانیوں میں ہوتا ہے یا سیاست میں....اس نے آنکھیں بند کرنا چاہا تو گل بانو کی
آواز سنائی پڑی۔

'ٹی وی نہیں رکھتے ؟'

'نہیں۔'

'پھر کیسے معلوم ہوگا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟'

'مردوں کو یہ بھی جاننے کی ضرورت نہیں۔'

'ہاں مردوں کو یہ جاننے کی ضرورت نہیں' گل بانو آہستہ سے بولی۔ 'مگر
مردے تو قبر میں رہتے ہیں۔'

'میں جہاں لیٹا ہوں وہ میری قبر ہے۔'

'اور میری قبر....؟'

'جہاں تم سونا منظور کرو....'

گل بانو ہنسی....'میں تمہاری قبر میں آسکتی ہوں۔'

کافی دنوں بعد مسیح سپرا نے جسم میں ہلچل محسوس کی۔ اس نے اس ہلچل کو اسی
وقت روک دیا۔ وہ سخت آواز میں بولا....'نہیں۔'

'ایک قبر میں دو لوگ نہیں رہ سکتے ؟'

'نہیں رہ سکتے۔'

گل بانو پھر ہنسی....'کیا تمہیں نہیں لگتا کہ تم ایک شکاری مردے ہو۔ ارے،
تمہارے مردہ گھر میں ایک جوان لڑکی آئی ہے۔ اس کا استقبال تو کرو۔'



'کوئی ضرورت نہیں'، مسیح سپرا نے اس کی طرف دیکھا.....اس بار اس کا لہجہ
مزید سخت تھا....' اور ہاں، کفن پہن لو۔ یہ لباس نہیں چلے گا....اور مجھے زیادہ باتیں
کرنا پسند نہیں۔ مردوں کو گہری خاموشی چاہیے۔'

'کیا مردے شرارتی نہیں ہوتے ؟'

'نہیں۔'

'تمہیں کچھ نہیں معلوم۔ امّاں نے بھوتوں کے قصے سنائے تھے۔ کچھ بھوت تو
بہت شرارتی ہوتے ہیں۔'

'ہونہہ' مسیح سپرا نے آہستہ سے کہا لیکن اس وقت تک اس کی اضطرابی کیفیت
بڑھ چکی تھی۔ وہ بہت بے چین نظر آرہا تھا، یعنی جو کچھ آج ہوا، کیا وہ ممکن ہے۔ سیاہ
اڑتے بادل، مسلمانوں کا ہشکار، سڑک پر پولیس سے ہونے والا مکالمہ اور انقلابی
نوجوان۔ پولیس کی فائرنگ اور......

اندھیرے سایوں کے درمیان وہ اٹھ بیٹھا۔ 'بہت برا۔ بلکہ اس سے زیادہ برا
کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔'

'کیا برا ہوا۔ گل بانو کو اس کی باتوں میں دلچسپی تھی۔'

'گولیاں کہاں گئیں؟ گولیاں؟'

'کون سی گولیاں....؟'

'وہ چلی تھیں۔ اور یقیناً میں پولیس کے پیچھے تھا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ اور
گولیاں چلی تھیں۔ بیس پچیس فائرنگ۔ مگر گولیاں.....'

'یہ کیا بڑبڑا رہے ہو؟'

تعجب ہے— گولیاں چلیں تو کہاں رہ گئیں۔؟ دیوتاؤں نے....؟ اور وہ یگیہ
.....اور جب گولیاں چلی ہی نہیں تو نوجوان زخمی کیسے ہوگئے....اور فرض کیا، نوجوان

زخمی ہوئے تو وہ سڑک پر گرے کیوں نہیں۔؟ وہ ترانہ پڑھتے ہوئے آگے بڑھے اور
اس نے خود دیکھا ہے.....

'یعنی کچھ غیر معمولی ہوا ہے، جو تم نے دیکھا ہے۔'

'ہاں.....'

'پھر ٹی وی کیوں نہیں رکھتے۔'

'نہیں۔ضرورت نہیں۔'

'مگر ضرورت ہے۔کیونکہ تم سوچ رہے ہو۔مردے نہیں سوچتے۔اور مردوں کو
کیا ضرورت کہ حالات کی فکر کریں...'

'ہاں ۔ یہ بھی صحیح.....' مسیح سپرا آہستہ سے بڑبڑایا۔اتنا آہستہ سے کہ اس کی
آواز کی رسائی گل بانو تک نہ ہو اور اس نے خود کو مطمئن کیا کہ وہ مرا ہوا ہے۔اور
مردے نہیں سوچتے اور مردے حالات کا تجزیہ نہیں کرتے... اور یہ نیا وقت ہے
کیونکہ قدرت بھی اپنا رنگ تبدیل کر رہی ہے.... اور جب بہت کچھ تبدیل ہو رہا ہے
تو بندوق سے نکلی گولیاں ہوا میں غائب ہوسکتی ہیں اور گولیاں لگنے کے باوجود
نوجوان چل سکتے ہیں.... اور یہ کوئی نئی بات نہیں کہ بہت کچھ بدل رہا ہے۔بہت
کچھ بدلنے کی شروعات ہوگئی ہے۔اس درمیان گل بانو نے سفید لباس تبدیل کر دیا
تھا۔اب تاریکی میں تین نفوس تھے۔ایک مجسمے والی عورت، ایک سپرا اور تیسری گل
بانو۔اور ان کے اطراف جھولتے سفید پردے۔گل بانو نے غور کیا کہ ان پردوں
کے باہر گولیاں چل رہی ہیں اور وہ ایک خون کر کے آئی ہے... اسے کچھ اور چیزوں
کی طلب ہو رہی تھی۔ اس نے مجسمے والی عورت کی طرف دیکھا اور شرارت سے
پوچھا۔

'میرے لیے بازار جاؤ گی؟'



'بولو نا، کچھ سامان منگانے ہیں۔؟'

سپرا نے آنکھیں کھولیں اور تعجب کیا کہ گل بانو مجسمے سے بات کر رہی ہے۔سپرا
نے اپنی تنہائی میں پھر دخل محسوس کیا۔

'کس سے باتیں کر رہی ہو؟'

'موت کے فرشتہ سے۔'

'سامان؟'

'ہاں ۔عورت ہوں... کچھ سامان تو چاہیے۔'

'نہیں چاہیے۔اور تم بھول رہی ہو کہ تم کہاں ہو۔اور یہ تمہارا گھر نہیں ہے۔'

گل بانو کو احساس ہوا کہ یہ آدمی صحیح کہہ رہا ہے۔ یہ اس کا گھر نہیں ہے۔اور
یہ شخص نہ اس کا باپ ہے نہ دوست۔ اور نہ رشتہ دار۔وہ یہاں پناہ لینے آئی
ہے۔کیونکہ باہر اس کی تلاش ہو رہی ہوگی۔اور اگر فرض کیا، اس شخص نے اسے نکال
باہر کیا تو اس کا جیل جانا طے ہے۔قید کی صعوبتوں کے نام پر اس کا چہرہ فق ہوگیا۔
وہ آہستہ سے بولی.....

'پیریڈ آیا ہوا ہے..' اس کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی... اور میں مردہ ہو کر بھی
خود کو اذیت میں محسوس کر رہی ہوں۔اس نے پوچھا۔'شادی شدہ ہو... ماہواری
سمجھتے ہو نا....؟'

مسیح سپرا کے جسم میں ایک بار پھر ہلچل ہوئی۔ پیریڈ.. ماہواری... اس نے
آنکھیں کھول کر گل بانو کی طرف دیکھا... 'مگر تم باہر گئی تو...'

'میں وہی سوچ رہی تھی... باہر گئی تو پکڑی جاؤں گی...'

'ایک دن میں دوبار.... دوبار انسانی قافلہ سے ملنا۔ایسا ادھر بالکل بھی نہیں ہوا
تھا۔مسیح سپرا پریشان تھا۔مگر مشکل یہ تھی کہ گل بانو کی ضرورتوں کو پورا کرنا ضروری

تھا۔اس کا مطلب، اس کو ایک بار پھر گھر سے باہر جانا ہوگا۔سپرا آہستہ سے بولا۔

’جو سامان منگانے ہیں، اس کی فہرست تیار کرلو۔‘

’زیادہ نہیں ہیں۔‘

’ٹھیک ہے۔ میں باتھ روم سے آتا ہوں۔لیکن آج میں آرام کروں گا۔ دوسرے دن لے آؤں گا۔‘

بہت کچھ بدل رہا ہے۔اور اسی لیے باتھ روم جانے اور واپس آنے تک اس کے کانوں میں، یگیہ میں پڑھنے والے شلوک سنائی دے رہے تھے۔ جبکہ کمرے میں موسیقی کے آلات نہیں تھے۔موبائل نہیں تھا ٹی وی نہیں تھا۔مگر وہ شلوکوں کو سن سکتا تھا اور اسے یقین تھا کہ باہر کی دنیا میں یگیہ کی شروعات ہوچکی ہوگی...اور ممکن ہے یگیہ کے نئے طور طریقوں میں مقدس گایوں کو بھی شامل کیا گیا ہو۔کیونکہ شلوک کی آوازوں کے ساتھ ساتھ وہ گایوں کے رمبھانے کی آواز بھی سن رہا تھا۔ٹھنڈ کافی تھی۔ باتھ روم سے واپس آکر سپرا زمین پر لیٹ گیا۔اسے ٹھنڈک کا احساس ہورہا تھا۔مگر نیند بھی آرہی تھی۔



(5)

## دوسرے دن

سڑک کے بیچ و بیچ آگ جل رہی تھی۔ یگیہ کے لیے ایک بڑا سا گھیرا تیار کیا گیا تھا۔اس وقت وہاں دو سو کے قریب لوگ جمع تھے۔اور ان میں سو سے زیادہ تعداد سادھو سنتوں کی تھی۔ بڑے سادھو نے کھڑے لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وید کے مطابق یگیہ پانچ طریقے کے ہوتے ہیں۔برہم یگیہ۔دیو یگیہ۔ پتر یگیہ۔وشنو دیو یگیہ اور اتیتھی یگیہ۔

اس نے شلوک پڑھا۔

اوم...وشوانی...سویتر دور تیانی پراسو...ہے ایشور۔ ہمارے سارے درگنوں یعنی برائیوں کو دور کر۔اور اچھے گن، کرم میں عطا کر... ہے ایشور... کیول اگنی میں گھی پرواہ کرنا یگیہ نہیں۔ یگیہ وشواس ہے... یگیہ رہسیہ ہے... یگیہ شدھی ہے۔

بڑے سادھو نے آنکھیں بند کیں۔شلوک پڑھا اور آگ کے شعلوں میں گھی ڈالا....

یگیہ شروع ہو چکا تھا....

مسیح سپرا آہستہ قدموں سے چلتا ہوا، کھڑے ہوئے لوگوں کے درمیان شامل ہوگیا۔ ہوا تیز تھی۔ اس لیے شعلے بھڑک رہے تھے۔ سردی میں اضافہ ہوا تھا اور وہ بڑے سادھوں کے ساتھ یگیہ میں شامل سادھو کی بات سن رہا تھا، جس نے سفید لباس دھارن کیا ہوا تھا اور وہ مجمع سے مخاطب تھا۔

’اگنی مقدس ہے۔ ہندو دھرم میں جتنی اہمیت یگیہ کی ہے، کسی بھی چیز کی نہیں ہے۔ ہمارا کوئی بھی کام شبھ، اشبھ یگیہ کے بنا پورا نہیں ہوتا...جنم سے مرتیو تک سبھی سنسکاروں میں یگیہ ضروری ہے۔‘

سرد ہوائیں بہہ رہی تھیں۔ ہوا سے آگ بار بار بھڑک رہی تھی۔ ایسے یگیہ ہر دس قدم کے بعد ہو رہے تھے...اور اس لیے ہو رہے تھے کہ دیوتا ناراض ہیں اور اس جنگ میں دیوتاؤں نے دھرم رکشکوں کی جگہ اربن نکسل کا ساتھ دیا ہے۔

رات بھی سپرا مردوں کی طرح زمین پر لیٹا رہا۔ کچھ فاصلے پر گل بانو لیٹی تھی۔ گل بانو رات میں کئی بار اٹھی۔ مجسمہ کے سامنے کھڑی ہو جاتی۔ پھر لیٹ جاتی۔ یہ باتیں سپرا کو پریشان کرتی رہیں۔ مردہ گھر میں کسی اور کی موجودگی اسے گوارہ نہیں تھی۔ مگر لڑکی کم عمر کی تھی۔ قتل کیا تھا اور اس نے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ قتل کیوں اور کس بات پر کیا۔ اسے یقین تھا کہ گل بانو ایک دن ساری باتیں اسے خود بتا دے گی۔ رات کئی بار اسے احساس ہوا کہ ’مجسمہ ہوا میں تیر رہا ہے یا چل رہا ہے....‘ مجسمہ نے گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا ہے...سفید سرسراتی چادروں کے درمیان رات گزر گئی۔ گل بانو سو رہی تھی۔ صبح ہوگئی...اور آج کا دن اسے ایک بار پھر انسانوں کے درمیان گزارنا ہے۔ سپرا نے خیال کیا کہ جو باتیں کل



ادھوری رہ گئی تھیں، بہت ممکن ہے کہ آج ان کے بارے میں تفصیلات معلوم ہوں۔ گیارہ بجے اس نے گھر چھوڑ دیا۔ گھر سے کچھ دور پر آگ جل رہی تھی۔ شلوک پڑھے جا رہے تھے اور یگیہ کی شروعات ہو چکی تھی۔

وہ آگے بڑھا تو کئی مقامات پر یگیہ کرتے ہوئے سادھو سنت نظر آئے۔ کچھ جگہوں پر احتجاج کرنے والے اب بھی موجود تھے۔ مسیح سپرا کچھ اور آگے بڑھا تو ایک شاپ پر کافی لوگ کھڑے نظر آئے۔ ٹی وی چل رہا تھا اور وہاں کھڑے لوگ پریشان نظر آ رہے تھے۔ سپرا آگے بڑھا۔ ٹی وی پر ملک کے سب سے طاقتور شخص کا انٹرویو دکھایا جا رہا تھا۔ وہ گنجا تھا اور چمکتا ہوا سر۔ گورا رنگ...وہ مسکرا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

سنیے۔ میری بات غور سے سنیے۔ ہم بھی اس مغالطے میں تھے کہ دیوتا ناراض کیسے ہوگئے۔ دیوتا اربن نکسل والوں کے پاس کیسے چلے گئے۔ بندوق سے گولیاں کیوں نہیں چلیں۔؟ یہ وہ سوال تھے جو ملک کی سلامتی اور امن وچین سے وابستہ تھے۔ ہم بھی پریشان تھے۔ لیکن رات....

گنجا حکمراں ٹھہرا...اینکر نے مسکرا کر پوچھا۔ رات کیا....اینکر مسکرا ضرور رہی تھی لیکن اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ گھبرائی ہوئی ہے۔

گنجا حکمراں ہنسا..کل کتنی تاریخ تھی؟

اینکر نے جواب دیا...

گنجا ہنسا...سات جنوری۔ ٹھیک اور یہ حادثہ کل ہوا۔ کل سات جنوری۔ جب اربن نکسلائٹ فساد کر رہے تھے اور ہماری پولیس کو ملک کا تحفظ منظور تھا۔ مگر گولیاں نہیں چلیں۔ رائٹ؟

’رائٹ..‘ نیوز اینکر بولی۔

'اب سنیے میری بات غور سے سنیے۔ دیوتا رات میرے گھر آئے۔ ساکشات درشن دیا... اور بولے بھکت، میں نے سات جنوری بھیجا ہی نہیں تو سات جنوری تمہارے پاس آ کیسے گیا...'

'مطلب؟' اینکر کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

گنجا ہنسا۔ منہ بند کیجیے۔منہ میں چوہے آ جائیں گے۔ وہ ہنسا...دیوتاؤں نے سات جنوری کی تاریخ روک لی ۔اسے ایسے سمجھئے۔ چھ جنوری کے بعد ۸ جنوری۔ آپ اس کو سات کیجیے گا تو دنیا کے سارے کلینڈر بدل جائیں گے۔یعنی ۶ جنوری کے بعد دیش میں ۸ جنوری کا دن آیا۔ دیوتاؤں نے سات جنوری بھیجا ہی نہیں۔کیا کسی کو دیوتاؤں پر شک ہے...؟

اینکر جوش سے بولی۔ بالکل بھی نہیں۔ دیوتا جھوٹ کیوں بولیں گے۔؟

گنجے نے قہقہہ لگایا۔آپ سب کا فرض ہے کہ آپ عام لوگوں کو بتائیں کہ دنیا کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا جب دیوتاؤں نے ۷ جنوری کے دن کو کلینڈر سے نکال دیا۔ آگے بھی یہ ہوگا۔ دیوتا کی مرضی، وہ کلینڈر سے دن نکال سکتے ہیں...اور اس بات پر کسی کو بھی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔کیا اب آپ دیوتا پر شک کریں گے؟

سپرا نے دیکھا، ٹی وی پر انٹرویو سنتا ہوا ایک شخص زور سے چیخا۔کل میں نے پراپرٹی ڈیلر کو دس لاکھ روپے کیش دیا ہے۔وہ تو منع کر دے گا کہ ۷ جنوری جب آیا ہی نہیں تو تم نے کیش کیسے دیا۔؟

ایک دوسرا شخص زارو قطار روتا ہوا بولا۔کل میری پتنی مرگئی اور شام کو اس کا دَہ سنسکار کیا... کیا وہ زندہ ہوگی اور گھر ہوگی جب سات جنوری آیا ہی نہیں۔ ایک غریب تھا اس نے آہستہ سے کہا، کل مجھے کسی کو پانچ ہزار دینے تھے۔کیا میں مطمئن



ہو جاؤں کہ میں نے دے دیے اور جس کو دینے تھے، اس سے جرح کروں کہ میں نے تو دے دیے....

دکان کے مالک نے زور سے کہا۔کل ہی میں نے ایک دوسرے شوروم کا حساب کتاب کیا ہے... پورے بیس کروڑ....

دکان پر کھڑے کچھ لوگ ناراض ہو رہے تھے...تم نے سنا نہیں۔۷ جنوری نہیں آیا۔دیوتا کہہ گئے ہیں۔ دیوتاؤں کے آگے ہم کسی کی نہیں سنیں گے۔

ایک نے چھرا نکال لیا....دیوتا کے خلاف کوئی بولا تو....؟

جھانجریں بجاتے ہوئے دس سے پندرہ لوگ چھرا والے کے ساتھ آ گئے۔ دیوتا کا احترام کرو۔ دیوتا کے خلاف بولنے والے کا سر قلم...

ایک نے شستہ آواز میں کہا، ابھی انٹرویو چل رہا ہے، ذرا سننے تو دو۔

چھرے والے نے کہا۔ ہاں۔ ہمیں سننا چاہیے۔

کیمرہ میں اینکر کا چہرہ تھا۔ وہ پوچھ رہی تھی۔ ایک پورا دن... ایک پوری تاریخ۔ یہ دن دنیا کے تمام ممالک میں آیا ہوگا...

'ہم صرف اپنے ملک کی بات جانتے ہیں' گنجا مسکرایا۔دیوتا نے صرف ہمارے دیس کی بات کہی ہے اور اس میں کسی کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔بس ایک دن کی بات ہے۔ایک دن جو ہماری زندگی میں نہیں آیا'

'لیکن اس ایک دن ملک میں بھی بہت سے حادثے ہوئے ہوں گے؟ بینکوں سے رقم نکالی گئی ہوگی۔کسی کے امتحان کا رزلٹ آیا ہوگا؟ کوئی مر گیا ہوگا.....؟

گنجے سر والا ناراض نظر آیا۔ وہ غصے سے بولا۔آپ گمراہ مت کیجیے۔کسی کو گمراہ مت ہونے دیجیے۔ہم دیوتا کی بات سنیں یا آپ کی بات؟ سات جنوری کو کلینڈر سے نکال دیجیے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے...اور میں صاف کر دوں جو ہمارے

دیوتا کے منکر ہیں، یہ زمین ان کی نہیں۔ جو ہمارے دیوتا کے خلاف ہیں، ہم انہیں اس دیس میں نہیں رہنے دیں گے۔ وہ کوئی بھی ہوں۔اربن نکسل ہوں یا کوئی بھی۔ جو ہمارے دیوتا کہیں گے، سب کو وہی کرنا ہوگا۔ جو ہمارے دیوتا کے مخالف ہوں گے، ان کی موت لازمی ہے۔ جو ہمارے دیوتا پڑھانا چاہیں گے، کالج ، یونیورسٹی، اسکول سب جگہ وہی پڑھایا جائے گا...اور ہم کوئی مخالف بات منظور نہیں کریں گے۔ دیوتا کہیں گے کہ ہم کسی مکان کو توڑ دیں، ہم توڑ دیں گے۔ دیوتا کہیں گے، یہ ہمارے دشمن ہیں ہم ان سے ملک خالی کرالیں گے۔ ہماری سبھیتا پراچین ہے۔اور ہم اب صرف اور صرف دیوتا کی بات سنیں گے۔ دیوتاؤں کی پستکوں میں ایک لکشیہ شدھی کرن بھی ہے اور ہم سموچے دیش کو شدھ کرنے جارہے ہیں۔ جو رہے گا وہ شدہ ہونے کے بعد ہی رہے گا۔ جو نافرمان ہوگا، اس سے رہنے کا، جینے کا ادھیکار چھین لیا جائے گا۔'

سپرا نے دیکھا، اس کے بازو میں ایک شخص تھا۔ جس نے سفید لباس پہن رکھا تھا، جس کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا اور وہ بڑ بڑا رہا تھا،'جب آقا ہمیں گرفت میں لیتے ہیں ہم ایک لمبی نیند میں کھو جاتے ہیں۔ جب آقا اپنی سیاسی اخلاقیات کا صفحہ ترتیب دیتے ہیں، ہم چوہے ہوتے ہیں اور بیشک ہم آواز بلند کرنا بھول جاتے ہیں۔'

مسیح سپرا نے دوبارہ اسے دیکھنا چاہا تو وہ اپنے مقام پر نہیں تھا۔ انٹرویو ختم تھا۔ شور ہنگامہ بڑھ چکا تھا۔ لوگ اپنے گھروں سے باہر نکل رہے تھے۔ شدھی کرن کی شروعات ہوچکی تھی اور اس وقت ٹی وی اینکر کے ساتھ حزب اختلاف پارٹی کا ایک امیدوار تھا جو چیخ رہا تھا۔

'۷ جنوری کلینڈر سے گم... کیا کسی ایک دن کو کلینڈر سے گم کیا جاسکتا ہے اور



آپ کہہ رہے ہیں، دیوتا، کون سے دیوتا؟ ہمارے ہزار دیوتا ہیں۔ آپ دیوتا کا نام لیجیے اور بتائیے۔ ساکشات درشن دینے والا دیوتا کون سا تھا اور کیا کوئی ایک دن وقت، عہد، زمانہ کی تاریخ سے کبھی جدا کیا جاسکتا ہے؟ کیا کبھی پہلے ایسا ہوا؟'

'تو آپ دیوتا کے ہونے سے انکار کررہے ہیں۔ آپ دیش کو گمراہ کررہے ہیں۔' اینکر کا لہجہ بدل چکا تھا۔ اب اینکر زور زور سے چلا رہی تھی۔ اربن نکسل... ان چہروں کو پہچانیے، ملک کو گمراہ کرنے والے چہروں کو پہچانیے ۔ یہ دیوتا کے وجود سے بھی انکار رکھتے ہیں۔ یاد کیجیے۔ دیش سے پیاز غائب ہوا کہ نہیں؟ ٹماٹر غائب ہوا کہ نہیں؟ نوکری غائب ہوئی کہ نہیں، روزگار غائب ہوا کہ نہیں...اور اب، جب ایک دن دیوتا نے غائب کردیے تو یہ ہنگامہ مچا رہے ہیں۔

تو کلینڈر سے ایک دن غائب ہوگیا۔ دیوتا نے کردیے۔ سات تاریخ۔ سپرا نے حساب لگایا کہ سات جنوری وہ کیا کررہا تھا اور سات جنوری کی تاریخ غائب ہوگئی تو کیا اسی دن گل بانو قتل کرکے فرار ہوئی تھی؟ تو پھر اس نے قتل بھی نہیں کیا... اور جب قتل نہیں کیا تو پھر سزا کا جواز کیا ہے۔؟

سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ کل ہوا کیا تھا؟ کیا اتنی بڑی بات ہوگئی کہ دیوتا سیاسی منظرنامہ میں داخل ہوگئے؟ وہ مردہ ہے اور اسے یہ سب سوچنے کا حق نہیں۔

مسیح سپرا نے خود کو سمجھایا مگر اس کے باوجود سات جنوری کے حالات کو وہ سمجھنا چاہتا تھا۔ دکان کے قریب سے لوگ چھٹنے لگے تھے۔ سڑک پر بھیڑ بڑھنے لگی تھی۔ کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں اسٹیک تھی۔ کچھ کے ہاتھوں میں شمشیریں چمک رہی تھیں اور ایسے لوگ پولیس والوں سے ملتے تو ان کی خیریت ضرور پوچھتے۔ اور اب اسلحے لے کر نکلنا دیوتا پسند لوگوں کیلئے جرم نہیں تھا اور سڑک پر مسلسل ایسے افراد کی تعداد

میں اضافہ ہورہا تھا۔اور اب مسیح سپرا کو احساس ہورہا ہے کہ تاریخ سے الگ ہونا کیا ہوتا ہے؟اس کے پاس نہ موبائل ہے اور نہ لیپ ٹاپ اور نہ ٹی وی ہے اور نہ انٹر نیٹ کنکشن۔ وہ اپنے عہد، زمانہ اور وقت سے اس لیے کاٹ دیا گیا کہ وہ مردہ ہے۔اور مردوں کے پاس سے تاریخ اور وقت کا اثاثہ ختم ہوجاتا ہے۔ایک منجمد اور ساکت وقت جس کے حصہ میں کچھ بھی نہیں۔ اس کے دماغ میں وقت کی ایک مشین فٹ تھی۔ یہ مشین اس نے مہینوں پہلے دماغ سے علیحدہ کردی۔اور اس وقت بھی وہ مردوں کے لباس میں ہے۔

ایک پارک تھا۔ وہاں سینکڑوں کی تعداد میں نوجوان جمع تھے۔نوجوانوں نے ہاتھوں میں چھرا اٹھا رکھا تھا۔کبھی ان میں سے کوئی نعرہ لگاتا اور پھر سارے مل کر نعروں کی آواز کو تیز کردیتے۔ایک نوجوان لڑکی تھی، جس کے ہاتھ میں مائیک تھا اور جو زور زور سے کچھ کہنے کی کوشش کررہی تھی۔مسیح سپرا کو احساس ہوا کہ یہاں اس کے سوالوں کا جواب مل سکتا ہے۔اس نے دیکھا، سڑک سے، ایک قطار سے پولیس کی گاڑیاں گزر رہی تھیں اور اس طرح گزر رہی تھیں جیسے جنگ کا اعلان ہوگیا ہو۔ان میں بکتر بند گاڑیاں بھی تھیں اور کچھ مقامات ایسے تھے جہاں جھنڈ کے جھنڈ پولیس والے اسلحوں سے لیس اتر رہے تھے۔کیا ملک کو کسی نئی جنگ میں جھونک دیا گیا ہے۔؟ کیا ایمرجنسی لگادی گئی ہے؟ یا جنگ کا اعلان ہوچکا ہے یا ہونے والا ہے۔مگر یہ جنگ کس کے خلاف ہے؟ اور دیوتا آنے والے وقت میں کس کس دن کو وقت کے کلینڈر سے باہر کریں گے۔ایسے بہت سے سوال تھے جو اس وقت مسیح سپرا کے ذہن میں اٹھ رہے تھے۔



اس نے آسمان سے لہولہان فاختاؤں کو گرتے دیکھا اور یہ وقت تھا جب تیز دھول کی آندھی چلی اور دومنٹ میں آندھی رخصت ہوگئی۔لہولہان فاختائیں، زرد آندھی.....کیا یہ سب اس کے ذہن کی اختراع ہے یا حقیقت میں ایسا ہورہا ہے؟

اب وہ پارک کے قریب آگیا تھا۔یہاں سے اس نوجوان لڑکی کا چہرہ صاف تھا جو مائیک پکڑے تقریر کررہی تھی۔اس نے بتایا کہ سات جنوری ملک گیر پیمانے پر احتجاج کا دن تھا اور اس دن بے دریغ لوگ ہلاک ہوئے۔ پولیس نے بے رحمی سے گولیاں چلائیں ۔ اور اب حکومت کہہ رہی ہے کہ گولیاں چلی ہی نہیں۔بڑی تعداد میں نوجوانوں کی ہلاکت سامنے نہیں آئی۔ملک کے گوشے گوشے سے ہمارے نوجوان غائب ہیں۔

مسیح سپرا نے دل ہی دل میں دہرایا۔سات جنوری۔ ہلاکت کی تاریخ۔ ہمارے نوجوان غائب۔ اس نے لڑکی کی طرف دیکھا جو زور زور سے بول رہی تھی۔

’کیا خود کے لیے لڑنا جرم ہے؟ ہم سے دستاویز مانگے جارہے ہیں۔ باپ داداؤں کے برتھ سر ٹیفکیٹ۔ وہ آدھار نہیں مانگتے۔ انہیں ووٹر آئی ڈی نہیں چاہیے۔ اس لیے میرا مطالبہ ہے کہ وہ پہلے حکومت چھوڑیں۔ کیونکہ جب ہماری شہریت پر یقین نہیں تو وہ حکومت کے رکھوالے کیسے ہوگئے۔ جب ہمارے آدھار کارڈ اور شناختی کارڈ منظور نہیں تو انتخاب کی حقیقت اور نتائج سب بے معنی ہوجاتے ہیں۔ پہلے حکومت استعفیٰ دے اور اس کے بعد ہماری شہریت پر مہر لگائے۔ ظاہر ہے وہ ایسا نہیں کرسکتے کیونکہ حکومت اور وابستہ افراد کے پاس بھی اپنے باپ داداؤں کے برتھ سر ٹیفکیٹ نہیں ہوں گے۔ضروری کاغذات نہیں ہوں گے تو کیا یہ کاغذات وہ جعلی بنائیں گے۔؟ اس وقت یہی ہورہا ہے۔اور دنیا دیکھ رہی ہے کہ

ایک سفاک چٹکلہ یا لطیفہ یا جوک ہماری جان لے رہا ہے۔

یہ لطیفہ ہی ہے کہ ہمارے پاس سے اس وقت کے سرٹیفکیٹ اور ثبوت مانگے جارہے ہیں، جب زندہ ہونے اور شہری ہونے کے ثبوت نہیں ہوا کرتے تھے۔ بچوں کی پیدائش کے اندراج نہیں ہوا کرتے تھے۔ آپ نے ایک چٹکلہ کے لیے ملک کو موت کے راستے پر ڈال دیا۔ میں نے وہ انٹرویو سنا ہے۔ جب ایک گنجا حکمراں نیوز اینکر سے باتیں کررہا تھا۔ اس نے صاف کہا کہ شناختی کارڈ اور آدھار سے شہریت ظاہر نہیں ہوتی۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ کیوں ظاہر نہیں ہوتی۔ نیوز اینکر کے پاس اتنا بڑا جگرا نہیں تھا کہ وہ اس حکمراں سے کچھ سوال کرسکے۔ وہ یہ تو پوچھ ہی سکتی تھی کہ جب شناختی کارڈ سے شہریت ظاہر نہیں ہوتی تو پھر آپ نے انتخاب کیوں کرایا؟ تو پھر آپ کی جیت بے معنی ہے..اور جب ہم آواز اٹھانے، اٹھے تو آپ نے گولیاں چلادیں۔ سات جنوری۔ اور اب آپ کہتے ہیں کہ سات جنوری کلینڈر میں ہے نہیں۔ دیوتاؤں نے جنوری کے مہینے سے یہ دن خارج کردیا۔ سات جنوری کوئی تماشہ نہیں ہوا۔ سات جنوری ہمارے لیے جلیاں والا باغ سے کہیں زیادہ ہے۔ اس دن پورا ملک لہولہان ہوا ہے۔' سات جنوری کو پورے ہندوستان میں ایک سروے کے مطابق لاکھوں بچے پیدا ہوئے ـــــ تو کیا ان بچوں کو مردہ تسلیم کیا جائے۔ یا سمجھا جائے کہ یہ بچے پیدا ہی نہیں ہوئے۔

مسیح سپرا اب اس منظر کی زد میں تھا جب اس نے گولیاں چلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور گولیاں چلنے کے بعد سڑکوں پر یگیہ شروع ہوگیا تھا۔ حکومت آنکھوں کے آگے پردہ ڈال رہی ہے۔ یعنی جو کچھ وہ دکھانا چاہتی ہے، آنکھیں وہی دیکھتی ہیں۔ مسیح سپرا کو افسوس ہوا کہ مردہ خانے کا حصہ بنتے ہی اس ملک میں یہ کیسی شروعات ہوگئی۔ پھر اس نے دیکھا، چھوٹے چھوٹے بچے ہیں جو ہاتھوں میں ترنگا لیے ایک



قطار سے آزادی کا نعرہ لگاتے ہوئے چل رہے ہیں۔ اس نے ایک بچے کو روکا۔ استفسار کیا....

'یہ تم کیا گارہے ہو؟'

'آزادی۔'

'لیکن ملک تو آزاد ہے؟ پھر آزادی کیسی؟'

'ملک آزاد نہیں۔'

'یہ تمہیں کس نے بتایا...'

'ملک آزاد ہوتا تو ہم آزادی کے نعرے کیوں لگاتے....'

'ہاں۔ کیوں لگاتے..' مسیح سپرا نے بچے کو دیکھا۔ بارہ سال کی عمر ہوگی۔ گورا چٹا۔ اس کے ہاتھ میں ترنگا تھا اور چہرے پر سکون....

مسیح سپرا نے پھر پوچھا..' تو تم غلام ہو....؟'

'ہاں۔'

'تم غلامی کو سمجھتے ہو...؟'

'ہاں، جب ہمیں پڑھنے سے بھی روکا جائے۔'

'لیکن کون روک رہا ہے۔'

بچے نے آسان جواب دیا۔ 'جو ہمیں غلام بنارہے ہیں۔'

'جو غلام بنارہے ہیں، وہ نہیں چاہتے کہ تم پڑھو....؟'

'ہاں..'

'کیسے؟'

'ہم پڑھیں گے تو غلام نہیں رہیں۔'

'اچھا سات جنوری کو تم کیا کررہے تھے۔'

'ہمارا کرکٹ میچ تھا۔'

بچہ اپنے گروپ کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ مسیح سپرا بچوں کو نظروں سے اوجھل ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔ بچوں کو تعلیم سے روکا جا رہا ہے۔ عورتیں نعرے لگا رہی ہیں۔ نوجوان سڑکوں پر آ کر گولیاں کھا رہے ہیں اور وہ مردہ خانے میں ہے۔ وہ چند قدم اور چلا ہوگا کہ اچانک ٹھہر گیا۔ اس نے گولیوں کی آوازیں سنیں اور پولیس کی پانچ چھ بڑی گاڑیوں کو سڑک پر رُکتے ہوئے دیکھا۔ گاڑیاں ایک قطار سے کھڑی ہو گئیں۔ مسیح سپرا کے کانوں میں بچوں کی آوازیں ابھی بھی ابھر رہی تھیں۔ آزادی۔ اس نے ایک پولیس والے کی آواز سنی جو کہہ رہا تھا۔

'یہ لوگ کیوں نہیں سمجھتے کہ اب ملک بدل چکا ہے۔'

دوسرا پولیس والا غصے سے بولا...'ہمارا راشٹر ایک نئی پہچان میں ہے۔'

پہلے والے نے گالی دی۔ 'یہ باسٹرڈ۔ انہیں دوزخ بھیجو یا قبرستان....'

پھر اس نے دیکھا، جو عورتیں، مرد، بچے ہیں۔ وہ رو رہے ہیں اور چیخ رہے ہیں۔ اس نے ان ملی جلی آوازوں کو سمجھنے کی کوشش کی تو کاغذ، دستاویز جیسے لفظ سامنے آئے اور یہ بات ظاہر ہوگئی کہ ان کے پاس کاغذات نہیں ہیں اور انہیں پولیس گاڑیوں میں بھرا جا رہا ہے۔ پھر اس کے بعد ان لوگوں کو موت کے کیمپ میں مرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے گا۔

تو ملک ایک بار پھر غلام ہو چکا ہے۔ اور لوگ آزادی چاہتے ہیں۔ مسیح سپرا کو انقلاب فرانس کی یاد آ رہی تھی۔ جب اس نے پڑھا کہ عوام نے شاہی محافظوں کو قتل کر دیا۔ اور پھر اس نے وہ منظر دیکھا، جس کی امید نہیں تھی۔ ان دبے کچلے لوگوں نے جنہیں پولیس گاڑیوں میں بھرا جا رہا تھا، اچانک پولیس پر حملہ کر دیا۔ کچھ



نے پولیس کے ہاتھوں سے بندوقیں چھین لی۔ ان کی عورتیں چیخ رہی تھیں۔

'مارو انہیں۔'

'مار دو۔'

'ہلاک کر دو۔'

گاڑیوں سے نکل کر لوگ باہر آ گئے۔ پولیس نے گولیاں داغیں۔ گولیاں ادھر سے بھی چلیں۔ اس نے شاخ برگد کا سہارا لیا اور یہاں سے وہ تمام منظر دیکھ سکتا تھا۔ اس نے ان میں کئی پولیس والوں کو گرتے ہوئے دیکھا...اسے یقین تھا، کچھ دیر بعد یہاں فوج بھی آ سکتی ہے۔ گولیاں دونوں طرف سے چل رہی تھیں۔ اب یہاں رُکنا مشکل تھا۔ وہ واپس ہوا اور اس کو گل بانو کی پرچی بھی یاد نہیں رہی۔ کچھ دیر بعد وہ گھر میں تھا اور گل بانو پوچھ رہی تھی۔

'خالی ہاتھ....'

'ہاں...'

'سامان نہیں لائے...؟'

'نہیں...'

'کیوں...'

'آزادی...' مسیح سپرا کے ہونٹوں پر لرزش تھی۔ وہاں گولیاں چل رہی ہیں، سڑکوں پر۔ اور لوگ آزادی چاہتے ہیں۔'

'تمہارے لیے یہ لفظ نیا ہے؟'

'ہاں...'

'کیوں نیا ہے...'

'میں سمجھتا تھا کہ ہم آزاد ہیں...'

'لیکن ہم آزاد نہیں ہیں۔'

'ہاں۔'

'اور مردہ خانے میں۔' گل بانو نے ٹھہا کا لگایا۔ جانے دو۔ میں نے سوچ لیا ہے۔ اب میں جاؤں گی۔

'باہر؟'

'ہاں۔ اور کیا...'

'اور پولیس....؟ تم کو تلاش کر رہی ہوگی۔'

گل بانو چلتی ہوئی مجسمہ کے پاس آ کر ٹھہر گئی۔ کہیں کوئی خوف نہیں تھا۔ 'ابھی تم نے بتایا نا کہ کئی لوگ مارے گئے، ان میں پولیس والے بھی تھے۔ ہزاروں روز مارے جا رہے ہیں۔ ان ہزاروں میں اس ایک راٹھور کی گنتی کون کرے گا، جس کو میں قتل کر کے آئی ہوں.... آزادی'

گل بانو اس لفظ پر آ کر رُکی۔ یہ لفظ چندا سے سنا تھا۔ یہ لفظ زندگی دیتا ہے۔ میں آزادی کے لیے جاؤں گی۔'

سفید سرسراتی چادروں کے درمیان سپرا نے اس یقین کو آسانی سے پڑھ لیا جو اس کے چہرے پر موجود تھا۔ اس نازک وقت میں ملک وہاں آ گیا تھا جہاں بڑی تعداد میں لوگ آزادی کی مانگ کر رہے تھے۔ سپرا نے سوچا، غلامی ایک سانپ ہے، جس کے سر کو کچلنا ضروری ہے۔ غلامی ایک خوف ہے، ایک گیس چیمبر ہے، جس سے آزادی چاہیے....

'یہ میری قبر ہے..' اس نے مجسمہ کے سامنے والی جگہ تلاش لی اور لیٹ گیا۔ اس کو علم نہیں تھا کہ گل بانو اسے دیکھ رہی ہے... اور اس وقت اس آدمی کے لیے گل



بانو کے دل میں پیار اٹھ رہا تھا... گل بانو اس سے کچھ فاصلے پر لیٹ گئی۔ وہ آہستہ سے بڑ بڑائی... یہ میری قبر ہے۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے پھر پوچھا....

'ٹڈیوں کا ہجوم تھا؟'

'ٹڈیوں کا..' مسیح سپرا چونکا۔

'ناشپاتی کھاؤ گے۔'

'ذائقہ سے خود کو محروم کرو۔'

گل بانو ہنسی۔'واہ.. جبکہ تم دنیا کے ذائقہ سے اب بھی محروم نہیں ہو۔'

## (6)

رات کے بارہ بجے پچھلے دروازے پر دستک ہوئی۔ کئی لوگوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ گل بانو ابھی سوئی نہیں تھی۔ مسیح سپرا نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ مگر مسلسل دستکوں سے اس کو الجھن ہوئی۔ باہر تو تالہ لگا ہے۔ اور اس وقت کون ہوسکتا ہے۔ اس نے گل بانو کو اشارہ کیا۔ گل بانو دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ آگے بڑھ کر مسیح سپرا نے دروازہ کھولا۔ سامنے چھ لوگ تھے۔ یہ اس کی مرحوم اہلیہ کے بھائی کی فوج تھی۔ آگے غلام ربانی تھا۔ عمر ۵۲ برس۔ چہرے پر گھنی داڑھی۔ سوٹ میں ملبوس۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی تھی۔ عرشیہ۔ اور ساتھ میں اس کے چار بچے تھے۔ سب سے چھوٹے والے عامر کی عمر ۷ برس تھی۔ سب سے بڑی لڑکی تھی۔ نازیہ، جو اب شادی کے قابل ہوچکی تھی۔ اس کے بعد احمر تھا۔ پچیس برس کا نوجوان۔ احمر کے بعد شازیہ تھی، جو ابھی بیس برس کی تھی اور کالج میں پڑھ رہی تھی۔ اس کے بعد صبا تھی، ۱۵ برس کی اور اکثر خاموش رہتی تھی۔

باہر تالہ کیوں لگا ہے۔ غلام ربانی نے جھنجھلا کر کہا۔ ہم تو جانے والے تھے۔ اتفاق سے پشت کے دروازے کا خیال آگیا۔ اور ہاں سُنو۔ ابھی ہم ایک ہفتہ تمہارے یہاں گزارنے کے خیال سے آئے ہیں۔ تمہاری بھی تفریح رہے گی۔



اکیلے اکیلے بور ہو گئے ہو گے۔ اتنا سنّاٹا کیوں ہے....؟

'کچھ نہیں۔'

غلام ربانی اپنی فوج کے ساتھ اندر تو آگیا لیکن اندر آنے کے بعد وہ خوفزدہ تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ یہی حال اس کی بیوی اور بچوں کا تھا۔ غلام ربانی زور سے چیخا۔ یہ سب کیا ہے۔

اس کی بیوی نے کانپتے ہوئے پوچھا..'یہ ہم کہاں آگئے؟'

احمر نے پوچھا۔'اتنا اندھیرا کیوں ہے۔'

شازیہ زور سے چلائی۔'مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'

عامر آہستہ سے بولا۔'ڈارک روم گیم..'

صبا مسکرائی۔'لیکن یہ اندھیرا مجھے پسند ہے۔'

کمرے میں آنے کے بعد بھی ان کے چہروں پر خوف مسلط تھا۔ مسیح سپرا کو خیال نہیں تھا کہ رات گئے کبھی اس کی اہلیہ کے رشتے دار بھی آسکتے ہیں۔ وہ حیران بھی تھا اور اس بات کے لیے خوفزدہ بھی کہ یہ لوگ مردہ خانے کی تنہائی کا خاتمہ کردیں گے۔ یہ وہ لوگ تھے، جن کو نکال باہر بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس نے غلام ربانی، اس کی اہلیہ عرشیہ اور بچوں کا چہرہ دیکھا جو حیرانیوں میں ڈوب کر کمرے کا جائزہ لے رہے تھے۔ نہ کوئی روزن، نہ کھڑکی، سفید چادروں کے درمیان موت کا مجسمہ۔

'یہ سب کیا ہے۔' غلام ربانی زور سے چیخا۔

'کچھ نہیں۔'

'کھڑکیاں، دروازے بند کیوں ہیں؟'

'مجھے روشنی سے الرجی ہے۔ ڈاکٹر کو دکھایا تھا...' مسیح سپرا آہستہ سے بولا۔

'ہاں۔ یہ الرجی کچھ لوگوں میں ہوتی ہے...مگر روشنی...؟'

'روشنی نہیں ہے۔؟'

مگر کیوں؟ یہ سوال عرشیہ نے پوچھا۔ وہ خوفزدہ نظر آرہی تھی۔

'بجلی والوں نے بجلی کاٹ دی۔' سپرا نے بہانہ بنایا۔

'مگر کیوں؟'

'پیسے جمع نہیں کیے تھے۔' مسیح سپرا نے آہستہ سے کہا۔

نازیہ نے پوچھا۔ پھر ہم اس گھر میں کیسے رہیں گے۔ یہ تو بھوت بنگلہ لگتا ہے۔

غلام ربانی کی آواز کمزور تھی۔ اتنی دور سے آئے ہیں تو کچھ دن تو رہنا ہی پڑے گا۔ عامر چلتا ہوا اندھیرے میں مجسمہ کے پاس کھڑا ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں سوال تھا...'یہ کیا ہے؟'

'کچھ نہیں۔' سپرا آہستہ سے بولا۔

عرشیہ بولی۔'یہ جو بھی ہے، خوفزدہ کرنے والا ہے۔'

غلام ربانی نے پھر پوچھا۔'اس گھر میں تمہارے سوا کوئی اور تو نہیں رہتا؟'

جواب عرشیہ نے دیا۔'کوئی ہوتا تو گھر کا یہ حال ہوتا۔ میرا خیال ہے، اکیلے رہنے کی وجہ سے ان کے دماغ پر بھی اثر پڑا ہے۔'

'ممکن ہے۔ غلام ربانی نے کہا...مگر اندھیرا بھی ایک سچ ہے...اور میرے بچو، ڈرو مت۔ اندھیرے کا سامنا کرنا سیکھو۔ ہاں تو بھائی مسیح۔ اس گھر میں اندھیرا ہے۔ سفید چادریں لگا رکھی ہیں اور بے جان مجسمہ ہے...اور اس گھر میں تم اکیلے رہتے ہو اور تم کبھی نہیں سوچتے کہ تم سے کوئی ملنے والا بھی آسکتا ہے...'

'ہاں۔'

'اندھیرے کا کوئی علاج۔ مثال کے لیے لالٹین، چراغ، کینڈل...'



'نہیں ہے۔'

'اوہ۔' غلام ربانی زور سے ہنسے۔ دلچسپ۔ پھر اس نے شازیہ سے کہا،'تمہیں یاد ہے۔ جب تم چھوٹی تھی، ہم ڈارک روم گیم کھیلتے تھے۔'

'ہاں ڈیڈ۔'

'اس وقت ہم ڈارک روم میں ہیں۔ کیا تم میں سے کسی کو پریشانی ہے...؟'

'ہم ایک دوسرے کو دیکھ نہیں پا رہے؟' عرشیہ نے کہا۔

'کیا دیکھنا ضروری ہے؟' غلام ربانی سنجیدہ تھے۔

'بالکل نہیں۔'

'پھر ٹھیک ہے۔ نیا تجربہ۔' غلام ربانی کھلکھلایا۔ پھر مسیح سپرا سے بولا...'پہلے ہمارے لیے کچھ کھانے کا انتظام کرو۔ پھر ہمارے سونے کا۔ جب تمہاری اہلیہ زندہ تھیں تو تمہیں یاد ہوگا، وہ ہمارا کیسا خیال رکھتی تھیں۔'

'جی۔ یاد ہے۔'

'اب ہماری مہمان نوازی تمہارے ذمے۔'

فریج میں کئی دنوں کے سامان پڑے تھے۔ سپرا نے بے دلی سے فریج خالی کیا۔ بٹر، بریڈ، فروٹ جام، آملیٹ، فرائی کئے ہوئے گوشت کے کچھ پیس، مٹھائیاں، ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگ گیا۔ غلام ربانی، عرشیہ، نازیہ، احمر، شازیہ، صبا کھانے پر بیٹھ گئے۔ تاریکی میں دانتوں کے بجنے سے موسیقی ابھرتی رہی۔ سپرا ان کی کیفیت محسوس کرسکتا تھا، مگر خاموش تھا۔ ایک ساتھ اتنے سارے لوگوں کو دیکھ کر وہ پریشان بھی تھا اور اس کو غصہ بھی آرہا تھا۔

غلام ربانی نے زور سے کہا اور پہلے جی بھر کر ہنسا...'یہ بھی ایک دلچسپ تجربہ ہے کہ اس مہذب دنیا میں ہم اس وقت اندھیرے میں ہیں جبکہ ایک دوسرے کو

دیکھ پانا بھی ناممکن ہے مگر ہم اس وقت اندھیرے میں کھا رہے ہیں۔' وہ زور سے ہنسا۔ 'مہذب دنیا میں اندھیرا... اور یہ بریڈ کہاں گئی۔ یہ شاید پنیر کا ٹکڑا ہے.... اور یہ میرا خیال ہے احمر کا ہاتھ ہے، جو میرے ہاتھ سے ٹکرایا ہے... اُف... کتنا دلچسپ ہے کہ ہم اندھیرے میں کھانے کی چیزوں کو ٹٹول رہے ہیں مگر بھائی سپرا، یہ اندھیرا تم نے صدمے کی کیفیت سے پیدا کیا ہے تو میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گا اور تم اس وقت کہاں کھڑے ہو، مجھے یہ بھی نہیں معلوم۔'

'میں ادھر ہوں۔ آپ کے دائیں طرف۔' سپرا نے کہا۔

' اوہ اچھا... اندھیرا۔ مہذب دنیا میں اندھیرا' غلام ربانی نے پھر ٹھہاکا لگایا۔ 'تمہاری اہلیہ محترمہ خوش اخلاق تھیں۔ مگر ان کے جانے کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ تم اپنی دنیا کو تاریک بنالو۔ بجلی کٹ گئی ہے تو پیسے جمع کراؤ... اور یہ سفید چادریں... ان سے الجھن ہو رہی ہے۔'

'مجھے آنکھوں کی تکلیف ہے...' سپرا بدبدایا...

'ہاں تم نے بتایا تھا... الرجی... تم نے الرجی کا لفظ استعمال کیا تھا۔ مگر دیکھو تو سہی، یہ بھوت بنگلہ نظر آتا ہے۔ کیا مہذب انسان بھوت بنگلوں میں رہتے ہیں۔؟'

عرشیہ کو یہ گفتگو ناگوار گزری۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ 'ہمیں خبر کر کے آنا چاہیے تھا۔ بھائی صاحب کی طبیعت اچھی نہیں۔'

عامر نے زور سے کہا... 'میں کچھ گانا چاہتا ہوں۔'

صبا نے کھلکھلا کر کہا۔ 'اندھیرے میں تم کو گانا یاد آرہا ہے؟'

غلام ربانی نے عامر کا ساتھ دیا۔ 'ضرور۔ گانے سے اندھیرا زخمی ہوگا...... اور تم گا سکتے ہو۔ مگر اوٹ پٹانگ گانے سے پرہیز کرنا۔'

عامر نے گلہ کھنگارا.. اور زور سے گانا شروع کیا... بندر والا... او بندر والا...



آگے رستہ کھائی ہے... بندر والا آئی ہے۔

غلام ربانی نے ٹوکا۔ 'بندر والا آیا ہے۔ قواعد کی رو سے بندر والا آئی ہے۔'

شاذیہ نے زور سے کہا۔ 'اب یہ قواعد بیچ میں کیوں لائے ڈیڈ... اب اندھیرے میں کس کو معلوم کہ بندر والا عورت ہے یا مرد۔'

غلام ربانی بولے۔ 'بندر والا آیا مطلب مرد آیا۔'

نازیہ ہنسی'... بندر والے کو آنے تو دیجیے۔ آپ نے درمیان میں ہی عامر روک دیا۔ تم گاؤ عامر۔ ہم بھی گائیں گے۔'

عامر نے گانا شروع کیا اور سب مل کر گانے پر تھرکنے لگے۔

آگے رستے کھائی ہے
بندر والا آئی ہے
اس کے ہاتھ ملائی ہے
بندر والا آئی ہے
اندھیرے میں بندر والا
خوب دھوم مچائی ہے

غلام ربانی نے پھر ٹوکا۔ 'دھوم مچایا ہے....'

عامر نے زور سے کہا۔ میرے اسکول ٹیچر نے ایسے ہی سکھایا ہے۔

غلام ربانی بولے'... غلط سکھایا ہے... اور تم لوگ یہ ہڑدنگ بند کرو۔ غلط جملے کانوں کو سیسہ پلا دیتے ہیں۔ الجھن ہوتی ہے۔'

اس درمیان عامر اٹھا۔ وہ مجسمہ کی طرف بڑھا... اندھیرے میں اس نے کچھ دیکھا اور زور سے چلایا...

'بھوت...'

'کیا؟'

غلام ربانی کے ساتھ عرشیہ، نازیہ، شاذیہ، احمر بھی چونک اٹھے۔

عامر رو رہا تھا۔ میں نے ایک عورت کو دیکھا ابھی... سفید لباس میں۔ وہ وہاں کھڑی تھی... میں نے صاف دیکھا ہے...'

'تمہارا وہم ہوگا۔'

'نہیں—— میں نے دیکھا ہے۔'

غلام ربانی نے مسیح سپرا سے پوچھا۔ کیا تمہارے علاوہ یہاں کوئی اور بھی ہے۔ میرا مطلب ہے عورت؟

'نہیں—— 'مسیح سپرا نے کہا۔

'اس مردہ گھر میں بھوت تو آ ہی سکتا ہے۔' عرشیہ آہستہ سے بولی۔ ہم یہاں زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکتے۔

عامر اب بھی چلاّ رہا تھا۔ بھوت میں نے دیکھا ہے۔ یہاں بھوت رہتے ہیں۔

غلام ربانی کمزور آواز میں بولے۔ اب بھوت سب جگہ رہتے ہیں۔ اور ہاں، ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

مسیح سپرا نے مرحوم اہلیہ کے کمرے میں ان لوگوں کے سونے کا انتظام کیا۔ ڈبل بیڈ پہلے سے موجود تھا۔ بچوں کے سونے کا انتظام زمین پر کیا۔ گرم لحاف اور کمبل گھر میں موجود تھے۔ ان انتظامات سے فارغ ہوکر سپرا مجسمہ والی جگہ پر لوٹ آیا۔ اس کو گل بانو کی فکر ہو رہی تھی۔ گل بانو نے کھایا بھی نہیں ہوگا۔ سفید چادریں ہل رہی تھیں اور مجسمے والی عورت اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ لیٹ گیا لیکن اسے ان بن بلائے مہمانوں پر شدید قسم کا غصہ آ رہا تھا۔ مردہ خانے میں ان زندوں کا کیا کام۔



مسیح سپرا کو ہنسی آئی۔ مگر اس نے مسکرانے سے پرہیز کیا۔ مسکرانا انسانی عادت و خصائل میں شمار ہوتا ہے۔ اس کو مسکرانا نہیں چاہیے۔ مگر یہ لوگ...؟ یہ لوگ سمجھتے کیوں نہیں کہ سب مردہ ہیں اور یہ لوگ بھی چلتے پھرتے بھوت ہیں۔ ابھی ہیں اور ابھی نہیں۔ حکومت نے ۷ر جنوری کے دن کو غائب کر دیا۔ خدا نے انسان کو ہی غائب کر دیا۔ پھر اس نے موت کی فصیل کو دیکھا... یہاں مردے جھول رہے تھے۔ پھر اس نے اس سڑک کا جائزہ لیا جہاں پولیس گولیاں برسا رہی تھی اور خون آلودہ نوجوان ایک قطار سے گولیوں کے درمیان آگے بڑھ رہے تھے۔ پھر مسیح سپرا کے کانوں میں آزادی کے نعرے سنائی دیئے... زندگی کے احساس سے آزادی۔ ذائقوں سے آزادی۔ دیکھنے اور سننے سے آزادی۔ مسیح سپرا نے دیکھا، گل بانو اس کے قریب کھڑی ہے۔

'بھوک لگی ہے...'

'فکر نہ کرو۔ فریج میں کچھ نہ کچھ پڑا ہوگا۔'

'وہ لوگ جاگ سکتے ہیں۔'

'وہ نہیں جاگیں گے۔'

'وہ جاگ گئے تو...؟'

'وہ واپس ڈر کر بھاگ جائیں گے۔'

'ہاں وہ ڈر سکتے ہیں۔'

گل بانو نے فریج کھولی۔ ٹھیک اسی وقت نازیہ کسی کام سے باہر آئی۔ اس نے ایک سفید لباس میں ملبوس عورت کو دیکھا۔ نازیہ نے زور سے چیخ ماری۔ تب تک گل بانو اپنی جگہ سے غائب ہو چکی تھی۔ نازیہ کی آواز سن کر غلام ربانی، عرشیہ، شاذیہ، صبا اور عامر بھی بیدار ہو گئے۔

کیا ہوا؟ عرشیہ نے پوچھا…' بھوت… میں نے دیکھا ہے اور یہ آنکھوں کا وہم نہیں۔ یہاں فریج کے قریب…'

'آنکھوں کا دھوکہ' غلام ربانی نے آہستہ سے کہا۔'سوجاؤ۔ صبح دیکھتے ہیں۔'

'اس گھر میں بھوت ہیں۔ میں اور زیادہ دیر اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔'

'مجبوری ہے۔ صبح دیکھیں گے۔' غلام ربانی نے کہا ضرور، مگر انہیں بھی خوف کا احساس ہو رہا تھا۔

مسیح سپرا اپنی جگہ لیٹا رہا۔ اسے ان فضول کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

صبح ہوگئی تھی

اس رات باری باری سے سب نے بھوت دیکھا۔ عرشیہ نے، غلام ربانی نے، عامر، صبا اور شاذیہ نے۔ اب سب کو یقین آچکا تھا کہ اس گھر میں بھوت رہتے ہیں۔ عرشیہ نے بھوت کو سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ غلام ربانی باتھ روم کے لیے جاگے۔ تو بھوت دروازے پر کھڑا تھا۔ احمر نے بھوت کی پرچھائیں دیکھی تھی۔ اس رات ان چھ لوگوں میں سے کوئی بھی سو نہیں پایا…اور سپرا نے خیال کیا کہ مردہ لوگوں کے لیے دن اور رات سب برابر ہیں۔ سپرا کو حیرت تھی کہ آخر یہ لوگ کس بات سے خوفزدہ ہیں۔ اس رات اس نے ایک خرگوش کو بھاگتے ہوئے دیکھا تھا، جو مجسمہ کے پاس کھڑا تھا۔ پھر اس نے دیوار سے باہر چھلانگ لگا دیا۔ اس نے کچھ جنگلی جانوروں کو دیکھا، جو اس کے گھر کے آس پاس جمع تھے۔ اور اس کے گھر میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے سرسراتی چادروں کے درمیان بارش کی بوندوں کو دیکھا، جس کا رنگ سرخ تھا اور اس کے لیے قیاس لگانا مشکل نہیں تھا کہ جو خود کو زندہ سمجھ رہے ہیں وہ بہت جلد موت کی آغوش میں جانے



والے ہیں۔ اس نے غلام ربانی کی آواز سنی جو اپنی بیوی بچوں کے ساتھ جانے کے انتظار میں کھڑے تھے۔

'چلتا ہوں۔'

غلام ربانی نے بوجھل آواز میں کہا۔'زندہ لوگ موت کے تابوت میں نہیں رہ سکتے…'

مسیح سپرا خاموش رہا

غلام ربانی نے پھر کہا۔'کوشش کرو کہ تم بھی موت کے تابوت سے نکل آؤ۔'

مسیح سپرا اس بار بھی خاموش رہا۔

' بھیانک… بہت بھانک۔' غلام ربانی آہستہ سے بولے۔'ایک خوفناک رات، اندھیرے میں رہنے کا تجربہ اور بھوت۔ تم بھوتوں کے ساتھ رہتے ہو۔'

مسیح سپرا نے اس بار بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

'بجلی کا بل جمع کردو۔ کسی اچھے ڈاکٹر سے آنکھ کا علاج کراؤ اور یہ ظالم سفید پردے ہٹادو۔'

'جی۔' مسیح سپرا آہستہ سے بولا۔

'یہ بھیانک رات ہم میں سے کوئی نہیں بھولے گا۔ مگر تم کو یاد رکھنا چاہیے کہ تم زندہ ہو۔ اچھا ہم چلتے ہیں۔ خدا حافظ…'

'جی…'

مسیح سپرا نے ان لوگوں کو دروازے تک چھوڑا۔ دور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر دروازہ بند کردیا۔ اس نے گل بانو کی آواز سنی، جو قہقہہ لگا رہی تھی…

'بھوت…'

'اس میں غلط کیا ہے… ہم سب بھوت ہیں۔'

'تم ہو گے۔ میں نہیں ہوں۔'

'تم بھی ہو۔ اور خدا کے لیے، اگر بھوک لگی ہو تو کچھ کھا پی لو...'

'ظالموں نے سارا فریج خالی کر دیا۔'

'زندگی ہمیشہ سے ظالمانہ سلوک کرتی ہے۔'

'اب وہ نہیں آئیں گے۔'

'وہ اندھیرے اور تابوت سے ڈر گئے...اور اس مجسمہ سے...'

'میں نے اس سے دوستی کر لی ہے۔' گل بانو آہستہ سے بولی۔ پھر وہ زور سے ہنسی۔ سنا تم نے، میں نے موت سے دوستی کر لی ہے۔

مسیح سپرا خاموش لیٹا رہا۔ مہمان جا چکے تھے۔ لیکن اس نے باہر جو کچھ بھی دیکھا، سنا، اس کی یادیں تازہ تھیں۔

اس نے خود کو پھر یاد دلایا۔ وہ مردہ گھر میں ہے——اور وہ مر چکا ہے اور چونکہ وہ مر چکا ہے، اس لیے احساس و جذبات سے اس کا رشتہ منقطع ہو چکا ہے۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔



## (7)

گل بانو کو گھر کی یاد ستا رہی تھی۔ اماں نور جہاں سے زیادہ اس کو نظیرے کی فکر تھی۔ وہ فون تو کرنا چاہتی تھی مگر خوف اس بات کا تھا کہ اگر وہ باہر سے بھی فون کرتی ہے تو پولیس والے اس کا فون ٹریس کر سکتے ہیں... اور اس جگہ پہنچ سکتے ہیں۔ وہ جب تک اس مردہ خانہ میں ہے، وہ محفوظ ہے...مگر ایک بڑا سوال اور تھا کہ وہ کب تک اس طرح اس مردہ خانے میں رہ سکتی ہے۔ اس قید خانے اور اندھیرے میں جہاں حنوط شدہ لاش کی طرح ایک ممی زمین پر لیٹی ہے اور کبھی کبھی اس سے بات کر لیتی ہے۔ لیکن اسے یہ بھی احساس تھا کہ باہر جانے کے بعد پکڑی گئی تو ساری زندگی اسے جیل کی سلاخوں میں گزارنا ہوگا جو یہاں کی بہ نسبت زیادہ اذیت ناک ہے۔ اسے غصہ آ رہا تھا۔ اسے بجلی سوئچ آف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ موبائل رکھنے کی اجازت کیوں نہیں ہے۔ وہ خود کو ایک بڑی دنیا سے لاتعلق محسوس کر رہی تھی۔ اچانک اس نے دیکھا، حنوط شدہ ممی نے انگڑائی لی اور اٹھ بیٹھا۔
اس کی پیشانی پر شکن تھی۔

'باہر سب کچھ اچھا نہیں ہے...'

'کیوں...'

’آزادی...‘وہ کہتے کہتے رُک گیا۔
تمہیں آزادی سے کیا مطلب۔تم تو مرے ہوئے ہو۔
’ہاں‘ اس نے بہت تکلیف سے کہا...کاش پوری طرح سے مرسکتا۔گولیاں چلی تھیں... میں نے بہتے ہوئے خون کے ساتھ مردہ جسموں کو چلتے ہوئے دیکھا تھا...
’کیوں سوچ رہے ہو یہ سب....‘
’پتہ نہیں۔گولیاں ہوا میں رُک گئیں تھیں...اور ۷ جنوری...‘
’۷ جنوری کیا ؟‘
’تم نے قتل کب کیا تھا ؟‘
’ ۶ جنوری کی رات۔لیکن کیوں پوچھ رہے ہو؟‘
’۷ جنوری کا دن دیوتاؤں نے غائب کردیا‘
’کیا ؟‘ وہ زور سے چلائی۔’غائب کردیا؟ ایسا کیسے ہوسکتا ہے...دن غائب کیسے ہوسکتا ہے؟‘
’جیسے وہ انسانوں کو غائب کررہے ہیں...‘ مسیح سپرا نے اذیت سے کہا۔’تم نے ۷ جنوری کو قتل کیا ہوتا تو تم بچ سکتی تھی۔‘
’مگر دن کیسے غائب ہوسکتا ہے؟‘ گل بانو زور سے چلائی۔
’ان کے پاس طاقت ہے۔ وہ کچھ بھی غائب کرسکتے ہیں۔تمہیں بھی۔ اور تمہیں اس لیے کیونکہ تم نے قتل کیا ہے۔ان کے پاس مہرے ہیں جس سے وہ کام لیتے ہیں۔‘
’پولیس؟‘
’ہاں۔ پولیس اور فوج...اور عدالتیں...‘ مسیح سپرا کا لہجہ سرد تھا۔



’فوج....؟‘
’ہاں۔فوج کے سربراہ اب ہمسایہ ملک کی طرح سیاست پر بولنے لگے ہیں اور عدالتیں ان کی نگرانی میں ہیں۔‘
’پھر کیا ہوگا ؟‘
’مردہ گھر۔ جہاں ہم اس وقت ہیں...اور چین سے ہیں۔‘
’نہیں۔تم ڈرا رہے ہو۔‘
’نہیں۔ کچھ بُرا ہورہا ہے۔ بہت بُرا۔ میں نے کچھ اور بھی دیکھا تھا۔اب یاد نہیں آرہا۔مگر...سرخ آندھی تھی اور سارے مل کر سڑکوں پر دوڑ رہے تھے۔ دوکانیں بند تھیں اور کچھ کے ہاتھوں میں کاغذات تھے...اور الاؤ میں کاغذات جل رہے تھے...اور پولیس وین کھڑی تھی۔ بڑی تعداد میں....‘
’کیا میں باہر جاسکتی ہوں؟‘ گل بانو نے آہستہ سے پوچھا۔
’مگر...‘
’اسی لباس میں۔بھوتوں کے درمیان ایک اور بھوت۔‘
تم شناخت کرلی جاؤ گی۔ یقیناً تمہیں تلاش کیا جارہا ہوگا۔
باہر کے دروازے پر دستک پڑی۔مسیح سپرا نے چونک کر گل بانو کو دیکھا۔گل بانو بغیر تاخیر کیے اندر کے کمرے میں چلی گئی۔ دستک بڑھ گئی تھی۔ مسیح سپرا اٹھا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے تک گیا اور دروازہ کھول دیا۔سامنے وہی پولیس والا تھا اور اس کے ساتھ ایک پولیس کانسٹبل بھی تھا۔
پولیس والا غصے سے بولا۔’سامنے والے گیٹ میں تالہ لگادیا؟‘
’ہاں۔تم نے منع کیا تھا‘
’ہاں۔ میں نے منع کیا۔مگر میں نے اس بیہودہ نیم پلیٹ کے لیے...‘

'مردہ خانہ'

'ہاں مردہ خانہ۔ زندوں کے درمیان مردہ خانہ نہیں ہوسکتا'

پولیس والے نے لاٹھی گھمائی۔ ہم ایک لڑکی کو تلاش کررہے ہیں۔تم نے تو نہیں چھپایا'

'ہاں چھپایا ہے' مسیح سپرا آہستہ سے بولا۔

'کیا؟ اس نے قتل کیا ہے۔کہاں چھپایا ہے؟'

پولیس والا کانسٹبل کے ساتھ دھڑ دھڑاتے ہوئے اندر آ گیا...اس کی آنکھیں خوفزدہ تھیں۔ چاروں طرف سفید سرسراتے پردے...اور ان پردوں کے درمیان اندھیرا۔

وہ زور سے چیخا... یہ سب کیا ہے؟

'مردہ خانہ'

'کیوں؟'

'کیونکہ میں مردہ ہوں'

پولیس والے نے کانسٹبل کو دیکھا جو بری طرح کانپ رہا تھا۔

'اور وہ لڑکی کہاں ہے؟ تم نے کہا، چھپایا ہے...'

سپرا نے موت کے فرشتہ کی طرف اشارہ کیا۔مجسمہ والی عورت پولیس والے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

'یہ...؟'

'موت کا فرشتہ۔مگر یہ عورت ہے'

'تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ یہ عورت نہیں۔ زندہ عورت۔ بلکہ لڑکی۔ اس نے ایک قتل کیا ہے...اور پولیس اسے تلاش رہی ہے'



کانسٹبل اب بھی کانپ رہا تھا۔ یہاں سے چلو۔ یہ بھوت بنگلہ ہے۔

مسیح سپرا نے آہستہ سے پوچھا 'کیا بھوتوں کی طرح رہنا جرم ہے۔؟'

'یہ آقا سے پوچھنا ہوگا'

'کیوں؟'

'کھانے، پینے، رہن، سہن پر آقا کا ہی فرمان سننا پڑتا ہے'

'لیکن فرمان تو زندوں کے لیے ہوتا ہے'

'ہاں اور تم....؟'

پولیس والا پیچھے ہٹا۔ کچھ کہا نہیں اور تیزی سے کانسٹبل کے ساتھ باہر نکل گیا۔

مسیح سپرا نے دروازہ بند کیا۔ سفید چادریں اب بھی سرسرا رہی تھیں۔ مجسمہ کے قریب گل بانو کھڑی تھی۔

'پولیس تمہاری تلاش میں ہے'

'ہاں۔میں نے سنا'

'ممکن ہے، وہ دوبارہ آجائیں'

'ہاں'

'تم باہر جاؤ گی تو پکڑی جاسکتی ہو'

'پھر کیا کروں؟'

'تمہاری جگہ مجھے نکلنا ہوگا'

گل بانو کو احساس ہوا، مجسمہ والی عورت کے اندر ہلچل مچی ہو۔ اس نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا ہو۔ بلکہ وہ دو قدم چلی اور دوبارہ واپس اپنی جگہ آ گئی۔ اس کی آواز سرد تھی

'تم نے دیکھا...؟'

'ہاں لیکن خاموش رہو۔ میں روز دیکھتا ہوں۔'

'مطلب...'

'وہ ہماری طرف بڑھ رہی ہے۔'

'اور تمہارے لیے یہ نئی بات نہیں؟'

مسیح سپرا نے آہستہ سے کہا۔ 'دیوتاؤں کے ذریعے جنوری کو غائب کرنا نئی بات ہے۔ اب بہت کچھ نیا ہو رہا ہے...اور ضروری ہے کہ کان نہ دھرو۔ مردوں کی طرح تماشہ دیکھو۔'

'یہ تماشہ تم دیکھ سکتے ہو۔ میں نہیں۔ میں ابھی جوان ہوں...'

گل بانو شرارت سے بولی۔ مسیح سپرا نے محسوس کیا کہ ایک بجلی کوندی اور سیدھے اس کے جسم کے پار ہوگئی۔

اسی وقت باہر ایک ساتھ بندوق کی کئی گولیاں دغنے کی آواز آئی۔ بہت سے لوگ چلاتے اور بھاگتے ہوئے نظر آئے۔ کچھ لوگ چیخ رہے تھے مگر ان کی آوازیں اندر صاف سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ گل بانو آگے بڑھی۔ کھڑکی کے پاس کا پردہ ذرا سا سرکایا تو اسے پولیس کا ایک ہجوم نظر آیا اور بہت سے لوگ دوڑتے ہوئے نظر آئے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ مرد بھی۔ بزرگ بھی تھے۔ نوجوان بھی۔

'یہ سب کیا ہو رہا ہے۔'

'پتہ نہیں۔'

'معلوم تو کرو...'

'کس سے معلوم کروں....'

'گھر سے باہر نکلو۔ مردے کیا باہر نہیں جاتے؟ قبروں سے نکلتے ہیں اور انسانوں کو ڈراتے ہیں۔ گھروں میں آجاتے ہیں بدروح بن کر۔ سڑکوں پر بھیڑ میں



شامل ہوتے ہیں۔ تم بھی بھیڑ میں شامل ہوجاؤ۔ تم ویسے بھی بھوت لگ رہے ہو اور تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔'

مسیح سپرا کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ کچھ نیا ہوا ہے۔ اور اسے معلوم کرنا چاہیے کہ تماشہ کیا ہے۔

'ٹھیک ہے...'

وہ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر پیچھے والا دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ جس وقت باہر نکلا، اس وقت بھی تیز آندھی ہوئی تھی۔ درخت ڈول رہے تھے۔ پولیس عوام کو دوڑنے بھاگنے اور گھروں سے باہر نکلنے کے لیے منع کر رہی تھی۔ سڑک سے کچھ فاصلے پر ایک دیوار تھی اس نے اس دیوار کو دیوار گریہ کا نام دیا تھا۔ اس دیوار پر ہمیشہ ایسے پوسٹر نظر آتے، جن کو پڑھنے کے بعد اداسی چھاجاتی تھی۔ دیوار پر ایک اسکرین لگا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جادوگر آئے گا۔ جادوگر جس کے بارے میں وہ پہلے بھی سن چکا تھا۔ جادوگر، جس کے کارناموں کے بارے میں وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا، پڑھ چکا تھا۔ جو بولتا تھا، تو اس کے منہ سے خون کی دھاریں پھوٹتی تھیں۔ جو چیختا تھا تو آس پاس کے پیڑ پودے جل جاتے تھے۔ کیونکہ اس کے منہ سے زہریلی گیس نکلتی تھی۔ کچھ لوگ دیوار کی اسکرین کے پاس کھڑے تھے۔ پولیس والے رائفل لے کر گشت کر رہے تھے۔ اس نے دیوار کی اسکرین پر دیکھا اور چونک گیا۔ جادوگر کی جگہ ایک دیوہیکل سانپ تھا اور اس سانپ کے دو منہ تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے دیوہیکل سانپ اچانک اسکرین سے نکل آئے گا اور جو بھی سامنے نظر آئے گا، اسے کھائے گا۔

'دو منہ والا سانپ۔' عورتیں چیخ رہی تھیں۔ جادوگر سانپ میں تبدیل ہوگیا ہے۔'

'کیا یہ حقیقت ہے؟ یا خواب.... یا سب نیند میں ہیں۔'

ایک بزرگ نے مسیح سپرا کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے گیروا کپڑے پہن رکھے تھے۔ پیشانی پر بڑا سا ٹیکہ تھا۔ داڑھی تھی۔ وہ آہستہ سے بولا۔ یہ حقیقت ہے۔ دومنہا سانپ.... یہ ہوتا تھا۔ پہلے دو تھے۔ دومل کر ایک ہوگئے۔ اور سانپ بن گئے۔ وہ دیکھو....'

'کیا ان سے خطرہ ہے....'

'بہت بڑا خطرہ....میں نے ان سانپوں کے بارے میں پڑھا ہے۔ کچھ برس قبل تھائی لینڈ میں بھی یہ سانپ نظر آیا تھا۔ فائر بریگیڈ کی ۱۵ گاڑیاں بھی سانپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں... اجگر...اژدہا...شیش ناگ.... میں نے ہر طرح کے سانپ دیکھے ہیں۔ افریقہ کے گھنے جنگلوں میں رہا ہوں،' بزرگ توقف کے بعد بولے۔ اچھّا دھاری ناگ کے بارے میں سنا ہے۔ ہندوستانی اساطیری لوک کہانیوں میں اس کا ذکر ہے۔ یہ مخلوق اصل میں زہریلے کوبرا کی ایک نسل ہے جو زندگی کے سو برس مکمل ہونے کے بعد کسی بھی دوسری مخلوق کی صورت اختیار کرسکتی ہے۔ جو کوبرا سوسال زندہ رہ جائے اس کو روپ بدلنے کے لیے روحانی طاقتیں مل جاتی ہیں۔'

بزرگ نے مسیح سپرا کی طرف دیکھا۔ پھر بولے۔ ۱۹۲۵ تک اس دومنہا سانپ کو روحانی طاقت نہیں ملی تھی۔ مگر اب۔ سرخ آندھی دیکھو۔ ہوا میں اڑتے دستاویز دیکھو۔ پہلے جادوگر آیا اور اب یہ دومنہ کا سانپ....'

'یہ لوگ سانپ کی باتیں کیوں نہیں سن رہے؟'

'سن رہے تھے۔ مگر سانپ کے منہ سے نکلنے والا زہر اسکرین سے باہر آرہا ہے۔

وہ دیکھو۔ اسکرین کے سامنے لاشیں بچھی ہیں اور میں کہتا ہوں، ابھی یہاں



رُکنے کی ضرورت نہیں۔ تم بھی خاصہ بھوت معلوم ہو رہے ہو۔ گھر جاؤ۔

پولیس مسلسل فائرنگ کررہی تھی۔ مسیح سپرا کے لیے رُکنا اب مناسب نہیں تھا۔ وہ پلٹا اور گھر کے دروازے پر پہنچ کر رُک گیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ وہ اندر داخل ہوگیا۔ گل بانو اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔

'کچھ پتہ چلا...؟'

'نادیدہ طاقتیں...' سپرا کہتے کہتے رُک گیا۔ 'ہمیں اب سانپوں کے بارے میں جاننا چاہیے۔'

'سانپ....'

'ہاں، سانپ....اجگر، شیش ناگ، گاڈزیلا...جنگلوں، صحراؤں، سمندروں میں رہنے والے سانپ...اب تو سانپ شیشے کے مرتبانوں میں بھی رکھنے کا رواج ہے۔ مریض کے جسم پر رینگتے ہوئے سانپوں کو چھوڑ کر ان کا علاج کیا جاتا ہے۔ سانپ...ہم سانپ سے قریب ہوگئے...'

مسیح سپرا اسی انداز میں کھڑا رہا۔ پھر چلتا ہوا مجسمہ کے پاس آکر ٹھہر گیا۔ 'قدیم مصری تہذیب میں سانپ طاقت کی علامت تھا۔ فراعین اپنے تاجوں میں سانپ کی شکلیں بنواتے تھے۔ زبور وانجیل کی روایت میں سانپ ہی تھا، جس نے آدم وحوا کو ممنوعہ درخت کی جانب مائل کیا تھا۔ حضرت موسیٰ کا عصا بھی سانپ میں تبدیل ہوجاتا تھا۔'

مسیح سپرا نے مجسمہ کی طرف دیکھا۔ تم نے ضحاک کا نام سنا ہے؟

'نہیں۔'

'ایرانی بادشاہت کے اوائل میں ایک بادشاہ ضحاک تھا۔ اس کے کندھے پر ہر وقت دو پالتو سانپ ہوا کرتے تھے۔ یہ سانپ انسانی مغز کھاتے تھے۔ ان سانپوں

کے لیے روزانہ کئی انسانوں کی قربانی دی جاتی تھی۔ وہیں دارالخلافہ میں کاوہ نامی ایک آہن گر تھا۔اس کے دو بیٹے تھے۔ایک بیٹا سانپ کی خوراک بن چکا تھا جب دوسرے بیٹے کی باری آئی تو کاوہ نے ضحاک پر حملہ کر دیا اور ضحاک مارا گیا۔ضحاک کے کندھے پر دو سانپ تھے...'

'تو...؟'

'یہاں بھی دو سانپ....جادوگر کی شکل بدل گئی۔عوام سانپ سے خوفزدہ ہیں۔'

گل بانو نے عجیب نظروں سے مسیح سپرا کی طرف دیکھا۔ایسا کیسے ممکن ہے؟'

'سب کچھ تمہارے سامنے ہے۔اچھا دھاری، ضحاک، کوبرا...اور انسان... مرتبانوں میں سانپ۔ سانپ مرتبان سے باہر آگئے۔ اب اس زمین پر صرف سانپ ہوں گے...چاروں طرف سانپ...چھوٹے بڑے سانپ...'

'تمہیں یہ سب عجیب نہیں لگتا؟' گل بانو نے پوچھا۔

'بالکل بھی نہیں۔ ہماری اسی دنیا میں جوراسک پارک ہیں۔ ڈائنا سور ہیں... اور بندر....اور سانپ....اور گلہری....'

'اور بھوکے مرتے ہوئے انسان...' گل بانو آہستہ سے بولی۔

دوسرے دن صبح مسیح سپرا کو آئینہ کی یاد آئی، تو خیال آیا، ایک دراز قد آئینہ تھا، جس کو وہ کافی عرصہ پہلے توڑ چکا ہے۔یعنی اس دن جب اس نے خود کو پہلی بار مردہ خیال کیا تھا۔ وہ اپنا عکس دیکھنا چاہتا تھا...اور اسے یقین تھا کہ اس کی داڑھی کافی حد تک بڑھ گئی ہے۔ اس نے مہینوں سے شیو نہیں کیا ہے۔اس کے بال سفید ہونے لگے تھے۔ اور اسے یقین ہے، اس حلیہ میں وہ پورا جانور لگ رہا ہوگا۔اس کے جسم



پر سفید کرتا ہے اور نیچے اس نے تہہ بند باندھ رکھا ہے۔ پاؤں میں چمڑے کی چپل ہے...اور اگر آئینہ ہوتا تو وہ خود کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا ہوتا۔

دوسرے دن سب سے پہلے وہ بینک گیا، پیسے ختم ہو گئے تھے۔کیشئر نے بتایا کہ وہ پیسے نہیں نکال سکتا۔ پیسے نکالنے کے لیے اسے ایک فارم بھرنا ہے۔ فارم پر اسے پوری تفصیل، موبائل نمبر اور مذہب کے بارے میں لکھنا ہے۔کیشئر نے یہ بھی بتایا کہ فارم بھرنے کے بعد بھی حکومت چاہے تو اپنے مفاد میں اس کے پیسے کو خرچ کر سکتی ہے۔اس وقت بینک میں فارم بھرنے والوں کی لمبی قطار تھی۔ وہ اس قطار میں شامل ہو گیا۔ تین گھنٹے بعد اس کا نمبر آیا۔اس نے فارم بھرا۔ مذہب کے بارے میں کافی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے اسلام لکھ دیا۔جبکہ ساری زندگی وہ نماز روزہ سے الگ رہا تھا۔اس نے فارم کھڑکی کی طرف بڑھایا اور اسے دو روز بعد آنے کے لیے کہا گیا۔ بینک میں کچھ لوگ شور کر رہے تھے کہ فارم نہیں بھریں گے۔ منیجر ان کو بتا رہا تھا کہ پھر آپ پیسہ نہیں نکال سکیں گے۔کیونکہ اب نیا قانون آچکا ہے۔ وہ بینک سے باہر نکلا تو سڑک پر غریبوں کا جلوس نکلا ہوا تھا۔ ہزار سے کم لوگ نہیں تھے۔ان کی رہنمائی کمیونسٹ پارٹی کے لوگ کر رہے تھے۔ان کی ہاتھوں میں مختلف قسم کے بینر تھے۔ بھوکا ہندوستان، مرتا ہوا انسان، ہم ننگے ہیں، ہمارے پاس گھر نہیں، ہمارے پاس کاغذات نہیں، مگر ہم اسی ملک کے باشندے ہیں۔ہمیں ہمارا حق دو۔

یہ گونگے بہروں کا جلوس تھا جو اس وقت شاہراہ سے گزر رہا تھا...اور پولیس والے تھے جو انہیں ڈنڈے سے مارتے ہوئے آگے کر رہے تھے۔مسیح سپرا نے ان لوگوں کو غور سے دیکھا تو یہ تمام لوگ اسے مردہ نظر آئے۔ یہاں سے وہ چار قدم آگے بڑھا تو قبرستان نظر آیا۔ وہ اکثر قبرستان سے ہو کر گزرتا تھا اور یہاں خاموشی

چھائی رہتی تھی۔لیکن اس وقت قبرستان میں بڑی تعداد میں لوگ تھے اور یہ تمام لوگ پرانی قبروں کی کھدائی کر رہے تھے۔مسیح سپرا کو تعجب ہوا۔ اس نے ایک شخص سے دریافت کیا، کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔جس سے دریافت کیا وہ ایک نوجوان تھا اس کے کپڑوں میں مٹی لگی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک کدال تھا، جس سے وہ زمین کھود رہا تھا۔اس نوجوان نے تعجب سے مسیح سپرا کو دیکھا۔

'تمہیں معلوم نہیں۔؟

'نہیں۔'

'اس ملک میں باہر سے آئے ہو۔'

'قطعی نہیں۔'

'پھر بھی تمہیں کچھ نہیں معلوم۔'

'مجھے کچھ نہیں معلوم۔'

وہ نوجوان ہنسا۔ پھر اس نے بتایا۔ باپ داداؤں کی قبریں کھودی جا رہی ہیں۔ اس وقت سارا ملک یہی کر رہا ہے۔'

'مگر کیوں؟'

'ہمارے باپ دادا اپنے کاغذات لے کر دفن ہوئے۔ہمیں بتایا بھی نہیں۔'

'کیسے کاغذات؟'

'کہ وہ اس ملک میں کیسے آئے؟ کہاں سے آئے، ان کی برتھ سرٹی فکیٹ، ان کا شناختی کارڈ، گھر کے دستاویز....'

'کیا یہ قبر میں مل جائیں گے؟'

'کیوں نہیں ملیں گے۔ یہاں نہیں ملیں گے تو کہاں ملیں گے۔'

'کیا مردے زندہ ہو جائیں گے؟'



'ہاں ہونا پڑے گا۔' نوجوان زمین کھودنے میں مصروف ہو گیا۔

'قبر کی سڑی گلی ہڈیوں اور شمشان کی راکھ میں کیا دستاویز ہوں گے۔؟'

'پتہ نہیں۔مگر تلاش تو کرنا ہوگا۔' نوجوان اسی طرح مصروف رہا۔

'شمشان کی راکھ تو ندی نالوں میں بہادی جاتی ہے۔'

' پھر ندی نالوں میں تلاش کرنا۔مگر تلاش تو کرنا ہوگا کیونکہ یہ حکم ہے۔'

'ہاں حکم ہے۔' مسیح سپرا کو احساس تھا، ان دستاویزوں کی ضرورت مردوں کو نہیں ہوگی۔ ابھی وہ دو قدم چلا ہوگا کہ اچانک آسمان زرد ہو گیا۔ سرخ بادل آسمان پر چلتے ہوئے دکھائی دیئے...اور یہ اس کا وہم نہیں کہ آسمان سے آہستہ آہستہ زمین پر اترتے ہوئے اسے وہی سانپ نظر آیا، جس کے دو منہ تھے۔قوی ہیکل سانپ۔ چلتے ہوئے لوگ اپنی جگہ ٹھہر گئے۔

ایک نے کہا۔ وہ ہے اور ہمیں دیکھ رہا۔

دوسرے نے کہا۔ وہ ہم سب پر نظر رکھتا ہے۔

ایک بزرگ آہستہ سے بولا۔ یہ آفت اسی ملک میں آنی تھی۔

دو منہ والا سانپ لہرایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ گم ہو گیا۔مسیح سپرا نے آوازیں سنیں۔لوگ کہہ رہے تھے۔ جلدی بھاگو....فضا زہر آلودہ ہو گئی ہے۔سانپ نے اپنا زہر چھوڑ دیا ہے....اس نے کچھ لوگوں کو گرتے ہوئے اور بے ہوش ہوتے ہوئے دیکھا۔ یقیناً یہ لوگ سانپ کے زہر کی زد میں آ گئے تھے۔

'ضحاک۔'

سپرا نے دیکھا، ایک درویش تھا جو زور زور سے کہہ رہا تھا۔ضحاک پھر سے زندہ ہو گیا۔ یہ وہی درویش تھا، جس کو اس نے پہلے بھی دیکھا تھا۔

'ضحاک؟' ایک نوجوان نے اس سے پوچھا... یہ کون ہے...؟

'وہ بارودوں میں آگ بوتا ہے...وہ دھرتی پر قہر ڈھاتا ہے۔وہ سمندروں اور آتش فشاں اور آندھی طوفانوں کی تجارت کرتا ہے...اور وہ دیکھنے میں اژدہے جیسا ہے...اور وہ آچکا ہے...اور ہمارے درمیان ہے۔'

'کیا ہماری کھیتیاں جل جائیں گی؟'

'ہاں۔؟

'اور ہمارے کسان؟'

'وہ ہلاک کردیئے جائیں گے۔'

'اور ہماری عورتیں؟'

'وہ آگ سے جھمیں گی اور فولاد ہوجائیں گی۔'

'اور ہمارے نوجوان؟'

'وہ کمزور ہوں گے۔اور مقابلہ نہیں کرسکیں گے۔'

'اور بزرگ؟'

'ان کی زندگی غیر یقینی ہے۔مگر....وہ شفقت رکھیں گے اور نگہبانی کریں گے۔'

سپرا زہریلی آندھیوں سے بچتا بچاتا گھر آیا تو اس کو عجیب عجیب خیالات نے گھیر رکھا تھا۔اس درمیان آندھیوں کے شر سے خود کو محفوظ رکھتے ہوئے اس نے گل بانو کے لیے شاپنگ کرلی تھی اور گھر کے لیے بھی کچھ سامان خرید لیے تھے۔مگر اس کو یہ خیال کھائے جارہا تھا کہ بار بار گھر سے باہر نکلنا اس کے مردہ ہونے کے احساس میں رکاوٹ ہے۔ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خوش ذائقی سے خود کو محروم کرلے۔ کیونکہ وہ مردہ ہے اور کسی بھی طرح کے احساس سے اسے باہر ہونا چاہیے۔اس نے تصور کیا کہ اس نے کھانے پینے کا ارادہ موقوف کردیا ہے۔اس



نے سوچا کہ باہر جو لوگ ہیں، وہ بھی مردہ خانوں کی طرف ڈھکیلے جارہے ہیں... ضحاک لوگوں پر قابض کہ اس نے سب کے لیے موت خرید رکھی ہے۔گھر آنے کے بعد اس نے گل بانو کو بتایا کہ باہر ایک سمندر ہے اور سمندر پر کاغذات تیر رہے ہیں۔آگ کا جنگل ہے اور دستاویز سلگ رہے ہیں۔ایک آندھی ہے، جس میں زہر ہی زہر ہے اور یہ زہر ضحاک کے ہونٹوں سے نکل کر فضا میں پھیل رہا ہے۔سپرا نے بتایا کہ باہر حشر کا میدان ہے اور اس نے زندگی کہیں نہیں دیکھی۔ تاہم اسے اطمینان ہے کہ بہت جلد جو لوگ باہر رہ گئے ہیں، وہ بھی اس مردہ خانے کا حصہ ہوں گے۔اس نے گھر آنے کے بعد اعلان کیا۔

'وہ بہت جلد کھانا پینا بھی بند کرنے والا ہے۔کھانا پینا مردوں کے طور طریقے میں شامل نہیں۔ہوسکتا ہے، اس میں کچھ وقت لگ جائے۔'

اس نے گل بانو کا جواب نہیں سنا۔ مجسمے والی عورت اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہوا نہ ہونے کے باوجود بھی سفید چادریں سرسرا رہی تھیں۔ اس نے سفید دھندلی خاموشی کا جائزہ لیا اور زمین پر لیٹ گیا۔

(8)

# بلیک آؤٹ میں زندگی

گل بانو نے ہنسنا چاہا لیکن اسے احساس ہوا کہ اس کی ہنسی اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئی ہے۔اس نے باتیں کرنا چاہا تو مجسمے والی عورت کے سوا گھر میں کوئی نہیں تھا۔ایک لاش تھی جو زمین پر پڑی ہوئی تھی۔اسے پتہ بھی نہیں تھا کہ اس مردہ خانے میں آئے ہوئے اسے کتنے دن یا مہینے گزر چکے ہیں۔اس نے سرسراتی چادروں پر، انگلیوں سے لکھنا شروع کیا، بلیک آؤٹ میں زندگی کیسی ہوتی ہے....

میں گھنے اندھیرے میں ہوں اور سرسراتی چادروں میں زندگی تلاش کر رہی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اماں نور جہاں پر کیا گزری اور نظیرے کس حال میں ہے۔ باہر ضحاک ہے اور اس مردہ خانے میں دو خوفزدہ لوگ بلکہ مردہ لوگ....مجھے خبر نہیں کہ پولیس میری تلاش میں ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو وہ اب تک مردہ خانہ کیوں نہیں پہنچی۔ مجھے یقین ہے کہ پولیس زندہ جگہوں پر ہی ملتی ہے اور پولیس بھی مردہ خانوں میں جانے سے گریز کرتی ہے۔سرسراتی چادروں پر کوئی کلینڈر نہیں ہے۔ میں ان چادروں سے روز اپنا دن برامد کرتی ہوں اور چادروں کی سیاہی سے رات بنالیتی



ہوں۔

لکھتے لکھتے گل بانو نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھیں نم ہیں۔ اس نے اپنی آنکھوں کو خشک کیا۔مچلتی ہوئی مجسمہ کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ پاؤں کی ٹھوکر سے اس نے سپرا کو جگانے کی کوشش کی۔

سپرا نے آنکھیں کھولیں۔'کیا ہے؟

'میں باہر جانا چاہتی ہوں۔'

'تو کس نے روکا ہے۔ جاؤ۔مگر مردہ خانہ کے دروازے بند ہوجائیں گے۔'

'میں واپس آنا چاہوں تو....؟'

'نہیں۔'

'تم کو احساس ہے کہ تم زندہ ہو؟' گل بانو چیخ کر بولی

'نہیں۔' سپرا کا لہجہ سرد تھا۔ بالکل بھی نہیں۔

'ابھی تم نے بتایا، باہر ضحاک ہے۔'

'اس کے شانہ پر دو سانپ...'

'کیا پہلے تخت پر انسان تھے؟'

'ہاں۔ ہماری اور تمہاری طرح....'

گل بانو کی آواز الجھی ہوئی تھی۔'پھر ابلیس کہاں سے آگئے؟'

'ابلیس ہمارے درمیان رہتے ہیں...اور انہوں نے ہی ضحاک کے سانپوں کو جگایا ہے۔'

'اور وہ لوگ جو احتجاج کر رہے ہیں....؟'

'ان کے شور سانپوں تک پہنچنے سے محروم ہیں۔'

گل بانو چیخ کر بولی۔'مجھے باہر جانا ہے اور مجھے فون بھی کرنا ہے....'

گل بانو کچن میں آئی۔ تلاش کرنے کے بعد اسے ہلدی کا پاؤڈر نظر آیا۔اس نے ہلدی کے پاؤڈر سے لیپ بنایا اور لیپ ماتھے پر لگا لیا۔ٹھیک اسی طرح جیسے سادھوں اور سادھویاں لگاتی ہیں۔اس نے چہرے کو سفید آنچل سے چھپایا۔ وہ یہ دیکھنے کے لیے ٹھہری نہیں کہ سپرا اسے دیکھ رہا ہے یا نہیں۔اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔ سڑک اس وقت سنسان تھی۔ اچانک بادلوں کے درمیان سے اس نے ضحاک کو دیکھا۔ پہلے وہ چھوٹے سے غبارے کی طرح نظر آیا۔ پھر اس کا قد طویل ہوتا گیا۔دونوں سانپ نمایاں تھے۔ اور فضا میں زہر چھوڑ رہے تھے۔ پھر یکا یک یہ سانپ غائب ہوگئے۔اس نے سڑک پر ہلچل دیکھی۔ کچھ لوگ تھے جو سر پر پاؤں رکھے بھاگ رہے تھے۔ وہ چلتی ہوئی ایک طرف کھڑی ہوگئی۔ سامنے ایک اسٹور تھا۔اسے یقین تھا کہ یہاں فون کی سہولت ضرور ہوگی۔ دکان پر ایک بوڑھا آدمی تھا اور اس وقت اکیلا تھا۔گل بانو نے بتایا کہ اس کو فون کرنا ہے۔ بوڑھے نے اندر آ کر فون کرنے کی اجازت دے دی۔ بوڑھا بڑ بڑا رہا تھا۔ دستاویز بہہ گئے۔اس کے بچے بھی بہہ گئے۔ بوڑھے نے پلٹ کر گل بانو کی طرف دیکھا۔ بوڑھے کا چہرہ سرد تھا۔گل بانو نے نمبر ڈائل کیا۔دو...تین...چار...اس کو نظیرے کی آواز سنائی پڑی...کون...

’گل بانو...‘ گل بانو نے آہستہ سے کہا۔

وہ دیر تک نظیرے سے بات کرتی رہی۔ نظیرے نے بتایا کہ تین مہینے تک وہ جیل میں رہا۔نور جہاں کو بھی پولیس نے حراست میں لے لیا تھا۔تین ماہ بعد وہ جیل سے چھوٹا ہے۔نور جہاں کو ایک ماہ قبل ہی بیل مل گئی تھی۔مگر پولیس اس کی تلاش میں ہے...اور پولیس نور جہاں اور اس پر بھی نظر رکھے ہوئی ہے۔اس نے جلدی میں اپنا پتہ بتایا اور نظیرے سے کہا کہ وہ رات کے وقت اس سے ملے۔ اس کے



بعد اس نے فون کاٹ دیا۔ بزرگ کو اس نے پیسہ دینے کی کوشش کی مگر ایک فون کے لیے بوڑھے نے پیسہ لینے سے انکار کر دیا۔

گھر آتے ہی گل بانو نے محسوس کیا، کچھ گھروں سے دھوئیں اٹھ رہے تھے۔ ممکن ہے وہاں چمنیاں ہوں اور دھواں چمنیوں کے راستے باہر نکل رہا ہو۔اس لیے کہ اگر آگ لگتی تو اسے شعلے بھی نظر آتے۔ کچھ گھروں کی کھڑکیاں کھلی تھیں مگر ان گھروں میں اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ واپس مردہ خانہ لوٹ آئی۔ دروازہ کھلا تھا، جیسا کہ وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ گل بانو نے دروازہ بند کیا اور دوبارہ سپرا کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔

’نظیرے رات میں کسی وقت آئے گا۔‘

مسیح سپرا اٹھ کر بیٹھ گیا...اس کی آواز میں غصہ تھا۔’مگر کیوں آئے گا؟‘

’میں نے بلایا ہے۔‘

’وہی تو پوچھ رہا ہوں، تم نے کیوں بلایا ہے؟‘

’ملنے کے لیے۔‘

’مگر ملنے کے لیے کیوں؟‘ سپرا اس بار زور سے چیخا۔’تم نے پہلے ہی مردہ خانہ کی خاموشی کو ختم کر دیا ہے۔‘

’اگر میں نے ختم کیا تو تم چیخ کیوں رہے ہو۔؟‘

’میں کسی اور کو اجازت نہیں دے سکتا۔‘

’کیوں؟‘

’کیونکہ یہ مردہ خانہ ہے۔‘

’مردہ خانے میں مردے تو آ سکتے ہیں۔؟‘

’نظیرے کوئی مردہ نہیں ہے۔‘ سپرا آہستہ سے بولا۔’تم نے اس کے بارے

میں بتایا تھا۔'

'وہ مردہ ہے۔اس کی خاصیت یہ ہے کہ وہ پڑھا لکھا مردہ ہے۔'

'لیکن وہ نہیں آ سکتا۔'

گل بانو ہنسی۔ آگے بڑھی۔ اس بار اس نے سپرا کے ٹھنڈے ہاتھوں کو تھام لیا۔مردے احتجاج نہیں کرتے۔مردے آواز نہیں نکالتے...اور دیکھو، تمہارا جسم گرم ہورہا ہے....میری ہتھیلیوں سے....'

'ہاں... مجھے کچھ ہورہا ہے....'

'میری ہتھیلیوں سے.....؟'

'پتہ نہیں...'

'میری گرم ہتھیلیاں اس وقت تمہارے احساس سے گزر رہی ہیں...' گل بانو کھلکھلا کر ہنسی....'میں اتنے دنوں سے ہوں......کبھی سیکس کا خیال نہیں آیا؟'

'سیکس...' مسیح سپرا کو محسوس ہوا، اچانک وہ کسی تنور میں آ گیا ہے۔اس کا جسم گرم ہونا شروع ہو گیا ہو۔ ایک آگ ہے، جس نے اچانک اس کے جسم میں گھلنا شروع کر دیا ہے۔گل بانو غور سے مسیح سپرا کو دیکھ رہی تھی۔ 'تمہیں یاد ہے؟ تم نے کب سے سیکس نہیں کیا.....؟'

'نہیں——' مسیح سپرا نے آنکھیں بند کر لیں۔اس وقت کمرہ گھوم رہا تھا۔سر چکرا رہا تھا۔اور زیر ناف ہلچل مچی تھی۔

'تمہارے اندر سیکس کرنے کی خواہش کبھی پیدا نہیں ہوئی؟'

'نہیں——'

گل بانو نے قہقہہ لگایا۔زیادہ بوڑھے نہیں ہو تم۔بس بن گئے ہو اور میں مان نہیں سکتی کہ سیکس کی خواہش تمہارے اندر نہ ہو...' وہ دوبارہ مسکرا کر بولی...ان جھینے



جھینے پردوں سے بھی سیکس کی چنگاریاں نکلتی ہیں۔ ان سفید پردوں سے اور ٹھنڈی دیواروں سے اور اس ٹھنڈی زمین سے جہاں تم لیٹے ہو۔ اور تمہارے جسم سے، جس کی لپیٹیں اکثر مجھ تک پہنچ جاتی ہیں۔'

مسیح سپرا اب کانپ رہا تھا....گل بانو نے مسیح سپرا کے کانپتے جسم کا جائزہ لیا۔

'سیکس میرے لیے کوئی نئی بات نہیں۔ مگر جس پیشے میں تھی، وہاں ذائقہ سو جاتا ہے۔ ہرے ہرے نوٹ رہ جاتے ہیں۔ اب تو نوٹ کے رنگ بھی زعفرانی ہو گئے۔مگر اس مردہ خانہ میں آ کر... بہت دنوں بعد...تم سمجھ رہے ہو نا....کشمیری بھیڑ کے کمبل دیکھے ہیں تم نے۔؟ کمبل کو سہلاؤ تو ٹھنڈی گرم آگ نکلتی ہے۔ٹھنڈی بھی گرم بھی....اور کشمیر کا حسین موسم، میں نے کشمیر نہیں دیکھا مگر ایسا ایک کمبل میرے پاس ہے۔اس کمبل کو اوڑھتی ہوں تو اس میں خود سے ایک مرد آ جاتا ہے۔ تمہاری طرح ڈرپوک....میں اس مرد کو دیر تک اوڑھ کر رہتی ہوں....اور میرے اندر سے چنگاریاں باہر نکلتی رہتی ہیں۔تم نے کبھی چنگاریوں کو ہوا میں اڑتے ہوئے دیکھا ہے؟ جب آہنگر سلگتے شعلوں پر قینچیاں اور چھریاں تیز کرتے ہیں اور ان سے آگ کی چنگاریاں اڑتی ہیں....دیکھو... اس وقت میرا جسم اسی طرح چنگاریاں پھینک رہا ہے...ان چنگاریوں کو دیکھو....

گل بانو نے سفید لباس سے خود کو آزاد کر دیا۔اندھیرے میں اس کے پستان نور کی طرح چمکے...اور اس کا سفید جسم مسیح سپرا کی نظر میں سیلاب بن گیا، ایسا سیلاب جو اسے بہا لیے جا رہا تھا...سیلاب، جس کی دھاروں سے آگ نکل رہی تھی...اس نے جائزہ لیا۔سفید سڈول انگارے دیتا جسم۔خوبصورت چہرہ، ہونٹ اپنی تمام لذتوں کے ساتھ اور ان لذتوں میں وہ زبان بھی آشکارا تھی، جس کی جھلک اس نے بازار میں ضحاک کے سانپوں میں دیکھی تھی۔سرخ لپلپاتی زبان...گو ہونٹوں

کے درمیان زبان پوشیدہ تھی مگر اس وقت لذت وصل میں شامل تھی۔ دو برہنہ بازو دعوت نظارہ دیتے ہوئے... اور بلند حسین گنبدوں کی طرح نظارہ دیتے ہوئے پستان نور... سپرا کی خواہش ہوئی کہ وہ اچانک اس سیلاب بلا میں چھلانگ لگادے ......مگر اس نے آنکھوں کو زور سے بند کیا اور زور سے چیخا۔ کپڑے پہن لو...

’آہ...تم بھی... میں نے سوچا تھا، وصل کی بارش کو اس کمرے میں لے آؤں گی۔‘

گل بانو نے تڑپتی آواز سنی۔ کپڑے پہن لو۔

اور جب وہ کپڑے پہن رہی تھی، اس نے چادروں کے سرسرانے کی آواز سنی اور دیکھا کہ مجسمہ والی عورت کے چہرے پر حیرانیاں نمودار ہوئی ہیں... اور اس نے کہا کہ کاش میں لیسبین ہوتی...

گل بانو نے کپڑے پہن لیے۔ وہ غصہ میں تھی۔

’تم مرد نہیں ہو...‘

مسیح سپرا نے آنکھیں بند رکھیں۔

’مردہ خانہ جل نہیں جاتا...‘

مسیح سپرا خاموش رہا۔

’تم میں حوصلے کی کمی ہے۔‘

مسیح سپرا اس بار بھی خاموش رہا۔

’تم نے ایک حسین برہنہ جسم کی توہین کی ہے۔‘

مسیح سپرا اس بار بھی کچھ نہیں بولا۔ اس نے آنکھیں بند رکھیں۔ گو اس کے جسم میں زلزلہ آیا ہوا تھا۔ جسم کے میناروں میں ہلچل تھی اور اس وقت یقیناً اس کا جسم گرم تھا مگر اس کے اندر کی بیتابیوں پر دبی برف کا بوجھ زیادہ تھا۔



’تم حقیقت میں مردہ ہو۔ بے حس اور پتھر...‘

گل بانو اس قدر زور سے چلائی کہ در و بام لرز گئے مگر مسیح سپرا پر اس کے لفظوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

’کچھ کھاؤ گے؟‘

’نہیں۔‘

گل بانو نے فریج سے پزا نکالا۔ پزا کھاتی ہوئی وہ کمرے میں ٹہلتی رہی۔ اس کی زندگی ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک تھی۔ اب اسے نظیرے کا انتظار تھا۔ نظیرا کسی وقت بھی آسکتا تھا۔ اس نے پلٹ کر زمین پر لیٹی ہوئی لاش کی طرف دیکھا اور سوچا کہ انسان لاش میں کس طرح تبدیل ہوجاتا ہے؟ جب اس سے آئینہ چھن جاتا ہے۔ موبائل لیپ ٹاپ، ٹی وی کی دنیا سے اسے الگ کردیا جاتا ہے۔ جب اس کے پاس سننے اور بولنے کے لیے کچھ نہیں رہ جاتا۔ جب وہ ساکت ہوا کی طرح ہوتا ہے۔ دھند... جب وہ خالی فضا کی طرح ہوتا ہے یا غبارے سے نکلی ہوئی ہوا کی طرح... جب وہ پیار اور سیکس کے قابل نہیں ہوتا۔ جب اس کی حرارت سرد پڑ گئی ہوتی ہے۔ گل بانو نے اپنی ہتھیلیوں کو ایک دوسرے سے ملایا تو احساس ہوا، ہتھیلیاں گرم ہیں۔ پھر اسے اماّں کی یاد آئی۔ اماں نو جہاں کو اس کے لیے جیل جانا پڑا۔ یہ بات اسے ناگوار گزر رہی تھی۔ وہ اس منظر کو دیکھ سکتی تھی کہ جب پولیس کے سپاہی اس کے گھر آئے ہوں گے، اس کی تلاش میں۔ اماّں نور جہاں کے لیے اس عمر میں جیل جانے کا تجربہ کیا آسان رہا ہوگا۔ پورے تین مہینے۔ اور یہ تین مہینے نظیرے نے بھی جیل میں گزارے۔ کیا کسی کے لیے بھی یقین کرنا آسان ہوگا کہ اس وقت وہ کہاں ہے اور اسے یقین ہے پولیس نے اس کی تلاش میں کوئی گوشہ نہیں چھوڑا ہوگا۔ پرانے چکلہ گھر میں بھی اسے تلاش کیا ہوگا۔ پارک میں، ہوٹلوں

میں، بس اسٹینڈ پر، ریلوے اور ائیر پورٹ۔ اسے یقین تھا، اس کی تصویر بار بار ٹی وی پر دکھائی گئی ہوگی۔ مگر اب وہ ایسی تمام سوچ سے باہر نکلنا چاہتی تھی۔ وہ زندہ ہے اور کسی مردہ خانہ کا حصہ نہیں ہوسکتی....اور اس لیے وہ چیخ سکتی ہے۔ وہ باتیں کرسکتی ہے۔

او.....و....وا

وہ زور سے چیخی۔ مسیح سپرا پر اس کی چیخ کا کوئی اثر نہیں ہوا.....

ہا.....ہا.....

وہ دیر تک بغیر کسی بات کے ہنستی چلی گئی۔

وہ مطمئن تھی کہ وہ بلیک آؤٹ سے باہر ہے...اور وہ جب چاہے، قہقہہ لگا سکتی ہے۔ یہاں تک کہ کسی کو ہلاک بھی کرسکتی ہے۔



## (9)

.....اور اس وقت جب مسیح سپرا جنت میں ملنے والے میووں اور پھلوں کے بارے میں سوچ رہا تھا، اس کی نظر سفید چادروں کی طرف گئی، اس نے محسوس کیا، سیاہ رنگ کا ایک گرگٹ ہے، جو چادروں پر چڑھنے کی کوشش کررہا ہے۔ یہ گرگٹ کہاں سے آیا۔؟ زمین پر سونے میں کئی خطرات میں سے ایک یہ بھی خطرہ تھا کہ چوہا گرگٹ، پتنگے، مچھر تک اسے پریشان کرسکتے تھے۔مگر اب آہستہ آہستہ اس نے ایسے تمام خیالوں سے خود کو بے نیاز کردیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور موت کے جزیرے کا تصور کیا اور دیکھا کہ بہت سے لوگ ہیں جن کے جسم پر سفید لباس ہیں اور ان کے درمیان حوریں بھی ہیں۔ پھر اس نے دوزخ کا تصور کیا اور احساس ہوا کہ آگ کی تپش اس قدر زیادہ ہے کہ اس کا سارا جسم سلگ رہا ہے اور وہ ایک خوفناک جزیرے میں ہے اور مسلسل چیخ رہا ہے۔اسی درمیان دروازے پر آہٹ ہوئی۔ اسے نہیں معلوم کہ رات کہاں پہنچی اور وقت نے کتنا سفر کیا۔ دستک کے ساتھ ہی اس نے گل بانو کو دیکھا، جو تیز قدموں سے دروازے کی طرف بڑھی اور پھر اس نے ایک عجیب سے بے ہنگم شخص کو کمرے میں آتے ہوئے دیکھا۔ اس نے اپنی

آنکھیں بند رکھیں۔اس مردہ خانہ میں اسے اپنے سوا کسی کا وجود بھی گوارہ نہیں تھا۔ پہلے گل بانو آئی اوراس کے بعد یہ عجیب سی مخلوق۔گل بانو نے دروازہ سرعت سے بند کیا اور جو عجیب سی مخلوق کمرے میں داخل ہوئی تھی، وہ اس سے لپٹ گئی اور زار و قطار رونے لگی۔سپرا نے جائزہ لیا۔اس نے سفید رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا، چہرہ سانولا تھا اور اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔یقینی طور پر یہ نظیرے تھا۔کچھ یہی حلیہ کچھ دن پہلے گل بانو نے بتایا تھا اور وقت وہ اس کے سینے سے لگی ہوئی رو رہی تھی۔مسیح سپرا نے سینے پر سانپوں کو محسوس کیا، وہی ضحاک کے دو سانپ اس وقت اس کے سینے پر سوار ہو گئے تھے۔اس نے پھر اندھیرے میں اس آدمی کا جائزہ لیا تو وہ اسے پہلی نظر میں معصوم نظر آیا۔

وہ رو رہا تھا۔سب ختم ہو گیا۔تمہارے جانے کے بعد سب ختم ہو گیا۔جب پولیس اماں کو جیل لے جا رہی تھی وہ دھاڑیں مار کر رو رہی تھیں اور ان کی آواز آسمان میں شگاف کر رہی تھی۔

اچانک نظیرے پلٹا۔اس نے چونک کر اور کچھ سہمے انداز سے گھر کا جائزہ لیا۔ سرسراتے سفید پردوں کو دیکھا اور ان پردوں کے درمیان اس مجسمہ کو بھی اور اس شخص کو بھی جو زمین پر لیٹا ہوا تھا۔اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار تھے۔وہ عجیب نظروں اور اڑی رنگت کے ساتھ گل بانو کو دیکھ رہا تھا۔

’تم یہاں رہتی ہو؟‘

’ہاں...‘

’اور یہ سب کیا ہے...؟‘

’مردہ خانہ...‘

’اور یہ شخص جو زمین پر لیٹا ہے...؟‘



’مردہ...‘

’کیا کوئی مردے کے ساتھ رہ سکتا ہے...؟‘ نظیرے کی آواز کانپ رہی تھی

’میں رہ رہی ہوں...‘

’یہ جگہ تمہیں کیسے ملی؟‘

’نصیب سے...اوراس سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔‘

’ہاں، اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔‘ نظیرے آہستہ سے بولا۔’کیا وہ یہاں آئے تھے؟‘

’اب تک نہیں۔‘

’لیکن وہ آ سکتے ہیں۔وہ قبرستانوں میں بھی جا رہے ہیں۔‘ نظیرے نے بتایا، تمہاری اماں قبرستان جانے سے دو قدم پیچھے رہ گئی تھی، جب پولیس والوں نے اسے بتایا کہ تم ایک پولیس افسر کا خون کر کے بھاگی ہو اور تمہارے گھر کی تلاشی لی جائے گی۔تلاشی کے بعد کچھ نہیں ملا تو پولیس والے بے رحمی سے مارتے ہوئے اسے جیل لے گئے۔اس پر دفعہ لگایا کہ وہ اس قتل میں برابر کی شریک تھی اور وہ مجھے بھی لاٹھیوں سے مارتے ہوئے لے گئے۔وہ بار بار پوچھ رہے تھے کہ ہم بنگلہ دیش سے کب آئے...اور ہمارے پاس کاغذات نہیں ہیں تو ہمیں جزیرۂ جہنم جانا پڑے گا۔‘

’جزیرۂ جہنم۔‘

نظیرے نے آہستہ سے بولا۔’جو ہم سبھوں کے لیے تیار کیا گیا ہے۔جہاں ہم صرف انگلیوں پر موت کے دن گن سکتے ہیں۔‘

گل بانو نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا....اور دونوں مجسمے سے کچھ فاصلے پر زمین پر بیٹھ گئے۔سفید چادروں سے نکلتی روشنی نے انہیں اپنے حصار میں لیا...اوراس

وقت دونوں خاموش تھے۔مسیح سپرا نے آنکھیں بند رکھیں کہ کمرے میں موجود اس تیسرے آدمی سے اس کا کوئی واسطہ نہیں تھا مگر یہ خیال اسے بھی بار بار پریشان کر رہا تھا کہ وہ آسکتے ہیں اوو وہ کہیں بھی سرحدیں توڑ کر جا سکتے ہیں۔ وہ کبھی بھی اس مردہ خانہ میں آسکتے ہیں۔مسیح سپرا نے سنا،نظیرے کہہ رہا تھا۔

’چکلہ گھر والوں کے پاس کاغذات کہاں سے ہوں گے۔ آبا واجداد کے دستاویز کہاں سے ملیں گے۔اللہ رکھے، خالہ نور جہاں نواب پیرزادہ کے قریب تھیں۔گل بانو تم نواب کی بیٹی ہو۔مگر ناجائز۔نواب پیرزادہ مرکھپ گئے۔ ان کی اولادیں باہر ملکوں میں منتقل ہوگئیں۔ یہاں نواب کی جو ملکیت تھی، ان کے بیٹوں نے فروخت کردی۔اب پرانی مسجد قبرستان میں ایک پکی قبر ہے، جہاں کوئی بھی آتا جاتا نہیں۔کتبہ ٹوٹ چکا ہے۔میں پرانی مسجد قبرستان گیا تھا، مگر حاصل کچھ بھی نہیں ہوا۔نواب زندہ ہوتے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کاغذات نہیں تو جزیرۂ جہنم کا راستہ رہ جاتا ہے۔نواب قبرستان میں اپنے ساتھ دستاویز تو لے جانے سے رہے۔‘

نواب پیرزادہ۔گل بانو نے آہستہ سے اس نام کو دہرایا۔مگر اس نام سے کسی بھی طرح کی انسیت اس کے اندر پیدا نہیں ہوئی۔ یہ نام اس نے اماّں نور جہاں کے منہ سے دو ایک بار سنا تھا مگر کبھی بھی اس نام میں اس کی کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی۔اچانک گل بانو کے جسم میں تھرتھراہٹ پیدا ہوئی۔ کوئی ہے۔نظیرے کے ساتھ مسیح سپرا نے بھی لیٹے لیٹے سفید سرسراتی چادروں کی طرف دیکھا۔ وہاں اسکرین روشن تھا، اور اسکرین پر ضحاک کے دو سانپ لپلپاتی زبان نکالے موجود تھے، جیسے چادروں سے چھلانگ لگا کر کمرے میں آنا چاہتے ہوں۔ یہ وقفہ کچھ دیر کا رہا ہوگا۔ پھر سانپ غائب ہوگئے۔



وہ یہاں بھی ہے....گل بانو خوفزدہ تھی۔

’وہ ہر جگہ ہے....‘نظیرے کی آواز میں ٹھہراؤ تھا۔ جب ضحاک کے شانوں پر دو بڑے اژدہے نمودار ہوئے تو اس نے کئی حکیموں سے اپنا علاج کرایا۔ وہ خود بھی جادوگر تھا۔اس نے جادو کے زور سے علاج کرنا چاہا مگر ناکام رہا۔اژدہے ہر بار کاٹتے اور ہر بار اژدہے پہلے سے کہیں زیادہ بڑے اور بھیانک ہوجاتے ۔ابلیس نے مشورہ دیا کہ وہ دارالسلطنت اگباثانہ پر حملہ کرے۔ یہی راستہ ہے اور فتح کے بعد وہ ٹھیک ہوجائے گا۔ضحاک نے اپنی فوج میں اضافہ کیا۔ان دنوں قوم عاد کا بادشاہ جمشید تھا۔سعد برنور جمشید کا استاد تھا۔اس نے جناتوں کو مسخر کیا ہوا تھا۔سعد برنور نے جمشید کے لیے ایک ساغر بنایا تھا۔اس ساغر میں جمشید پیش آنے والے کسی بھی واقعہ کو دیکھ سکتا تھا۔اس پیالہ کی وجہ سے جمشید میں تکبّر آگیا اور اس نے خدائی کا دعویٰ کیا۔ضحاک نے اگباثانہ پر حملہ کیا۔اس کی فوج شہر میں داخل ہوئی اور قتل وغارت گری کا بازار گرم ہوا۔ جمشید مارا گیا۔مگر ایک فریدوں نام کا شہزادہ فرار ہونے میں کامیاب رہا۔ایک دن ضحاک دربار شاہی میں بیٹھا تھا کہ ابلیس شکل تبدیل کرکے آیا اور ضحاک سے کہا۔سن اگر تو ہر روز ایک انسان کا قتل کرے گا اور مرے ہوئے انسان کا دماغ نکال کر اپنے زخموں پر لگائے گا تو تیرے یہ زخم ٹھیک ہوجائیں گے۔اس کے بعد ضحاک کے دربار میں پکڑ پکڑ کر شہریوں کو لایا جاتا، انہیں قتل کیا جاتا۔ان کے مغز ضحاک کو پیش کیے جاتے اور ضحاک بہت حد تک درد میں کمی محسوس کرتا....‘

’گل بانو اس مقام پر ٹھہری....شہریوں کا قتل اور وہ بھی اس بے دردی سے۔‘

’کیونکہ ہر شہری اژدہے کی خوراک ہے۔ان کا مغز کھانے کے بعد اژدہے کچھ دیر غنودگی میں چلے جاتے ہیں۔‘

گل بانو کی آنکھوں کے آگے جزیرۂ جہنم کا منظر تھا۔ مگر وہ کچھ بولی نہیں۔ اس نے نظیرے کی طرف دیکھا.... آگے کیا ہوا۔

نظیرے نے گل بانو کی طرف دیکھا اور آہستہ آہستہ بولنا شروع کیا... جہاں اژدہے ہوتے ہیں وہاں کاوہ بھی ہوتے ہیں۔ ایران کے اصفہان شہر میں ایک لوہار تھا۔ لوہار کا نام کاوہ تھا۔ ضحاک اس کے دونوں نوجوان بیٹوں کو قتل کرا چکا تھا۔ ایک دن ابلیس بھیس بدل کر کاوہ کے پاس آیا اور کہا کہ وہ جمشید کے چراغ فریدوں کو تلاش کرے۔ کاوہ نے فریدوں کو تلاش کیا اور ایک فوج ترتیب دی۔ اس نے چمڑے کی مدد سے ایک پرچم تیار کیا۔ فریدوں کی فوج کو کامیابی ملی۔ چمڑے کا پرچم لہرایا اور ضحاک نے قید خانے میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دی۔ ہر ضحاک کے لیے ایک کاوہ اور ایک فریدوں ہوتا ہے اور ایک دن ظالم ضحاک کے اژدہوں کو بھی مرنا ہوتا ہے....'

'میں باہر جاؤں گی اور چمڑوں کی مدد سے تیر کمان بناؤں گی۔'

نظیرے ہنسا۔ کچھ لوگوں نے یہ بھی آزما کر دیکھ لیا۔ اژدہے قد میں اور بڑے ہوگئے۔' سپریم عدلیہ نے تنبیہ کی ہے کہ ضحاک کا احترام کیا جائے۔'

'اور جزیرۂ جہنم؟' گل بانو نے پوچھا۔

'ضحاک نے ریزرو بینک کو خالی کر دیا ہے۔ اب وہ ملک کے ہر حصے میں جزیرۂ جہنم کی تعمیر کرا رہا ہے۔'

'اور انقلاب....؟' گل بانو کے چہرے پر معصومیت تھی۔

'انقلاب کو کچلنے کے لیے ضحاک خود میدان میں ہے۔'

'اور سکون؟' گل بانو نے آہستہ سے پوچھا۔

'یہ چڑیا اب اس ملک میں نہیں رہتی۔' نظیرے نے آہستہ سے بولا۔



'میں بھی سکون میں نہیں۔ مردے تک سکون میں نہیں۔'

مسیح سپرا نے انگڑائی لی اور اٹھ بیٹھا۔

نظیرے نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے لاش کی طرف دیکھا۔

'لاش بولتی بھی ہے؟'

'ہاں۔ ضرورت پڑنے پر۔' گل بانو مسکرائی۔

'ہم ایک خوفناک مذاق کے شکار ہیں۔' نظیرے چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ضحاک ایک قانون سے کروڑوں لوگوں کو شہریت سے خارج کرے گا پھر دوسرے قانون سے اپنے لوگوں کو شہریت میں داخل کر دے گا۔ بچ جائیں گے چند سادہ لوح جزیرۂ جہنم کے حوالے کر دیے جائیں گے۔ ان کا کوئی پُرسان حال نہ ہوگا۔ ایک طرف احتجاج اور انقلاب میں ہر مذہب کے لوگ شامل ہیں اور دوسری طرف ڈاکٹری، تجارت، تعلیم، منڈی ہر پیشہ دو حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ دیواریں زعفرانی ہوگئی ہیں۔ پرچم کے رنگ تبدیل ہونے والے ہیں اور ضحاک کے دو سانپ ہر گوشے، گلیوں میں نمودار ہو رہے ہیں...اور میں تین بسیں بدل کر آیا ہوں کہ مجھے شناخت نہ کیا جائے۔ اس وقت ہر شخص خطرے میں ہے۔ ضحاک کے کتّے سب جگہ ہیں اور، دوست دشمن کی پہچان کر لیتے ہیں۔ ہمیں برے وقت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔'

'لیکن اس مردہ خانہ میں کون آئے گا۔'

'وہ آسکتے ہیں۔' نظیرے کے لہجے میں سختی تھی اور تم ان کے بارے میں سنا ہوگا۔ قبر کھودنے والے، شمشان کی راکھ چننے والے....'

'لیکن انہیں کیا کچھ حاصل ہوا۔؟'

'ان سب سے بڑی چیز ہے زندگی، جس کے لیے بڑی بڑی حماقت کی جا سکتی

ہے۔'

'حماقت....' مسیح سپرا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

نظیرے نے گل بانو کی طرف دیکھا اور کہا.... ویسے یہ آدمی دلچسپ ہے——
اور میں اس سے خوفزدہ بھی نہیں.... اور اگر یہ مر چکا ہے تب بھی اس کو اپنے کاغذات اور دستاویز تیار رکھنے ہوں گے۔ اس وقت زندوں سے زیادہ مردے پریشان ہیں۔ کوئی بھی مردہ اپنے قبر میں آرام سے نہیں ہے۔ سڑک پر جاؤ اور دیکھو۔ لوگ پرانے گھروں کو جارہے ہیں۔ پرانی حویلیاں تلاش کررہے ہیں۔ نئے مکانوں کی تعمیریں ہل رہی ہیں۔ پرانے صندوق کھل رہے ہیں۔ زندگی پیچھے کی طرف جارہی ہے۔ بلکہ ایسے بھی لوگ ہیں، جو آگے نہیں، پیچھے چل رہے ہیں۔ پاؤں اور گھٹنوں کو موڑ کر کہ شاید عذاب سے چھٹکارے کی کوئی سبیل مل جائے۔'

'پیچھے کی طرف۔'

مسیح سپرا اپنی جگہ سے اٹھا۔ جسم پر بوجھ ڈالا اور پیچھے کی طرف رینگا۔ رینگتے ہوئے وہ دوبار لڑکھڑایا۔ تیسری بار میں وہ مجسمہ سے ٹکرایا۔ پھر سیدھا ہولیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ پاؤں کو پیچھے کی طرف نہیں لے جاسکتا۔ یہ مشکل کام ہے۔ اس نے مجسمہ والی عورت کے چہرے پر ناراضگی محسوس کی اور وہ سہم گیا۔

'مجھے احساس ہے کہ خالہ کے پاس اب زیادہ زندگی نہیں بچی ہے...اور بہتر ہے کہ تم اسی جگہ رہو۔ کیونکہ باہر پولیس والے تمہیں چھوڑیں گے نہیں۔ اچھا میں چلتا ہوں۔'

نظیرے جیسے آیا تھا، ویسے ہی چلا گیا۔ گل بانو نے دروازہ بند کیا۔ اماّں نور جہاں کی بیماری کا سُن کر وہ کچھ دیر کے لیے پریشان ہوئی۔ مگر ابھی سب سے



بڑی پریشانی اس بات کی تھی کہ کون ہے وہ؟ اس کے پاس تو کچھ بھی نہیں؟ وہ کون ہے اور اس کا ملک کون سا ہے؟ سفید سرسراتی چادروں کے درمیان ایستادہ مجسمہ اور اس میں کوئی فرق نہیں۔

'نظیرے چلا گیا۔'

'ہاں۔' سپرا کو اس بات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

'تم مردے ہو، مگر تم کو بھی ہراساں کیا جاسکتا ہے۔'

'ہاں۔'

'کیا کوئی اپنی قبر میں خوش ہے؟'

'نہیں۔' سپرا نے آہستہ سے جواب دیا۔

'وہ لوگ آئے تو کیا کرو گے؟ زندہ ہو جاؤ گے؟'

'نہیں۔'

'تم نے سنا، نظیرے کیا کہہ کر گیا ہے۔' گل بانو زور سے چیخی۔ 'وہ کبھی بھی یہاں آسکتے ہیں...اور اس حال میں تمہارا یہ پاگل پن نہیں چلے گا۔'

'میں پاگل نہیں ہوں۔' سپرا کے الفاظ برف تھے۔

'اور مردہ بھی نہیں ہو۔' گل بانو زور سے بولی۔ باہر تیز ہوا چل رہی ہے۔ سردیوں کا موسم جاچکا ہے...اور ہم ایک مقبرے میں ہیں۔ باہر طوفان ہے اور اس وقت میرے جسم میں آگ بھری ہوئی ہے۔'

سپرا خاموش رہا۔

'اس پاگل پن کو ختم کرو۔ میں جانتی ہوں۔ ایک آندھی تمہارے اندر بھی چل رہی ہے۔ اس آندھی کی آواز سنو۔ سیکس....سنو....اپنے جسم میں جھانکو....اور میں جانتی ہوں، تمہارے اندر گرم خون کی رفتار بڑھ گئی ہے....میں اس وقت ضحاک،

اس کے سانپ، انقلاب...سب سے دور نکل آئی ہوں۔ میں ایک ندی ہوں....
موسلا دھار بارش ہوں.... میں سنامی ہوں...اور اس وقت تیز لہریں مجھے بہاتی ہوئی
تمہاری طرف لا رہی ہیں۔'

مسیح سپرا نے محسوس کیا، اس کی کنپٹیاں جل رہی ہوں۔ جسم میں اچانک زلزلہ
آ گیا ہو۔ اس نے محسوس کیا، کوئی کیمیائی تبدیلی ہے، جس کے اثرات تیزی سے
اس پر مرتب ہو رہے ہیں .....اور اس سے قبل کہ وہ گل بانو کی طرف دیکھتا۔ وہ
اچانک چونک گیا۔ کوئی تھا جو سرد لاش میں تبدیل تھا۔ وہ اس مردہ عورت سے
واقف نہیں تھا، جیسے زمین میں گڑے مردے ہوتے ہیں۔ جسم کے اندر تک اتر
جانے والی سرشاری نے اچانک گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ یہ مردہ عورت کا سر ہے۔ یہ
مردہ عورت کی جانگھیں.... یہ مردہ عورت کے ہاتھ اور استخوانی ہتھیلیاں...نیم خوابی
کی کیفیت میں ڈوبتے ہوئے یہ خیال اس پر غالب تھا کہ ایک نامکمل اور مردہ لڑکی
اس کے بازو میں ہے اور وہ اس کے چہرے کو زیادہ دیر تک نہیں دیکھ سکتا۔ اس نے
گل بانو کو خود سے الگ کیا۔ اس وقت اس کی خواہش موم بتی روشن کرنے کی تھی، مگر
گھر میں موم بتی نہیں تھی۔ اسے احساس تھا کہ کسی بھی طرح کی شہوانی خواہش سے
وہ کوسوں دور ہے....اور ایک اندھیرا اس کے اندر گھات لگائے بیٹھا ہے۔ شہوانی
عمل سے جڑے خوابوں کی کائنات سے وہ دور نکل آیا ہے۔ کیا اس کے اندر کوئی
تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔؟ سپرا نے خود کا جائزہ لیا اور مطمئن ہوا کہ جسمانی عمل
سے اس کی حسّیات کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

بہت دنوں بعد اسے ریحانہ کی یاد آئی...اور وہ عورتیں بھی جو اس کی زندگی میں
آئی تھیں۔ اس وقت وہ ایک کشادہ ویران سڑک پر تھا۔ سامنے ایک دریا تھا۔ مگر دریا
کا پانی خشک تھا۔ دریا کے پیچھے پہاڑ اور پہاڑ کے پیچھے سورج سرد گولے میں



تبدیل۔ پہاڑ سے کچھ آوازیں آ رہی تھیں اور اسے یقین تھا کہ یہ مردہ روحوں کی
آوازیں ہیں۔ اسے خیال تھا کہ وہ یہاں بہت بار آ چکا ہے۔ مگر آج سے پہلے کبھی
سورج سرد سرخ گولے میں تبدیل نہیں ہوا، کبھی پہاڑوں کے پیچھے سے آوازیں
نہیں آئیں۔ وہ بھیڑوں اور بکریوں کو دیکھنا چاہتا تھا.....اور اسے یاد ہے، کچھ برس
قبل اس علاقے میں حادثہ ہوا تھا تو یہاں پولیس کا ایک بیرک بن گیا تھا۔ گھونسلے
میں پہرہ دیتے سپاہی۔ بیرک اجڑ گیا۔ سپاہی لوٹ گئے۔ کھیتوں کو کاٹ کر راستہ
بنا دیا گیا۔ اس نے محسوس کیا، اس کے پیروں کے نیچے کی زمین سرد ہے...اور اب
اسے واپس لوٹنا ہے۔

اس نے آواز سنی۔' کیا میں تمہیں قتل کر دوں؟'

یہ گل بانو تھی، جو غصے سے اس کی کیفیت، اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

ریگستان میں بھالو ہیں...اس نے ٹھہر کر کہنا چاہا۔

میں اس وقت ریگستان میں نہیں ہوں۔

ہاں۔ تم ریگستان میں نہیں ہو۔

کیا تمہارے اندر کے شعلے سرد ہیں۔؟

'وہ سرد سورج کا گولہ۔ پہاڑیاں....مباشرت کے عمل میں ہر بار ایک بھالو
آ جاتا ہے۔'

مباشرت....گل بانو نے قہقہہ لگایا۔ میں شہد مکھی کے چھتے کی طرح تم پر ٹوٹ
پڑوں گی۔

ہاں، تم ایسا کر سکتی ہو۔ مگر تمہاری ہتھیلیاں استخوانی ہیں اور چہرے کے مانس
ختم ہو چکے ہیں۔ اب وہاں صرف ہڈیاں ہیں۔ اور تم صرف ایک کھوپڑی ہو میرے
لیے۔'

اور جب اس نے ایسا کہا، اسے کچھ خانہ بدوش نظر آئے جو ہوائی گھوڑوں پر سوار تھے اور تلوار سے لیس...اور زمین سے گرد اٹھ رہی تھی....اور ایک بار پھر اسے موت کا خیال آیا۔فرض کیا، کہ ابھی اس نے گل بانو سے چائے طلب کی اور اس سے قبل کہ گل بانو چائے لے کر حاضر ہو، اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ ایک لمحہ کا جادو۔ اور جادوگر کون ہے۔ کیا اس ایک لمحے کے بعد ہوائی گھوڑے نہیں ہوں گے۔؟

گھڑ سواروں کے جتھے، ضحاک اور سرد سورج کا گولہ....؟ اس نے قیاس لگایا، موت کی صورت میں ایک طوفان آتا ہے اور اس طوفان میں ہڈیاں تک سلامت نہیں رہتیں۔ ایک لمحے کے جادو میں، بھنور میں کشتی ڈوب جاتی ہے اور ساحل غائب ہو جاتا ہے۔ پھر سپرا نے محسوس کیا، اس کا پورا جسم حس واحد بن گیا ہے۔خوشگوار لمحہ، زمین وآسمان کی پُر اسرار طاقتوں کا اثر کتنا گہرا ہے۔ وہ زمین سے چپک گیا ہے اور زمین کھسک رہی ہے۔ وہ ہر طرح کے تجربوں سے دور ہے، سوائے وہ عورت جو اس سے کچھ فاصلے پر لیٹی ہے۔لیکن وہ بھی مردہ ہے۔

باہر سے گھڑ گھڑانے کی آواز آئی....اور یہ گھڑ گھڑاہٹ دیر تک فضا میں طاری رہی۔گل بانو نے پہلے بچھو کا تصور کیا، پھر گھڑیال کا، پھر آدم خور کا اور جب گھڑ گھڑانے کی آواز میں کمی نہیں آئی تو وہ اٹھی اور چادریں ہٹا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔

ٹرک جا رہے ہیں۔

سپرا نے کہا۔’ان میں بھالو ہوں گے۔‘

’نہیں انسان ہیں۔ٹرک کی چھتیں خالی ہیں۔‘



’چھت آندھی اڑا کر لے گئی۔‘

’کیوں؟‘

’خانہ بدوش لالٹین لے کر مسخرے تلاش کر رہے تھے۔‘

’مسخرے مل گئے؟‘

’ہاں، تم ہی نے تو بتایا کہ ٹرک میں انسان تھے۔‘

’میرا خیال ہے اب میں موسیقی کا لطف نہیں لے سکتی۔گل بانو کے چہرے پر شکن تھی۔‘

’کیا یہ فوج کا جتھا تھا؟‘

’ایسے کام فوج کو ہی سونپے جاتے ہیں۔‘

’آہ..‘ گل بانو نے آہستہ سے کہا۔تاریخ روحوں سے مکالمہ کرتی ہے۔

’اقلیتی روحوں سے۔‘

ٹرک چلے گئے۔سپرا کو اچانک کچھ یاد آ گیا۔کچھ دیر تک وہ شش و پنج میں رہا۔ دیوار کے دوسری طرف سے بیلچوں، ٹھیلوں کے گزرنے کی آواز آ رہی تھی....اسے یقین تھا، اس نے وقت کو یہیں دفن کر دیا ہے۔مگر باہر سے گزرتے ٹرک اس بات کے گواہ تھے کہ تاریخ حرکت میں ہے....اور وقت مردہ خانہ کی قبر سے باہر نکل آیا ہے۔سپرا، دوبارہ گل بانو کی طرف مڑا۔

’وہ قتل....تم نے کہا تھا، اس دن چھ جنوری۔‘

’ہاں۔‘

مگر تم تو اس سے ملنے رات میں گئی تھی۔

’ہاں۔‘

کتنے بجے گئی تھی

'11 بجے۔'
یعنی راٹھور کے پاس پہنچنے میں کتنا وقت لگا۔
'آدھا گھنٹہ۔'
سپرا کے دماغ میں گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ یعنی تم نے جاتے ہی راٹھور کو شوٹ
کر دیا
'نہیں۔'
کتنی دیر بعد شوٹ کیا
'دو ڈھائی گھنٹے تو بات چیت میں گزر گئے۔'
'میں یہی کہہ رہا تھا۔ سپرا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ گنجے فرشتے کے مطابق ۷ جنوری کا
دن ہندوستان کی تاریخ میں اس برس آیا ہی نہیں۔ چھ جنوری کے بعد ۸ جنوری۔ تم
نے بارہ بجے کے بعد قتل کیا۔ یعنی ۷ جنوری کی شب شروع ہو چکی تھی۔'
'کیا۔؟' گل بانو نے سپرا کی طرف دیکھا۔ میں کچھ سمجھی نہیں۔
'۷ جنوری کا دن ضحاک نے اس برس کی ڈائری سے اڑا دیا۔ اس کا مطلب نہ
راٹھور کا خون ہوا اور نہ تم مجرم ہو۔
'مگر راٹھور کا خون تو ہوا ہے؟'
'یہ جواب ان کے دیوتاؤں کو دینے دو۔ یعنی اگر پولیس تم کو گرفتار بھی کرتی
ہے تو تم کہہ سکتی ہو کہ ۷ جنوری کی شروعات ہوئی ہی نہیں اور واردات ۷ جنوری کو
ہوئی اور ۷ جنوری جب کلینڈر میں ہے ہی نہیں تو تم مجرم کیسے ہوئی؟'

سپرا کا خیال تھا کہ وہ کسی گھنے ریگستان میں ہے۔ اونٹ کی قطار ہے اور
گھنٹیوں سے خوفناک آوازیں نکل رہی ہیں۔ اس کے پھیپھڑے سوکھے ہیں اور



پھیپھڑوں میں پانی بھرنا شروع ہو گیا ہے۔ قانون کی کتابیں التوا میں ڈال دی گئی
ہیں۔ ایک سخت رسّی اس کے گلے تک پہنچ چکی ہے۔ پھانسی کا پھندہ۔ وہ چیخنا چاہتا
تھا کہ ٹھہر گیا۔ ایک دلچسپ نظارے کی زد پر تھا۔ گل بانو اسٹور کی طرف گئی۔ وہاں
سے ایک بڑا سا اسٹیل کا صندوق تھا جو اب خالی پڑا تھا۔ اس میں ریحانہ کے کپڑے
تھے، کچھ سردیوں کے لباس تھے۔ یہ سب چیزیں اس نے تقسیم کر دی تھیں۔ یہ
صندوق اب خالی تھا۔ خالی ہونے کے باوجود، گل بانو صندوق کو کھینچتی ہوئی کمرے
میں لا رہی تھی۔ پھر یہ صندوق اس نے اس جگہ رکھا، جہاں وہ آرام کرتی تھی۔
پھر سپرا نے دیکھا، اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ کپڑا ہے۔ یہ کپڑا بھی سفید تھانوں
کے ساتھ ہی وہ لے کر آیا تھا کہ کبھی اس کی بھی ضرورت پڑ جائے۔ گل بانو نے
صندوق پر سیاہ کپڑا اڈالا اور اس طرح ڈالا کہ اب صندوق نظر نہیں آ رہا تھا۔
'یہ کیا ہے؟' سپرا نے پوچھا۔
'موت صرف تمہارے ہی دماغ میں ہے کیا؟'
'مگر یہ ہے کیا؟'
'قبر۔ میری قبر۔' وہ ہنسی ـــــ مردے قبر میں رہتے ہیں۔
'قبر...؟'
'جہاں تم لیٹے ہو، وہ جگہ کہیں سے قبر کی طرح لگتی۔ مگر اب اس جگہ کو دیکھو۔'
'ہاں۔ قبر نما۔'
'قبر نما نہیں۔ میری قبر۔'
'لیکن صندوق تو زیادہ بڑا نہیں۔'
'میرے لیے کافی ہے۔ میں پاؤں ذرا سا سکوڑ لوں گی۔'
دیکھتے ہی دیکھتے گل بانو قبر کا حصہ بن گئی۔ یعنی قبر کے اوپر اس نے اپنے

پاؤں پھیلا دیئے۔

مقدس خدا، مقدس اور طاقتور خدا۔ سپرا نے وہ آوازیں دوبارہ سنیں جو شاید انسانی جسم کو لاریوں میں بھر کر لے جاتی تھیں۔ ان انسانی جسموں کو کہاں لے جایا جاتا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کیں۔ یہاں سے دو سڑکیں نکلتی ہیں۔ ایک مشرق کے راستے، دوسرے مغرب کی طرف۔ مغرب والی سڑک کچھ دوری پر ہائی وے سے مل جاتی ہے۔ وہاں سے ایک راستہ کھیتوں کی طرف جاتا ہے۔ ان کھیتوں کے درمیان کہیں تالاب بھی ہوں گے۔ یہ اس کا قیاس تھا... اور ان کھیتوں کی طرف کوئی نہیں جاتا۔ یہ سرکاری زمین ہے۔ تو کیا ان لاشوں کو وہاں جلا دیا جاتا ہے...؟ اور جلانے کے بعد پانی میں بہا دیا جاتا ہے۔

ابھی سپرا کے پاس سوچنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ خاص کر وہ قبائلی مخلوق۔ خانہ بدوش جو محلے محلے جا کر گھر خالی کرو کا نعرہ لگاتے تھے... اور اب ان کے ساتھ بندروں کی باضابطہ فوج ہوتی تھی۔ سپرا کو یاد تھا، کہ ان لوگوں نے پرانی عمارت کے ساتھ کیا کیا اور اب یہ کیا کرنے والے ہیں۔ مگر کچھ باتیں تھیں جو سپرا کی سمجھ سے باہر تھیں۔ ۷ جنوری کے دن کا غائب ہونا۔ معصوم نوجوانوں پر پر گولیوں کا چلنا اور پولیس والوں کا خوفزدہ ہو جانا۔

اس درمیان سپرا ضرورتوں کے سامان کی خرید کے لیے دو تین بار گھر سے نکلا... اور اب اس کے پاس بہت سی کہانیاں جمع ہو گئی تھیں۔ حیرت انگیز کہانیاں.... اور یہ کہانیاں ۷ جنوری سے وابستہ تھیں، جن کے بارے میں ساری دنیا میں ایک نئی بحث شروع ہو چکی تھی۔



# باب پنجم

# دشت لایعنیت

وہ دن تاریخ مہینوں کا حساب رکھتے تھے
اوران کے پاس یہ طاقت تھی



کہ وہ کسی بھی دن کو غائب کر سکتے تھے

(1)

سپرا دیکھ سکتا ہے۔ ایک میت ہے، جو خلا میں ہے اور جسے چار کندھے نصیب ہوگئے ہیں۔ شام کا وقت ہے۔ راہگیر میت کو راستہ دینے کے لیے ادھر ادھر ہوجاتے ہیں—— اوراس مقدس راستے کی طرف جہاں تم جارہے ہو، خوش رہنا، الوداع—— یہ اس کا دوست ہے، برسوں پرانا جسے وہ بھول چکا ہے۔ سردی کا موسم ہے....اوراس وقت ایک قبرستان کا حصہ دکھائی دے رہا ہے، جہاں میت کو دفن کیا جانا ہے۔ قبرستان دور سے نظر آرہا ہے۔ گیلی مٹی کی دیوار....ایک بڑا سا دروازہ.... ساکت درخت، ہوا خاموش... سپرا اس میت کو پہچانتا ہے۔ قبرستان پہنچنے تک اچانک ساکت درختوں کا جمود ٹوٹتا ہے۔ خاموش ہوا تیز آندھی میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ میت کا سیاہ کفن کھل جاتا ہے۔ ایک چہرہ ہے، ڈراؤنا۔ مگر یہ چہرہ ڈراؤنا نہیں ہے۔ یہ اس آدمی کی میت ہے، جو برسوں پہلے مر چکا ہے اور خلا میں جسے دفن کرنے کے لیے کچھ لوگ برسوں بعد لیے جارہے ہیں۔

لایعنیت .... یہ کیا مذاق ہے۔ برسوں بعد؟ وہ برسوں مردہ خانے میں رہا...اور

اس کے جاننے والوں کا رویہ مایوس کن تھا کہ اس کے جیتے جی سب نے اسے مردہ سمجھ لیا تھا.... اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ مردہ خانے میں تھا۔ سپرا کے لیے یہ امتحان کا لمحہ تھا کہ جب باہر فوجیوں کے بوٹ بج رہے تھے، ایک لڑکی نے مردہ خانے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ آہ، یہاں بھی ایک کہانی۔ شمال میں ڈوبتا سورج۔ اُفق کی سرخیوں کے درمیان ایک لڑکی جو ٹریگر دباتی ہے۔ ایک پولیس والا ہے، جو تیز چیخ کے ساتھ گرتا ہے اور کسی مردہ خانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔

’ایک بوڑھی عورت جو تمہاری ماں تھی۔‘ وہ کہتے کہتے رُکتا ہے.... گل بانو نظر اٹھاتی ہے۔

’ہاں وہ ہے اور صندوق ابھی بھی اس کے پاس ہے۔‘

’ہاں جیسا کہ تم نے بتایا، صندوق.... اور صندوق سے ایک نیا شہر برامد ہوا تھا تمہارے چکلہ گھر کی یادوں سے الگ کا شہر....‘

’ہاں....‘

’وہ کیا زندہ تھے؟‘

’ہاں، جیسا میں سوچتی ہوں....‘

آہ....‘ سپرا کے چہرے پر تلخیوں کی جھریاں آ گئی تھیں۔ تمہارے سوچنے کی بات نہیں۔ ہم صحیح مقام پر کب ہوتے ہیں؟ ہم سوچتے ہیں، ہم جاگ رہے ہیں، مگر ایسا نہیں ہوتا۔ ہم سوچتے ہیں کہ بیداری ہمیں چلنا سکھا رہی ہے جبکہ اس وقت ہمارے گھٹنے سوجے اور ٹوٹے ہوتے ہیں۔ ہم سوچتے ہیں کہ آنے والے کل میں ہمیں یہ کرنا ہے؟ کیا آنے والا کل ہے؟ کیا آنے والے کسی کل میں کسی گل فروش نے تازہ پھول رکھے ہیں۔؟ میرے خیال سے نہیں۔ یہ ہم ہیں جو سوچتے ہیں کہ آسمان کا رنگ نیلا ہے کیونکہ رنگوں کو یہ نام ہم نے دیا۔ نیلا پیلا سبز۔ آہ، سپرا گل



بانو سے مخاطب تھا... تم خوفزدہ لگتی ہو، اور ان ساعتوں سے ڈرتی ہو جس میں نان سینس، لایعنیت کے نئے پودے رکھ دیے گئے ہیں۔

’نان سینس کے نئے پودے.....؟‘

’ہاں۔ یہ وقت کی اضطرابی کیفیت ہے جو وقت انسانوں پر انڈیل دیتا ہے۔ پرانے کلینڈر کا چنگیز، پرانے کلینڈر کا ہلاکو، پرانے کلینڈر کا نادر شاہ اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ کبھی تھے، یہ ان پرانی ساعتوں میں لایعنیت کے سوکھے ہوئے پودے تھے، مرجھائے ہوئے۔ وقت پر ایک بار پھر دورہ پڑا ہے.... اور تم کو سمجھنا چاہیے کہ ہر کچھ برس بعد ایسا ہوتا ہے کہ جب وقت اپنی اضطرابی کیفیات میں انسان کو شامل کر لیتا ہے۔

’ہاں، یہ ممکن ہے.... صندوق میں برادے تھے۔؟‘

’برادے؟‘

’ہاں، پرانی مٹی کے، پرانے وقت کے۔‘

’.... اور ان برادروں میں تم تھی جبکہ تم فنون لطیفہ سے واقف تھی۔ لیکن لوگ یہ نہیں جانتے کہ فنون لطیفہ میں دلچسپی رکھنے والوں کے پاس بھی نان سینس کے مرجھائے ہوئے پودے ہوتے ہیں۔ ایک صندوق کھلا اور ایک عورت نکلی..... شی، ریٹرن آف شی۔ خیر، تم ان کتابوں سے واقف نہیں ہوگی۔ میں نے ان کتابوں کو پڑھا ہے۔ وہ ہزار برسوں کی عورت تھی اور سورج کی شعاؤں سے غسل کرنے کے بعد جوان ہو جاتی تھی.... وہ ایک ساحرہ تھی اور طلسم کی کلید اس کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ گل فروشوں کو آزماتی تھی.... اور جیسا کہ تمہاری ماں نے تم کو آزمایا..... تم کو صندوق کے حوالے کر دیا... ایک خوبصورت ذائقہ نان سینس کے پھول کا... اور ایک صندوق میرے پاس ہے جو کسی زمانے میں ریحانہ کے پاس تھا اور اب وہ تمہاری

قبر ہے۔ آہ، ایک دن زندہ جھیلیں پیچھے چھوٹ جاتی ہیں، ہم کھارے پانیوں میں کھڑے ہوکر تماشہ کرتے ہیں۔ اور یہ سوچنا دلچسپ ہے کہ مردوں کے گوشت ہمیشہ تازہ رہتے ہیں....اور یہ، کہ صرف دو صندوق نہیں ملتے، بلکہ ہر مردہ کی کہانی ایک جیسی ہے۔طلوع ہونا اور غروب ہونا۔

سپرا آہستہ سے بولا۔ میری ناک کی نلکیوں کے پاس کچھ پھنس گیا ہے۔ یہ میرا واہمہ بھی ہوسکتا ہے۔مگر جو پھنسا ہے، وہ گوشت کے ٹکرے جیسا ہے...اور ادھر مردہ خانے میں آنے کے بعد میں نے گوشت کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ یہ تمہارا فوجی ہوسکتا ہے، جس نے باغ میں تم پر ڈنڈے برسائے تھے....اور اس کے گوشت کا ایک ریشہ تم اپنے ساتھ لے کر اس مردہ خانے میں آگئی تھی۔ وہ ریشہ میری ناک کی نلکیوں سے الجھ گیا ہے۔ اور اس وقت میری ساری توجہ ناک کی نلکی پر ہے، کیونکہ اس سے میری سانسیں گھٹنے لگتی ہیں...اور ایسا اس وقت بھی ہوا جب ریحانہ کا جنازہ اٹھا تھا....سوگوار نم آنکھوں کے ساتھ بار بار میرے شانے پر ہاتھ رکھ رہے تھے اور یہ ہاتھ مجھے ضحاک کے سانپ جیسے محسوس ہورہے تھے۔ بعد نماز عشا چار پائی تھامے افراد جب کھدی ہوئی قبر کی جانب بڑھ رہے تھے، وہاں پہلے سے ایک مردہ موجود تھا۔

کھودی جانے والی مٹی کی تہوں میں سپرا نے خود کو دیکھا تھا اور یہ اس کی آنکھوں کا وہم نہیں تھا....اور جب ریحانہ کو قبر میں اتارا جارہا تھا اور یہ اس کا وہم نہیں کہ اس کی چادر میں اس کا لمس موجود تھا۔کفن کے اندر سے اس کی ایک انگلی باہر آگئی تھی۔ جو اشارہ کررہی تھی کہ قبر کی تہوں میں کوئی پہلے سے موجود ہے۔ ایک ناقابل یقین مگر سنسنی خیز لمس۔ وہ اس زندہ انگلی کے لمس کے ساتھ گھر لوٹا تھا اور اس وقت اس نے بی بی مریم کے مجسمے کو دیکھا تھا اور اس سرخ چیونٹے کو جو صندوق کے



پاس دیوار پر چڑھنے کی کوشش کررہا تھا۔

وہ سونے کی کوشش کررہا ہے تو وہ انگلی رقص کرتی ہوئی اس کے سامنے آجاتی ہے۔ وہ ایک برف کے قلعے کو دیکھتا ہے اور پھر ریحانہ کو۔ وہ قلعے کی فصیلوں پر کھڑی ہوئی مسکرا رہی ہے اور پھر اپنی چار انگلیاں دکھا کر کہتی ہے کہ ایک انگلی تمہارے لیے چھوڑ دی، کہ تم مردہ مچھلیوں کی طرح ساکت نہ رہو اور چاہو تو کسی خاتون کو گھر لے آؤ، جو میری طرح برف کے قلعوں میں قید نہ ہو۔

سپرا نے پہلے ایک صحرا دیکھا۔ پھر ایک خوبصورت مجسمہ۔ پھر اس پرندے کو دیکھا، جو یونانی داستانوں میں فینکس کے نام سے طویل عرصہ تک زندہ رہنے والا پرندہ ہے۔ جو سورج سے وابستہ ہے اور اپنی راکھ سے دوبارہ نمو حاصل کرتا ہے۔ جسے بی بی مریم نے ہاتھوں میں اٹھا رکھا ہے اور حضرت مسیح نے صلیب کو چومتے ہوئے فینکس کو دیکھا تھا اور کہا تھا کہ میں دوبارہ واپس آؤں گا۔

فینکس نے منہ سے شعلہ اُگلا....اور بھسم ہوگیا۔

سپرا نے دیکھا.....وہ دوبارہ زندہ ہوا، اس کے پنکھ عقاب کی طرح سونے کے ہیں۔ اس نے عیسیٰ مسیح کو صلیبوں کے درمیان دیکھا...حق کی نگہداشت کرنے والا باپ، جو دوبارہ موجوں سے اٹھا اور چوٹیوں پر برامد ہوا...اور اس وقت جب دنیا تباہی کی طرف جاچکی تھی۔

سپرا نے آہستہ سے دہرایا۔فینکس .....مسیح.....

فینکس نے دوبارہ شعلہ اُگلا اور غائب ہوگیا۔

اب اس کی نظروں کے سامنے ضحاک تھا۔ دو سانپ، جو اس نے دو دو بار دیکھے۔ زہر اُگلتے اور غائب ہوتے ہوئے....لیکن ضحاک کے دہانے سونے جیسے نہیں تھے۔

اس نے پھر محسوس کیا، اس کی سانس لینے والی نلکی کے پاس ایک ہڈی کا ٹکرا آ گیا ہے۔ تاہم وہ مطمئن تھا کہ یہ ٹکرا نکل جائے گا اور وہ پھر سے سانس لے سکے گا اور اگر نہیں بھی لے سکا تو کوئی بات نہیں کیونکہ وہ زندہ کب ہے اور وہ فینکس بھی نہیں ہے۔

سپرا نے گل بانو کی طرف دیکھا....

'کیا اس دن، اس دن جب باغ میں تم ڈنڈے کھا رہی تھی، کیا آسمان میں گدھ تھے؟'

'ہاں۔ میں نے ایسا ایک گدھ کیلی فورنیا کے نقشے میں دیکھا تھا۔ چونچ کے اوپر سانس لینے کے لیے دونوں جانب سوراخ ہوتے ہیں.... اور ان کی قوت شامہ بہت تیز ہوتی ہے....'

'ہاں اور شاید اسی لیے نظیرے، راٹھور تک نہیں پہنچا، بلکہ راٹھور نظیرے تک پہنچا... قوت شامہ.....'

سپرا نے پھر صلیبوں پر جھولتے مسیح کو دیکھا۔ لیکن ایک سیکنڈ میں منظر صاف تھا... اور سپرا نے گل بانو کے سفر کے بارے میں سوچا۔ ایک قحبہ خانہ.... چکلہ گھر.... اس نے ایک دھول اڑتی ہوئی سڑک دیکھی۔ سڑک کے آس پاس سے بدبو اٹھ رہی تھی۔ ٹھیک ویسی بدبو، جو اس نے پارلیامنٹ میں محسوس کی تھی جب وہ راجیہ سبھا کا ممبر تھا اور بلا روک ٹوک ایوان خاص میں آیا جایا کرتا تھا۔ وہ اس وقت قحبہ خانے کی تنگ گلیوں سے گزر رہا تھا اور اس کو شدت سے احساس تھا کہ گل بانو نے زندگی کے بہت سے اوراق اس سے چھپا لیے ہیں، وہ بھی ایک فینکس ہے، قحبہ خانے سے نکلی، ساؤتھ ایکس کے شاندار بنگلے میں چلی گئی۔ وہاں سے نکلی مردہ خانے میں آ گئی۔ تجدید حیات.....



نغمے جو مر جاتے اور دوبارہ جنم لیتے ہیں۔

... اور موت.... سپرا نے خیال کیا اور موت.... وقفۂ حیات جہاں سے ایک لایعنی دشت و صحرا کی شاہراہیں نظر آتی ہیں۔ دور گھنا دشت.... موت ایک لایعنیت کا سفر.... زندگی ایک غیر مبہم سفر کے ساتھ ہوتی ہے اور موت اس سے زیادہ غیر مبہم.... وہ لایعنیت کے صحرا میں ہے۔ سمندر غرقاب، نفوس غرقاب.... اور کہیں سراغ زندگی نہیں۔ حیات، عدالت کی پیشی.... یہاں قحبہ خانہ بھی عدالت اور اس کی زندگی.... تمام نفوس کی زندگی۔

لایعنیت، جو فینکس کی طرح بار بار شعلے اگل کر پیدا ہوتی ہے، مرتی ہے، پیدا ہوتی ہے.... اور حیات و موت کا سراغ نہیں ملتا۔

ساقی اور پیر مغاں... شمشیر و سناں... گل بانو اور وہ.... ایک متوازی سفر.... اور ایک پیشی میں اس نے ریحانہ سے کہا، پرندے اڑ گئے... اور ریحانہ نے کہا تھا، پرندے پھر واپس آئیں گے۔

اس دفعہ سپرا نے مجسمہ کی طرف دیکھا تو اسے ریحانہ کی شکل نظر آئی۔

آدم پرستی میں تمہاری دلچسپی ہے مگر تمہارا جمالیاتی حسن فینکس کی طرح آگ میں جھلس گیا۔

سپرا آہستہ سے بولا۔ کائنات کی افراتفری.... اور دشت لایعنیت....

کیا تمہاری چھلانگ یہیں تک ہے؟ مجسمہ نے دریافت کیا۔

ہم جسے آزادی سمجھتے ہیں، تصادم سمجھتے ہیں، بے آب و گیاہ ریگستان کے سوا کچھ بھی نہیں۔

یہاں کھجور کے درخت بھی ہوں گے، تلاش کرو۔

●●

مگر سپرا کو لایعنیت کے ریگستان میں کہیں بھی کھجور کا درخت نہیں ملا۔
وہ اب بھی بھٹک رہا تھا۔ دو روحوں کے درمیان
خانہ بدوشوں کے درمیان.........

## (2)

وہ تعداد میں کئی تھے اور انہیں جاننے والا کوئی نہ تھا۔ وہ خوش تھے کہ ضحاک آچکا ہے —— سانپوں کی زبان سے چنگاریاں نکلتی ہیں۔ وہ بہت سی باتوں سے خوش تھے....اور ان خانہ بدوشوں نے پورے شہر میں اپنے خیمے ایستادہ کردیے تھے۔ اب یہ شہروں شہروں پھیل چکے تھے۔ ایک قطار سے گاڑیاں تھیں جن میں سرد انسان رکھے ہوئے تھے۔ خانہ بدوشوں نے گاڑیوں کی قطار کو جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ مطمئن تھے۔ گاڑیاں گزر گئیں۔ اپنے ساتھ بے چین دنیاؤں کو بھی لے گئیں۔ تالاب کی گندی مچھلیوں کو بھی۔ تالاب کی مچھلیاں گندے پانی میں بہت تنہا ہوتی ہیں۔ آہ...ضحاک کی نوازشات....سڑک سے کسی گاڑی یا جیپ کے چلنے کی آواز آتی تو وہ ہوشیار ہوجاتے....ہوا جب ان خیموں کے قریب آتی تو گدھوں کی مہک بھی ساتھ لاتی۔ یہ گدھ کے پجاری تھے۔ گدھ واحد جانور جو بیابانوں میں موسیقی کا استحقاق رکھتا ہے۔ خیمے سے کافی فاصلے تک جھینگروں کی آواز ایک مخصوص قسم کا



ارتعاش پیدا کررہی تھی۔ بوڑھا خانہ بدوش زور سے ہنسا....اب موسیقی، فنون لطیفہ کا دور ختم....جنگل کی سریلی آواز زندگی کے لیے کافی ہے اب ان کی ضرورت نہیں۔

اس نے پلٹ کر دیکھا، کچھ خانہ بدوش سر جھکائے ہوئے خاموش تھے۔ وہ حیران ہوا اور استفسار کیا۔

تم لوگ ہنسے نہیں، مسکرائے نہیں۔ جواب نہیں دیا۔

زرد آندھیاں۔ خانہ بدوش ڈرے ہوئے تھے۔

’زرد آندھیاں؟‘ بزرگ خانہ بدوش نے دریافت کیا۔ کیا بولتے ہو....‘

’زرد آندھیوں نے سانپ پر حملہ کیا ہے۔ دیکھتے نہیں، سانپ غائب ہیں۔‘

’ہاں غائب ہیں۔ مگر سانپوں کا کیا۔ دوبارہ نمودار ہوجائیں گے۔‘

ایک کمزور خانہ بدوش نے بتایا....کوئی کہہ رہا تھا، ایک وائرس ہے، جو تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔

’ابھی بڑھا تو نہیں نا....‘ بزرگ خانہ بدوش ہنسا۔ بندروں کو کیلے کھلاؤ۔ طاقتور بناؤ۔ ابھی بہت سے مورچے فتح کرنے ہیں۔

ٹھیک اسی وقت کچھ خانہ بدوش آپس میں لڑ رہے تھے۔ یہ لوگ مذہبی محاذ پر گئے تھے اور انہیں پیسے نہیں ملے تھے۔ ایک مسٹنڈا، تگڑا خانہ بدوش ان سے الجھ رہا تھا۔ اس نے چیخ کر کہا۔ غدار مت بنو۔ اس دن سات جنوری تھی....اور سات جنوری کی تاریخ ملک کے کلینڈر سے نکال دی گئی ہے۔ اس دن تم کسی محاذ پر نہیں گئے۔

’مگر ہم گئے تھے۔‘

مسٹنڈے خانہ بدوش نے جرح کرنے والے کو زور کا طمانچہ لگایا۔ اور بولا......

ملک کے وفادار رہو۔ ے جنوری آیا ہی نہیں۔ سات جنوری کو کچھ نہیں ہوا۔ سات

جنوری سڑکیں خالی رہیں۔ سات جنوری گولیاں نہیں چلیں۔ سات جنوری کو گائے پوجن نہیں ہوئی۔ سات جنوری کو یگیہ نہیں ہوا۔ جو کہتا ہے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ وہ اربن نکسل وادی ہے۔ غدار ہے۔

بزرگ خانہ بدوش نے اعلان کیا۔ یہ ٹھیک کہتا ہے۔ ہمارے منتروں میں ہے کہ دن غائب ہوسکتے ہیں۔ ہمارے سدھ کیے گئے منتر سال مہینے دن کو غائب کرسکتے ہیں....اور یہ جو تعلیم ہے، یہ ہمیں برباد کررہی ہے....اور اسی لیے مغرب کے لوگ ہم پر بم پھوڑ رہے ہیں۔ وہ جاہل ہیں۔ وہ ہمارے منتر ودیا کو نہیں جانتے۔ منتروں سے کچھ بھی کیا جاسکتا ہے۔

ہوا میں دھول اڑ رہی تھی۔ کچھ نگاڑے بجاتے سادھو آئے اور خانہ بدوشوں کے پاس سے ہوکر گزر گئے۔

سپرا کو یہ منظر یاد تھا بلکہ کئی ایسے منظر یاد تھے۔ جب وہ گل بانو کی شاپنگ کرنے نکلا تھا۔ سڑک پر فوجی گاڑیاں اور آسمان پر گدھ۔ لیکن اس وقت لیٹے ہوئے وہ دو لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خود پارلیامنٹ میں رہا تھا۔ اس لیے ان کی گفتگو اس کے لیے بے مزہ نہیں تھی۔

ایک وہی گنجے سر والا۔ اور دوسرا داڑھی والا۔

داڑھی والا سنجیدہ تھا۔ ہم مصیبت میں آ گئے۔

’ہاں۔ اس بار غلطی ہوگئی۔‘

’تم اسے غلطی کہتے ہو۔‘

’میں نے شیر کو سیار سمجھ لیا۔‘

’یہ سیار کو شیر، مگر دراصل وہ لکڑ بگھا نکلا۔‘

’اڑالو، مذاق۔‘ گنجا سر والا ہنسا....مگر دیکھا، کتنے قرینے سے جواب دیا۔



’جواب دے کر ہی تو مصیبت میں پھنس گئے۔‘

’کے اس کو مصیبت کہتے ہیں؟‘

’شاید۔‘

داڑھی والے کی انگلیاں میز کے شیشے پر بج رہی تھیں....اور اس کی آواز اس وقت گھوڑوں کے منہ سے نکلنے والی ہنہناہٹ سے ہم آہنگ تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کیں، گنجے سر والے کو دیکھا۔

’مذہب....وہیں ہے جہاں ہم نے رکھا تھا۔‘

’ہاں۔‘

’اُہ... یہاں تک سب ٹھیک....اور بندر بھالو بھی ہمارے تھے....اور کاغذ کے ٹکڑے بھی بدل دیے گئے تھے۔ مگر دن....دن کا غائب ہونا.....؟‘

گنجے سر والا ہنسا۔ ’اس وقت کچھ اور سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں۔‘

’ہاں۔ تم کبھی کبھی آپے سے باہر ہوجاتے ہو۔ اس وقت دماغ سے کام نہیں لیتے۔‘

’دماغ نہیں طاقت چاہیے سر۔‘ گنجے سر والا ہنسا۔ ’دیکھیے، پریس کانفرنس کی۔ آپ کے جعلی سرٹیفکیٹ کو اصلی ثابت کرکے دکھایا، جبکہ پرانے وقت کے ٹائپ رائٹر بھی کہیں نہیں مل سکے....‘

’بندر..... وہ ہمارے لوگ تھے....‘ داڑھی والا سنجیدہ تھا۔ ’مگر دن.....دن کا غائب ہونا....کیا آپ سمجھ رہے ہیں۔ یہ کسی وہیل کا غائب ہونا نہیں ہے۔ ہمارے خلاف دستاویزات کا غائب ہونا نہیں ہے۔ کسی معزز بھالو کا غائب ہونا نہیں ہے۔ عدلیہ کا غائب ہونا نہیں ہے۔ ایک دن.... ۷ جنوری.... آپ نے غائب کردیا۔ بھگوان کو لے آئے....‘

’آپ بھی بھگوان بن جائیے....‘ گنجا سر والا اس بار سنجیدہ تھا۔ سادھوسنتوں والی داڑھی رکھ لیجئے۔ پیچھے پیپل کا پیڑ۔ ساتھ میں مور....مور کو دانہ کھلاتے ہوئے آپ....‘

’مورنیاں جنگل سے غائب ہوگئیں....‘

’کیا فرق پڑتا ہے۔ دن بھی غائب ہوگیا۔‘

’مگر عوام کو کیا جواب دیں گے آپ...؟‘

’سر یہ مجھ پر چھوڑیے....جواب مجھے دینا ہے...اور مجھ سے کوئی الجھنے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔‘

داڑھی والا سنجیدہ تھا۔’مگر عالمی ممالک؟ وہ پیچھے پڑ جائیں گے۔‘

’وہ پہلے سے ہی پیچھے ہیں۔ کیا بگاڑ لیا ہمارا؟‘

ہاں بندر، بھالو.... سب ہمارے ساتھ ہیں۔ مگر.....تیتر بٹیر، مرغابیاں .....آپ ناشتے کی میز پر ان کا انتظار کیجیے۔

●●

خیالستان کی وادیوں سے سپرا واپس آیا تو ہتھیلیوں پر کانٹے چبھ رہے تھے۔ وہ خیالستان سے گزرتا ہے اور جیسا کہ وہ کہانیاں لکھتے ہوئے گزرا کرتا تھا۔ اپنے کرداروں کے ساتھ اور جیسا کہ پارلیامنٹ میں اسے سر کٹے عوامی نمائندے نظر آتے تھے اور وہ خیالوں میں دیر تک ہنستا تھا۔ وہ اس دنیا میں سب کچھ دیکھ سکتا ہے...اور چونکہ وہ مر چکا ہے، اس لیے اسے یقین ہے کہ وہ سیر کرتے ہوئے کہیں بھی جا سکتا ہے۔ وہ پرانی عمارت کے ملبے کو دیکھتا ہے اور ریگستان میں اسے پانی کا جہاز نظر آتا ہے۔ آتش دان کے قریب اسے عبادت گاہیں نظر آتی ہیں اور پھر گنجے سروالے کا چہرہ چمکتا ہے۔ تیتر بٹیر اور مرغابیاں____ ذہن و دماغ میں دیر تک یہ



لفظ حرکت کرتے ہیں۔

سپرا کو یاد ہے، اس دن پولیس کے جانے کے بعد وہ مردہ خانے سے نکلا۔ مطلع صاف تھا۔ سورج چمک رہا تھا۔ سڑک پر سناٹا تھا۔ مگر فوجی گاڑیاں ایک قطار سے کھڑی تھیں۔ شمال کی طرف ایک قبرستان تھا جہاں ابھی بھی قبریں کھودی جارہی تھیں۔ مگر قیاس ہے کہ قبریں کھودنے کے بعد بھی کسی کو گھر، گھرانے اور خاندانی دستاویز حاصل نہیں ہو سکے تھے۔ غروب آفتاب سے قبل سپرا گھر لوٹنا چاہتا تھا۔ ایک مقام پر سپرا ٹھہرا۔ انقلاب، سانپ اور کاغذات پر گفتگو ہورہی تھی۔ یہ معلوم ہوا کہ ایک دن قبل کچھ انجان لوگ کاغذات کے ڈھیر میں آگ لگا رہے تھے۔ ان کے لباس فوجیوں جیسے تھے۔ ایک جگہ کچھ لوگ کھڑے تھے اور اخبار کی خبریں پڑھ کر ایک دوسرے کو سنا رہے تھے۔ سپرا کو علم ہوا کہ اب سانپ کا نام لینا جرم ہے اور عوام کو متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ ضحاک کا نام لینا بند کریں....اور جو کچھ انہوں نے دیکھا ہے، وہ خواب سے سوا کچھ بھی نہیں۔ سانپ دیواروں پر نہیں رینگتے۔ سانپ نہیں بولتے اور سیاست اب سے ایک مذہبی عقیدہ ہے اور مذہبی عقیدے پر چوٹ کرنے والا ملک کا غدار ہے۔ کیا سانپ کے پھن کٹ گئے؟ سپرا نے خیال کیا.... اور جیسا کہ اس کی آنکھوں نے خود دیکھا تھا، اسکرین پر ضحاک کے دو سانپ، تو کیا یہ صرف واہمہ تھا؟ حقیقت نہیں....اور وہ ایک لمبی نیند میں چلتا ہوا خواب دیکھ رہا تھا۔ مگر وہ گولیاں۔ وہ نوجوان وہ لڑکی جو کیمرے سے اس کی تصویر لیتے ہوئے خوفزدہ ہوگئی تھی...اس کی یادداشت اسے دھوکہ نہیں دے سکتی۔ وہاں ایک کارخانہ تھا۔ کنارے کچھ بوڑھی عورتیں تھیں۔ عورتیں اشاروں میں باتیں کررہی تھیں....اور وہ پُر اسرار بزرگ۔ اس دن سپرا نے بہت کچھ دیکھا۔ ان میں مزدور بھی تھے اور جس وقت سانپوں نے اپنا منہ کھولا تھا، دیوار پر ڈریگن کی تصویر روشن ہوئی تھی۔

ڈریگن....زہریلی بارش ڈریگن کے آنے کے بعد ہی ہوئی تھی۔ پھر سپرا نے ہزاروں کی تعداد میں گرتے بھاگتے مزدوروں کو دیکھا۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

گلک خالی ہے۔

دوسرے نے کہا۔ گلک کا کیا ہے۔ وہ پھر سے بھر لیں گے۔ مگر گلک ہمارے لیےنہیں ہے۔

اس وقت سپرا کا خیال تھا کہ بوٹ بجاتے ہوئے دو فوجی اس کی طرف جلتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ آگے بڑھا تو ایک جگہ ٹی وی چل رہا تھا۔ خبریں سننے کے لیے بہت سے لوگ جمع ہوگئے تھے۔ سپرا کا خیال تھا، زندہ لوگ، اداسی اور موت کی کیفیت پیدا کرنے میں ثانی نہیں رکھتے۔ کیا ان خبروں سے گزرے بغیر زندگی نہیں چل سکتی۔؟ کچھ لوگ عقاب پالتے ہیں۔ کچھ دنوں میں گدھ رکھنا فیشن بن جائے گا۔ اداسی اور موت کی کیفیت.... کیا ممکن ہے، کوئی لمحہ اس کیفیت کے درمیان آکر دیر تک فریز ہوگیا ہو۔؟ سپرا دیر تک مجمع کا حصہ رہا۔ اینکر چیخ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ ہوا میں لہرا رہا تھا۔ باکس میں مہمانوں کی تصویریں تھیں۔ اس وقت سب کی شکلیں بندروں جیسی لگ رہی تھیں۔ اس وقت ساری دنیا کے لیے سب سے بڑی خبر تھی کہ ہندوستان کی تاریخ سے ۷ جنوری کا دن غائب ہوگیا۔ اس سے پہلے بھی بہت کچھ غائب ہوا تھا۔ ایک ایجنسی کی خبر کے مطابق، بچے غائب ہوئے، روزگار غائب ہوا، عورتیں غائب ہوئیں۔ روٹی غائب ہوئی۔ ایجنسیاں غائب ہوئیں۔ اب ایک دن کا تاریخ سے غائب ہونا رہ گیا تھا۔ ایک امریکی اخبار نے لکھا۔ رامائن عہد میں یہ لوگ ہوائی جہاز بنا چکے تھے۔ اڑن طشتری پر جائیں اور ایک دن کو واپس لائیں ورنہ اس ایک دن سے ہندوستان کیا پوری دنیا کے کلینڈر الجھ جائیں گے۔



بڑی طاقتوں کے سربراہوں نے کہا، ملک دیوالیہ تھا، اب سربراہ بھی دیوالیہ ہوگئے۔ اینکر چیخ رہا تھا۔ سنیے۔ سنیے۔

’1992 میں، وینزویلا میں ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ ایک چارٹر طیارہ 57-DC4 مسافروں کے ساتھ اترتا ہے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ یہاں آنے والا طیارہ 37 سال پہلے ہی غائب ہوگیا تھا۔ دراصل طیارہ 1955 میں نیویارک سے میامی کے لیے روانہ ہوا تھا اور راستے میں کہیں غائب ہوگیا تھا۔ اس واقعہ کا ثبوت پائلٹ اور کنٹرل روم کے عہدے داروں کے مابین ہونے والی گفتگو سے بھی ہوتا ہے۔ کنٹرول روم عہدیدار کے مطابق،1955 کا کلینڈر بھی طیارے کے پائلٹ نے رن وے پر اتارنے سے پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ ملازم نے بتایا کہ اس نے ہوائی جہاز کو دیکھا اور پائلٹ کی آواز بھی سنی، حتی کہ اس پائلٹ کا جو کلینڈر بچا تھا وہ بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے باوجود ملازم کو اس کی باتوں کا یقین نہیں تھا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ پرواز کے لوگوں کو اب بھی یہی محسوس ہو رہا تھا کہ یہ 1955 کی بات ہے اور ابھی بھی سال1955 ہے۔ ہوائی ٹریفک کے باقی ملازمین نے بتایا کہ ان کا طیارہ بہت قدیم نوعیت کا تھا۔ ملازمین کو کچھ سمجھنے سے پہلے، وہ طیارہ دوبارہ اڑان بھرتے ہوئے کہیں آسمان میں غائب ہوگیا۔ ابھی تک کسی کو بھی اس واقعے کے بارے معلوم نہیں ہوسکا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ایک غیر مستحکم واقعہ ہے، ہوسکتا ہے کہ ہوائی جہاز ٹائم لوپ میں پھنس گیا ہو۔ وجہ کچھ بھی ہو، یہ واقعہ آج بھی لوگوں کے لیے ایک پہیلی ہے۔ جب 37 برس گم ہوسکتے ہیں تو ایک دن گم کیوں نہیں ہوسکتا——؟

سپرا نے دیکھا، اینکر کا چہرہ اچانک جھریوں سے بھر گیا۔ وہ ایک بن مانس لگ رہا تھا اور زور زور سے چیخ رہا تھا۔’ جب 37 برس غائب ہوسکتے ہیں۔ ایک طیارہ

جس نے 1955 میں میں اڑان بھری، وہ 1992 میں وینزویلا پہنچا۔ جب اتنا بڑا حادثہ ہوسکتا ہے تو پھر ایک دن غائب کیوں نہیں ہوسکتا۔؟ ہمیں اس وقت دنیا کی باتوں پر دھیان نہیں دینا ہے۔ ہمارے قدیم گرنتھوں میں کہا گیا ہے، کہ سوریہ، چندر ما ایک دن لُپت ہوجائیں گے۔ وقت ٹھہر جائے گا۔ وقت ایک دن کے لیے ٹھہر گیا۔ اس میں ہنگامہ کیسا؟ شور کیسا....؟'

ٹی وی پر اچانک گنجے سر والے کا چہرہ چمکا۔

گنجے سر والے کی آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ وہ چیخا.... سنیے.... سنیے۔ اگر آپ صحیح منتر جانتے ہیں تو کلینڈر سے دن تاریخ کو غائب کرنا بہت آسان ہے۔ غائب ہونے کے لیے کسی طلسمی چوزے کی ضرورت نہیں۔ 17 ویں صدی کی ایک کتاب ہے' دی بُک آف کنگ سولومین'۔ اس کتاب کو پڑھیے۔ آدمی تو کیا دن سال مہینے سب غائب ہوسکتے ہیں۔ یہ کتاب جس دانشور نے لکھی وہ زندگی کے آخری دس برس غائب رہا.... اور واپس آکر اس نے کہا، یہ دس برس کبھی آئے ہی نہیں۔ وہ زور سے چلایا۔ کمال کرتے ہیں۔ مجھ پر شک کرتے ہیں۔؟

اس نے آگے کہا..... فینکس ایک قدیم پرندہ ہے۔ یہ ٹام، ہیری پورٹر کی کتاب میں بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فنکس ۵ سو برس تک جی سکتے ہیں اور اپنی آگ سے خود کو جلا کر دن کو غائب کرتے ہیں۔ پھر 9 دنوں بعد وہ راکھ سے زندہ ہوجاتے ہیں۔

گنجے سر والے نے سر کو کھجلایا۔ سنیے۔ ایک زہریلا پودا ہے، فیڈرک۔ اس پودے سے آواز آتی ہے۔ ایسی آواز جو کسی بھی انسان کو پاگل بنا دیتی ہے۔ 18 ویں صدی میں اپنے کتے کے ساتھ جیمس ہارڈی نے اس پودے کی آواز سنی۔ اس دن بھی سات جنوری تھا۔ دن غائب ہوگیا۔ کچھ مریض کچھ برسوں کے لیے کوما میں چلے جاتے ہیں۔ جب آنکھ کھلتی ہے، ان کا دن اس وقت سے شروع ہوتا ہے۔



وہ ہنسا۔ اب دیکھیے کچھ برس پہلے 2015 میں راجیہ سبھا کی طرف سے ایک کلینڈر جاری ہوا۔ اس میں آئین سے دو لفظ سیکولر اور سماجوادی غائب ہوگیا۔ غائب ہوا نا؟ یہ قدرت کا قانون ہے، کبھی کبھی پتہ نہیں چلتا اور اچانک ہمارے درمیان سے لاکھوں لوگ غائب ہوجاتے ہیں۔ اینکر کے سوال کرنے پر گنجے سر والے نے، سر کھجلاتے ہوئے کہا، میں آپ کو کچھ اور مثالیں دے کر سمجھاتا ہوں'۔ اس نے زور سے کہا۔ ستمبر کے مہینے میں کتنے دن ہیں؟ آپ 30 کہتے ہیں اور بالکل صحیح ہے۔ لیکن اگر ہم آپ کو یہ بتائیں کہ تاریخ میں ایک ستمبر ایسا بھی تھا جس سے پورے 11 دن غائب ہوگئے تھے۔ تب آپ یقین نہیں کریں گے۔ لیکن یہ بالکل سچ ہے'۔ گنجے سر والا زور سے ہنسا۔ آگے بڑھنے سے پہلے ستمبر 1752 کے کلینڈر کو دیکھیں۔ کیا آپ نے ستمبر 1752 کے کلینڈر میں کچھ غیر معمولی بات دیکھی۔؟

' آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اس کلینڈر میں تاریخیں غلط ہیں۔ آپ نے اس میں کچھ دن کم دیکھا ہوگا۔ اب آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ اس میں کیا بڑی بات ہے؟ یا اس میں کیا دلچسپ ہے؟ یہ صاف طور پر نظر آتا ہے کہ یہ کلینڈر غلط طریقے سے چھپا ہوا ہے'۔

' لیکن بھائی لوگو، یہ دلچسپ بات ہے کہ یہ کلینڈر غلط پرنٹ نہیں کیا گیا ہے، آپ جو تاریخوں کو دیکھ رہے ہیں وہ غلط نہیں ہے۔ بلکہ یہ کلینڈر بالکل درست ہے۔ اگر آپ نہیں مانتے تو میں آپ کو اس کے پیچھے پوری کہانی سناتا ہوں' گنجے سر والا مسکرایا۔ ٹھہر ٹھہر کر اس نے کہنا شروع کیا۔

آیئے اب ستمبر 1752 کی دلچسپ تاریخ جانتے ہیں۔ ستمبر 1752 سے پہلے، رومن جولین کلینڈر برطانیہ میں تاریخوں کے تعین کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ رومن کیلنڈر رومنوں کے ذریعہ تیار کردہ ایک کیلنڈر ہے جو سینکڑوں سالوں سے

یورپ اور رومیوں کے ماتحت ممالک میں وقت کا حساب کتاب کرنے کا ایک ذریعہ رہا ہے۔ بعد میں 1582 میں ایک زیادہ مستند کیلنڈر وجود میں آیا جس کو گریگورئین کیلنڈر کہا جاتا ہے۔گریگورئین کیلنڈر کی ایجاد پوپ گریگوری بارہویں نے کیا تھا جو تاریخوں کے حساب کے لیے زیادہ مناسب سمجھا جاتا تھا۔انگلینڈ کے بادشاہ نے ستمبر 1752 سے تاریخوں کا تعین کرنے کے لیے اس کیلنڈر کے استعمال کی منظوری دی۔ رومن جولین کلینڈر کا وہ سال گریگورئین کیلنڈر سے 11 دن زیادہ تھا۔ چنانچہ انگلینڈ کے بادشاہ نے ستمبر 1752 میں، 11 دن تک کم کرنے کا حکم دیا اور اسی وجہ سے، ستمبر 1752 میں، 14 تاریخوں کو دوسری تاریخ کے بعد براہ راست دیکھا جاسکتا ہے لیکن 1752 کی دلچسپ تاریخ یہاں ختم نہیں ہوتی ہے۔گنجے سر والا ایک لمحہ کو رُکا۔ پھراس نے کہنا شروع کیا۔

’ستمبر 1752 میں، 11 دن کم تھے، رومن جولین کیلنڈر میں، نیا سال اپریل میں شروع ہوا تھا اور نیا سال یکم اپریل کو منایا گیا تھا۔لیکن گریگورئین کیلنڈر میں جنوری کو پہلا مہینہ سمجھا جاتا تھا اور اسی کے مطابق نیا سال یکم جنوری کو منایا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ گریگورئین کیلنڈر میں تبدیلی کے بعد بھی، بہت سارے لوگوں نے اپنی پرانی روایت کو نہیں چھوڑا اور یکم اپریل کو نیا سال سے گیارہ دن غائب ہو گئے...اور آپ ایک دن کے غائب ہونے پر اچھل کود کر رہے ہیں۔‘

گنجے سر والے کا چہرہ غائب تھا اب اس کی جگہ پوری اسکرین پر اینکر کا چہرہ حاوی تھا۔ اینکر بتا رہا تھا۔ سنیے۔ سنیے—— دونوں کلینڈروں کے مابین بنیادی فرق یہ ہے کہ جولین کیلنڈر کے مطابق ایک سال کو 365.25 دن سمجھا جاتا ہے جبکہ حقیقت میں یہ 11 منٹ کم ہوتا ہے۔ 11 منٹ کے اس خلا کو دور کرنے کے لیے، جولین کیلنڈر میں ہر 129 سال بعد 1 توسیع کی جاتی ہے۔لیکن اس کے



سبب تہواروں اور موسموں سے وابستہ دنوں کی صحیح تاریخ کا حساب لگانے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے نتیجے میں، پوپ گریگوری نے ایک نیا کیلنڈر تشکیل دیا جو آج کل پوری دنیا میں چلتا ہے۔

’گریگورئین کیلنڈر 1582 میں متعارف کرایا گیا تھا،لیکن 300 سے زیادہ سالوں کے بعد اسے مختلف ممالک نے اپنایا...اور اب یہ کیلنڈر سب سے زیادہ استعمال ہوتا ہے۔آج ،آپ اور ہم جس کیلنڈر کی تاریخ کو دیکھنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں وہ گریگورئین کلینڈر ہے۔‘ اینکر ہنسا——

’جب ہلاکو خان کا لشکر بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا رہا تھا تو بغداد کے علماء جامع مسجد کے صدر دروازے پر اس بحث میں الجھے ہوئے تھے کہ کوا کو کھانا حلال ہے یا حرام۔ آپ اسی طرح کی بحث میں الجھے ہوئے ہیں۔اور سنیے شمسی سال اس عرصے کے برابر ہوتا ہے جس میں زمین اپنے مدار کو پوری طرح طے کر لیتی ہے۔یعنی پوری طرح سورج کے گرد چکر کاٹ لیتی ہے۔یہ عرصہ 365 دن 5 گھنٹے، 40 منٹ اور 4624 اعشاریہ 47 سیکنڈ کے برابر ہوتا ہے۔ ہم چونکہ سال کو صرف 365 دنوں کا شمار کرتے ہیں اس لیے ہمارا سال اصل سال سے چھوٹا ہوتا ہے اور یہ کمی سال بہ سال زیادہ ہوتی جاتی ہے۔نتیجہ یہ کہ سال بہ سال وہی مہینے مختلف موسموں میں آنے شروع ہو جاتے ہیں جس سے ہمارے نظام زندگی میں گڑ بڑ ہو جاتی ہے....اور وقت کا بھی کوئی اندازہ نہیں ہو پاتا ہے۔ اس وقت کو رفع کرنے کے لیے جولیس سیزر شہنشاہ روم نے ہر چوتھے سال میں ایک دن کا اضافہ کر کے ہر چوتھا سال 366 دن کا استعمال کیا۔یعنی فی سال 1/4 دن کی مزید زیادتی ہوگئی۔ باالفاظ دیگر اس قسم کا سال صحیح سال سے بقدر 11 منٹ 14 سیکنڈ اوسطاً بڑھ جاتا ہے۔یعنی 1/4 دن فی سال زیادہ کرنے سے ہم اصل

سال سے 11 منٹ 14 سیکنڈ بڑھا دیتے تھے۔ یہ زیادتی 100 سال میں جمع ہوکر ایک دن کے قریب ہوجاتی تھی۔

اینکر نے زور سے کہا۔ اب آگے مت پوچھیے۔ دن کا غائب ہونا کوئی کرشمہ نہیں ہے۔ دن پہلے بھی غائب ہو چکے ہیں۔

●●

اس علاقہ میں بندر زیادہ تھے۔ بندروں نے کیلے والے کی دکان پر حملہ کیا تھا۔ سپرا کی نگاہ بندروں کی طرف گئی۔ اس وقت اسے چاروں طرف بندر نظر آرہے تھے۔ سپرا نے بندروں کی طرف سے توجہ ہٹائی۔ اسے احساس نہیں تھا کہ اس سے قبل بھی دن غائب ہو چکے ہیں۔ گنجے سر والے کی جگہ اب بھی اینکر کا چہرہ چمک رہا تھا۔ سپرا کو اینکر کے چاروں طرف بھی بندر نظر آرہے تھے۔ اینکر کہہ رہا تھا۔

...اور چونکہ زمین سورج کے گرد گردش کرتی ہے اس لیے موسموں کی تبدیلی کا انحصار بھی زمین اور سورج کی اس گردش کے رشتے پر ہوتا ہے، اس لیے اگر ہر سال 365 دن رکھیں تو ہر سال چوتھائی دن کا فرق پڑنے لگتا ہے اور کیلنڈر موسموں سے دور ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ اسٹالن اور لینن کے وقت بھی ایک دن غائب ہوا تھا اور جب ہماری ویدک کتابیں اور بھگوان اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ دن غائب ہوسکتا ہے تو اس بات کو تسلیم نہ کرنا ملک سے غداری ہے۔'

'واہیات'، حزب مخالف کا چہرہ ابھرا۔ کہاں باشویک انقلاب اور کہاں ۷ جنوری۔ گنجے کے پاس بھگوان آگئے۔ واہیات۔'

کمیونسٹ پارٹی کا ایک لیڈر کہہ رہا تھا۔ 'ملک معاشی بحران سے دوچار ہے۔ اور آپ نے کیلنڈر سے ایک دن غائب کردیا۔ آپ اس کا مطلب بھی جانتے ہیں۔ پورے ہندوستان میں زلزلہ آچکا ہے۔'



واہیات۔ سپرا نے بندروں کی طرف دیکھ کر کہا.....

●●

سپرا نے دیکھا، گل بانو جاگی ہوئی تھی اور اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہی تھی۔ سیاہ قبر... اور قبر کے اوپری حصے پر ایک مردہ وجود۔ سپرا کو یہ قبر کا تصور پسند آیا تھا اور اسی لیے اس وقت اسے گل بانو سے ہمدردی ہو رہی تھی۔ اس نے اس خیال کو جھٹک دیا کہ موت کی کوہستانی وادیوں میں ہمدردی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوسکتی ہے۔ اس کا قیاس تھا کہ نغمۂ لایعنیت میں اب وہ آواز کھو رہی ہے جو کدال، پھاوڑے کی آوازوں اور شہر خموشاں سے ابھری تھی۔ تو کیا زمینوں سے دستاویز نکالنے والا چلے گئے یا انہیں شہر خموشاں کا طوفان اپنے ساتھ بہا لے گیا۔؟

سفید چادروں کی سرسراہٹ سے ایک عجیب سی موسیقی کمرے میں پیدا ہو رہی تھی۔ سپرا نے سفید چادر کی طرف دیکھا تو دیوار گریہ سے ایک زندہ سانپ بل کھاتا ہوا باہر نکل رہا تھا۔ اسے وہ یہودی یاد آئے جو ہزاروں برسوں سے تعمیر داؤد کی طرف منہ کیے رویا کرتے تھے۔ ٹھیک اسی لمحہ اس نے آہٹ سنی اور گل بانو کو دیکھا، جس کا چہرہ چادروں کی دودھیا روشنی میں سیاہ پڑ گیا تھا....

'میں نے چادریں ہٹا کر کھڑکی کے باہر تو دیکھا تو آسمان میں ایک بڑا سا ڈریگن تھا...'

'ڈریگن...'

'ہاں... اور وہ لہراتا ہوا اسی طرح رو رہا تھا جیسے زائرین رویا کرتے ہیں...'

'زائرین؟'

'مقدس عبادت گاہوں میں جانے والے.... میں خود حضرت نظام الدین اولیا

کی چوکھٹ چومتے ہوئے کتنی بار روئی ہوں۔'

'رونے کی آواز بھی ہے....اور...تم نے کچھ محسوس کیا؟'

'کیا....؟'

'عجیب سی بو ہے.... یہ بو ڈریگن کے نغمہ سے تو نہیں پیدا ہوئی۔؟'

سپرا نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ ہوا میں حبس ہے۔ایک مدت سے یہ کمرہ بند ہے۔ کھڑکی سے روشن دان تک سب بند، پھر یہ بو کہاں سے آرہی ہے؟ ڈریگن جو لہراتا ہوا آسمان پر نمودار ہوا اور غائب ہوگیا۔ابھی کچھ دن پہلے ہی اس نے محسوس کیا تھا کہ کوئی وائرس ہے جو ہوا میں تحلیل ہونا چاہتا ہے۔ اس نے سڑک پر زندہ مردوں کو دیکھا تھا، جو تیزی سے بھاگ رہے تھے اور قیاس تھا کہ یہ بو سانپوں کے زہریلے ہونٹوں سے پیدا ہوئی ہے۔

وہ ایک نہ ختم ہونے والی رات تھی اور اب اس رات میں ڈریگن بھی آگیا تھا۔ سانپوں اور سادھوؤں کے ملک میں ڈریگن....اس نے سرسراتی چادروں کے درمیان محسوس کیا کہ مجسمہ والی عورت اس کی طرف غور سے دیکھ رہی ہے۔

سپرا کافی دنوں بعد گھر سے باہر نکلا۔ وہی سفید کفن اس کے جسم پر تھا، جس میں اکثر اسے دیکھنے والے یا تو اسے پاگل سمجھتے یا سادھو۔اب وہ زیادہ دنوں کے لیے گھریلو سامان لے آیا کرتا تھا۔باہر نکلنے کے بعد اسے بے اطمینانی کا احساس ہوا۔ سڑکوں سے گرد اڑ رہی تھی اور عجب سی ویرانی نے شہر پر شب خون مار رکھا تھا۔ شاید مجھے ہشیار ہوجانا چاہیے۔ اس نے جماہی لی اور پھر سڑکوں کی طرف دیکھا۔ کچھ دور چلتے ہوئے اس نے قبرستان کی طرف دیکھا۔ اسے تمام قبریں کھدی ہوئی نظر آئیں۔ دو ایک لوگ تھے جو درختوں کے گرے ہوئے سوکھے پتوں میں کچھ



تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دکانیں کھلی تھیں مگر چاروں طرف اسے نامعلوم دیواریں نظر آئیں جیسے شہر کو مسلح دستوں نے حصار میں لے رکھا ہو۔ یہ پہلی دفعہ تھا، جب اسے ایک عجیب سی بو کا احساس ہوا اور ایسا لگا جیسے بو اس کے ساتھ ساتھ چل رہی ہو۔ پہلے اس نے وہم تصور کیا، پھر بو کا سراغ لگانے کی کوشش کی تو معلوم ہوا، یہ بو اس کے جسم سے آرہی ہے اور یہ وہی بو ہے جو عام طور پر مردوں کے سرد جسم سے نکلتی ہے۔اورر یہ بو اس نے سرد خانے میں بھی محسوس کی تھی۔مگر اس وقت یہ بو اس کے جسم سے نکل رہی تھی اور سپرا کو یہ خیال بھی آرہا تھا کہ جیسے کسی کمرے میں اگر نعش کئی دن سے پڑی ہو تو بو پھیلنے لگتی ہے۔اس نے ایسی کئی مثالیں سنی تھیں کہ فلاں گھر میں کوئی بزرگ رہتا تھا اور جب دو تین دنوں تک وہ ادھر ادھر آس پاس دکھائی نہیں دیا تو ہمسایوں کو اس کے دروازے سے نکلتی ہوئی بو کا احساس ہوا۔ دروازہ توڑا گیا تو بزرگ کئی دنوں کا مردہ پایا گیا۔اس نے اس عورت کے بارے میں بھی سنا تھا، جس کے بچے اسے اکیلا چھوڑ گئے تھے اور ایک ماہ تک اس کے گھر کا دروازہ بند رہا۔عورت کے جسم سے اٹھنے والی بو اس قدر تیز تھی کہ ایمبولینس کے عملہ نے اٹھانے سے انکار کر دیا۔ بہت سمجھانے کے بعد ماسک لگا کر یہ عملہ لاش لے جانے کو تیار ہوا۔

تو یہ بو اس کے ساتھ ہے....اور اس کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے اور اس سے قبل یہ بو اس نے محسوس نہیں کی۔کبھی کبھی سپرا عجیب وغریب قیاسات کے قریب ہوتا ہے۔مثال کے لیے اس وقت اس نے محسوس کیا کہ اس کے جسم سے نکلنے والی بو کو آکٹوپس کا جسم مل گیا ہے اور اس وقت ایک بڑا سا آکٹوپس اس کی سفید چادر کے ساتھ گھسٹتا ہوا زمین پر چل رہا ہے۔ وہ مردہ ہے اور اس کے قیاسات کچھ بھی ہوسکتے ہیں۔لیکن کیا مردے سوچتے ہیں؟ ان انجانی دنیاؤں میں پہنچ کر، جس کے

بارے میں کوئی واقف نہیں۔؟ کیا وہاں بھی جسم سے نکلنے والی بو مردے کے ساتھ جاتی ہے۔؟ ایک لمحہ کے لیے ڈریگن آسمان میں پھر چمکا اور سرعت کے ساتھ غائب ہوگیا۔

کچھ تماش بین جمع ہوگئے تھے... اور سپرا کے ساتھ چلنے ولا آکٹوپس ٹھہر گیا تھا۔ تماش بین آسمان کی طرف نظریں اٹھائے آپس میں باتیں کررہے تھے۔

ڈریگن....

نہیں سانپ....

نہیں کینچوا....

نہیں ڈریگن....اور یہ چوتھی دفعہ ہے۔

سپرا نے دیکھا، وہ بزرگ دوبارہ نمودار ہوگئے تھے۔ اور وہ تماش بینوں سے مخاطب تھے۔ تم نے سنا نہیں، ڈریگن نے ہماری آسمانوں کی زمین پر قبضہ کرلیا ہے؟

آسمانوں کی زمین؟

'ہاں، ہر ملک کا اپنا آسمان ہوتا ہے....اور یہ میں نہیں کہہ رہا۔ تم لوگ اخبار تو پڑھتے نہیں۔ ٹی وی بھی نہیں دیکھتے۔ ڈریگن نے آسمانوں کی زمین پر کمند ڈالی ہے اور وہ دیکھو....نیلے آسمان کا وہ حصہ...مخصوص حصہ۔ نہیں... وہ بادل نہیں، ہماری زمین ہے، جو غائب ہوگئی...اور یہ سربراہان ملک کا اعتراف ہے۔ اور یہ میں نہیں کہہ رہا۔

ایک شخص نے دریافت کیا۔ لیکن؟ لیکن آسمانوں سے ہماری زمین کیسے غائب ہوسکتی ہے؟'

بزرگ مسکرایا۔ غائب تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ جیسے دریا غائب ہوگئے۔ سرنگیں غائب ہوگئیں، فائلیں غائب ہوگئیں۔ دستاویز غائب ہوگئے۔ اور آسمانوں سے



ہماری زمین غائب ہوگئی....دن غائب ہوگیا۔'

ایک نوجوان نے لقمہ دیا۔ جیسے کسان غائب ہوگئے۔ فصلیں غائب ہوگئیں۔

سپرا نے ایک فوجی ٹرک کو دیکھا۔ اس ٹرک میں سے کچھ فوجی نکلے۔ ان میں سے ایک آگے بڑھا اور وہ اس نوجوان کو کھینچتا ہوا ٹرک تک لے گیا۔ نوجوان چیخ رہا تھا۔ فوجی نے جاتے ہوئے سپرا اور اس کے کی طرف دیکھا تھا مگر اب ٹرک دھول چھوڑتا ہوا نظروں سے غائب تھا۔

بزرگ نے آہستہ سے کہا، ہماری تمام باتیں ریکارڈ ہورہی ہیں...اور ہمارے جسم سے نکلنے والی بو سلطنت اور حکام کے کتے آسانی سے سونگھ لیتے ہیں اور پھر وہ ہم تک پہنچ جاتے ہیں۔

اس دن سپرا نے جگہ جگہ مظاہرہ کرنے والوں کو دیکھا۔ لیکن وہ جسم اور شکل وصورت سے اس قدر کمزور نظر آرہے تھے کہ ان سے کسی طرح کے نقصان یا بغاوت کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔ ان کے چہروں سے ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ فاقہ کش اور لاغر نظر آرہے تھے اور کسی حد تک شکست خوردہ۔ ان کے سائن بورڈ ٹھیک سے پڑھے نہیں جارہے تھے اور وہ کس قسم کے نعرے لگا رہے ہیں، ان نعروں کو سننا بھی آسان نہیں تھا کیونکہ ان کے منہ سے جو آوازیں نکل رہی تھیں، وہ کیڑوں سے مشابہت رکھتی تھیں۔ جیسے سپرا نے کئی بار درختوں کے درمیان جھینگروں کو بولتے ہوئے سنا تھا۔

کمزور آوازیں.....

مگر سپرا کو اس بات کا احساس ہوچکا تھا کہ سورج کی شعائیں زرد رنگ اختیار کرچکی ہیں اور شہر کی فضاؤں پر سراسمیگی طاری ہے اور اس وقت زیادہ تر لوگ اپنے

گھروں میں بند ہیں.....اور چاروں طرا یک عجیب سی بو پھیلی ہوئی ہے اور ایک بو اس کے جسم کا حصہ ہے، جیسے آکٹو پس اٹھائے ہوئے اس کے پیچھے چل رہے ہیں۔ ان گنت، بے شمار آکٹو پس.....وہ ایک جگہ ٹھہرا۔ ذرا دور ہائی وے والی سڑک تھی اور سڑک کے بائیں جانب لہلہاتے ہوئے کھیت ہوا کرتے تھے۔مگر کھیت غائب تھے۔ان کی جگہ بیرک بنے ہوئے تھے.....اور بدبو وہاں سے بھی آرہی تھی۔سپرا کو یاد تھا کہ ان دنوں جب وہ گاؤں میں تھا اور گاؤں کی ہریالی سے لطف اندوز ہورہا تھا، وہاں ایک مویشی فارم سے بو کا طوفان نکلا اور ہوا میں پھیل گیا۔گوبر کے کیڑوں سے بھی بو نکلتی ہے اور مخصوص کیڑے مویشی فارم میں جس گوبر کے ڈھیروں میں دفن تھے، یہ بو وہاں سے اٹھتی ہوئی پورے گاؤں کے نظام کو بیمار کررہی تھی۔سپرا پیچھے چلنے والے آکٹو پس کو دیکھ کر ہنسا.....انسان اربوں کھربوں قسم کی بو سونگھ سکتا ہے اور جیسا کہ اس کے دوست کا خیال تھا کہ آپ دنیا کو کس نظر سے دیکھتے ہیں، بو اس کے خیال پر بھی اثر ڈالتی ہے.... اور اس نے سنا تھا کہ سانس کی بو سے شخصیت کی شناخت ممکن ہے۔

سڑک ویران تھی اور ایک جگہ سپرا کو رکنا پڑا بلکہ دیوار کے سایے میں چھپ جانا پڑا۔ ایک قطار سے ٹرک کھڑے تھے...اور کمزور، مضمحل، بیمار انسانوں کی فوج تھی، جنہیں ٹرک میں سوار کیا جارہا تھا۔اسے یاد آیا، اس قطار سے ایک میل کے فاصلے پر ایک حکومتی اسپتال ہے...اور وہاں ایک سردخانہ بھی ہے۔اس سردخانے میں وہ دو ایک بار جاچکا ہے۔اسے اب بھی اس سردخانے کا نیم تاریک کمرہ یاد تھا۔ برف کی سی خنکی خون کو جما رہی تھی۔رگ و پے میں لہو کو منجمد کیے دے رہی تھی۔ اندھیرا اور اندھیرے کی چادروں کے درمیان سفید کفن میں ملبوس ٹھنڈے جسم.... اور کمرے میں کافور کی مہک۔ان کمروں میں ملازم شب و روز لاشوں اور فضا میں پھیلنے والی بو



کے ساتھ گزارتے ہیں۔کبھی کبھی کسی مردے کا چہرہ بہت بھیانک لگتا ہے۔سپرا کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔اس وقت وہ بھی بھیانک لگ رہا ہے۔ بڑھی ہوئی داڑھی اور یہ لباس۔وہ دیر تک سڑکوں پر ادھر ادھر گھومتا رہا۔کچھ ضروری خریداری گل بانو کے لیے کی۔ کچھ پیسے گھر کی ضروریات کے سامان پر خرچ کیے۔سورج غروب ہورہا تھا اور آکٹو پس اس کی سفید چادروں کا کونہ تھامے چل رہے تھے۔یہ دن بے حد خاص رہا اور کچھ ایسی بھی تفصیلات اس کے پاس تھیں، جس سے گزر کر فکر کی شاخیں دور تک چلی جاتی تھیں۔اس نے دیکھا تھا، بیشمار افراد اب بھی کھدائیوں میں مصروف ہیں...اور کچھ تھک ہار کر قبر نما گڈھوں میں آرام کے لیے سو بھی جاتے ہیں۔اس یقین کے ساتھ کہ یہاں ان سے ملنے کوئی نہیں آئے گا۔ سڑک پر چلنے والے ڈھانچے میں تبدیل تھے اور اسے یقین تھا، کھدی ہوئی قبروں سے مردے نکل نکل کر سڑکوں، شاہراہوں پر گھوم رہے ہوں گے۔

وہ گھر آگیا۔گھر آنے سے پہلے ادھر ادھر دیکھا ایک سفید کاغذ نظر آیا۔یہ بجلی کا بل تھا۔اس نے بل ہاتھوں میں لیا۔اسے احساس تھا کہ بل مہینوں سے جمع نہیں کیا گیا۔کسی دن بجلی والے بھی دھمک سکتے ہیں۔یا ممکن ہے، باہری حصے میں تالہ بند دیکھ کر لوٹ گئے ہوں۔گھر میں روشنی نہیں، مگر فریج تو ہے۔بجلی کا بل کہیں نہ کہیں انسانی زندگی سے وابستہ ایک واقعہ ہے کہ ایک گھر ہے اور اس گھر میں روشنی ہے۔ اس نے مین سوئچ آف کیا ہے لیکن اب اسے بجلی کٹوانی پڑے گی۔اس نے دروازے پر ادھر ادھر دیکھ کر دوبار دستک دی۔ دروازہ کھل گیا۔ وہ اندر آگیا۔اس نے گل بانو کی طرف دیکھا۔سفید سرسراتی چادروں کے درمیان اسے ایسا لگا جیسے گل بانو دیر تک روتی رہی ہو۔اس کی آنکھیں نم اور سوجی ہوئی تھیں تاہم اس نے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔

سپرا نے پانی پیا اور اپنی قبر والی جگہ آ کر لیٹ گیا۔مجسمے والی عورت اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔مگر اب وہ پچھلی تمام کڑیوں کو جوڑنا چاہتا تھا...اور سب سے دلچسپ تھا، اس گنجے آدمی کا بیان، جس نے اپنی دلیل سے ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ دن غائب ہو سکتے ہیں۔اس سے قبل اس نے الفاظ کو غائب کرنے کا کرشمہ کیا تھا پھر جملوں کو غائب کر دیا....اور اب اس صدی کا سب سے بڑا حادثہ، اس نے دن غائب کر دیا تھا۔کیونکہ بھگوان آئے تھے....اور یہ بات قدیم گرنتھوں میں بھی لکھی ہے کہ دن غائب ہو سکتے ہیں۔

'تم نے کچھ کھایا؟' اس نے گل بانو سے پوچھا۔

'نہیں۔'

'کوئی بات نہیں۔مردوں کو بھوک نہیں لگتی۔'

گل بانو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

سپرا کو جواب کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

اس نے آنکھیں بند کیں اور سارے دن کے واقعات اس کی نظروں کے آگے گھوم گئے۔دن کے غائب ہونا نے پورے ملک میں ہنگامہ مچا دیا تھا۔ ۷ جنوری، ملک بھر میں گیارہ لاکھ ستاون ہزار چار سو باسٹھ بچے پیدا ہوئے۔مختلف ریاستوں، شہروں، قصبوں میں۔مگر ڈاکٹروں نے برتھ سرٹی فکیٹ دینے سے انکار کر دیا....اور کہا بچے پیدا نہیں ہوئے۔

'مگر بچہ تو ہے.....!'

'نہیں ہے۔'

'یہ دیکھیے.....یہ آپ کا ہی اسپتال ہے۔'



'یہ چھ جنوری کو پیدا ہوا....'

'بالکل بھی نہیں....۷ جنوری....'

ڈاکٹر مطمئن تھے۔سات جنوری کیلنڈر میں نہیں ہے۔اس لیے سات جنوری کسی کی پیدائش نہیں ہوئی۔

کچھ لوگوں کی دلیل تھی کہ ایک دن بعد بچہ پورے ایک دن کا ہو چکا ہوتا ہے اس لیے سات جنوری کا ہی برتھ سرٹی فکیٹ چاہیے۔

ڈاکٹروں نے ہاتھ اوپر کر لیے۔ناممکن۔۷ جنوری کو پیدا بچے انسان تسلیم نہیں کیے جائیں گے۔مذہب اور قدیم رسموں سے اور بھگوان سے دشمنی نہ مول لیجیے۔

بچوں کی پیدائش کو لے کر بھگوان اور انسان سامنے آ گئے تھے۔گیارہ لاکھ سے بھی زیادہ بچے پیدا ہوئے تھے، ان میں لاکھوں ایسے تھے جو اپنے بچے کی پیدائش کے لیے چھ جنوری یا آٹھ جنوری کی تاریخ نہیں چاہتے تھے۔اس سے زیادہ دلچسپ معاملہ اموات کو لے کر سامنے آیا۔۷ جنوری پورے ملک میں اٹھارہ لاکھ سے زیادہ افراد کی موت ہوئی تھی۔

ڈاکٹروں نے صاف طور پر کہہ دیا۔۷ جنوری۔وہ مر ہی نہیں سکتے۔

'پھر وہ کہاں گئے۔'

'غائب ہو گئے۔'

'ایسے کیسے غائب ہو گئے۔؟'

الگ الگ مذاہب کے لوگ۔الگ الگ رسمیں۔آخری رسومات کو لے کر اور ڈیتھ سرٹی فکیٹ کو لے کر ڈاکٹروں کی ایک ہی رائے تھی۔۷ جنوری کا سرٹی فکیٹ نہیں مل سکتا۔

ان میں بیشمار ایسے تھے جنھوں نے بھگوان کی کرپا سمجھ کر زندگی اور موت

دونوں کوتسلیم کرلیا تھا مگر ایسے بھی تھے جو غائب ہونے یا نہیں پیدا ہونے کی بات ماننے کو قطعی تیار نہیں تھے۔ ۸ جنوری پورے ملک میں ہنگامے کو دیکھتے ہوئے فوج صف آرا ہوئی۔ پولیس حرکت میں آئی اور نافرمانی کرنے والوں، ملک سے غداری کرنے والوں کو جیل کی سلاخوں میں ڈال دیا گیا۔ یہ بھی قیاس ہے کہ جن ریاستوں میں ڈیٹنشن سینٹر بن چکے تھے، کچھ غداروں کو ڈیٹنشن سینٹر کے حوالے کردیا گیا۔اس وقت ۷ جنوری کو لے کر ایک بڑی آبادی بے بسی کا شکار تھی۔ لین دین معاہدے جو ۷ جنوری کو ہوئے، سب التوا میں چلے گئے۔ بینک سے جن لوگوں نے ۷ جنوری کو قرض لیا، وہ مکر گئے کہ قرض تو لیا ہی نہیں۔ یہی سلوک بینک والوں نے ان لوگوں کے ساتھ کیا، جن لوگوں نے ۷ جنوری رقم جمع کرائی تھی۔ چھوٹے چھوٹے تاجر برباد ہوگئے۔ لیکن ان کی سنوائی کہیں بھی نہیں تھی۔ عدلیہ بھی ۷ جنوری کے معاملات کو لے کر خاموش تھی۔ دیگر شعبوں سے وابستہ ہزاروں ایسے معاملات تھے، جسے فقط ایک دن نے الجھا کر رکھ دیا تھا۔ ایک دن کے اثرات روزگار کے شعبے میں دیکھے گئے۔ آٹو موبائل سیکٹر میں بھی واضح طور پر اس ایک دن کا اثر نظر آیا۔ لاکھوں افراد کی زندگی داؤ پر لگ گئی۔ ایک دن نے معیشت کی کمر توڑ دی۔ بے روزگاری کا خطرہ بڑھ گیا۔ نئی ملازمتوں کا حصول بھی کم ہوتا ہے۔ لوگوں کو ملازمت سے برطرف کرنے کا عمل بھی شدت اختیار کرگیا۔ تجارت پر اثر پڑا۔ کاروبار، ہوٹل، ٹرانسپورٹ کو بند کردیا گیا۔ ملک کی معاشی ترقی کی شرح میں زبردست گراوٹ آئی۔

سپرا اس مسخرہ پن یا ظلم کے نتائج سے واقف تھا۔ معیشت کساد بازاری کا شکار ہے تو یہ مستقبل کے لیے اچھی علامت نہیں ہے۔ صرف ایک دن کے غائب ہونے



نے ملک کو حاشیہ پر ڈال دیا تھا۔ نئی پرانی کمپنیاں، شیئر بازار، سب کو دھکا لگا تھا۔ زور کا دھکا دھیرے سے لگے۔ اس نے ایک اشتہار میں پڑھا تھا۔ حزب مخالف کی طرف سے یہ زور دیا جارہا تھا کہ حکومت اپنے اس واہیات بیان کو واپس لے، کیونکہ اس نے معیشت کی کمر بھی توڑی ہے اور اس وقت اس بیوقوفی سے بھرے فیصلے پر ساری دنیا ہم پر ہنس بھی رہی ہے۔

اس نے سوچا، ایک شیطانی چکر، ایک شیطانی دن جب صنعتوں کی بنیادیں ہل گئیں، بینکوں میں کہرام مچ گیا۔ قرض مانگنے والے اور قرض کی ادائیگی کرنے والے سکتے میں آ گئے۔ خوف و ہراس کی فضا ان کمپنیوں کے ساتھ بھی تھی جنھوں نے مارکیٹ سے رقم جمع کرکے یا اپنے حصص فروخت کرکسی طرح کمپنی کو زندہ رکھا تھا۔ مگر حکومت کے پاس کسی بھی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس درمیان صرف اتنا ہوا کہ بیماری کا بہانہ بنا کر گنجے سر والا ایک بڑے اسپتال میں ایڈمٹ ہوگیا۔ صرف ایک دن نے نئی ملازمتوں کے دروازے بند کردیئے۔ وقت کی رفتار تھم گئی۔ کتنے ہی معاہدے ٹوٹ گئے۔ صنعت کار، اسٹاک مارکیٹ کے سرمایہ کاروں کو مالی خسارے کا سامنا کرنا پڑا۔

سپرا نے فلک بوس عمارتوں اور انسانوں کے بارے میں سوچا۔ انسان جو زمین کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے اور کبھی نہیں سوچتا کہ سب کچھ ختم ہوسکتا ہے۔ وہ یہ خیال کرتا ہے کہ سب کچھ ختم بھی ہوگیا تو انسان باقی رہے گا۔ اگر کبھی ایسا ہوا کہ زمین پر موجود تمام انسان اچانک غائب ہوجائیں تو زمین پر جگمگانے والی روشنیاں بجھ جائیں گی۔ زمین کا بیشتر حصہ اندھیرے میں ڈوب جائے گا۔ بلند و بالا پہاڑوں کی بنیادیں ہل جائیں گی۔ سمندر کنارے آباد شہر ڈوب جائیں گے۔

سپرا نے خود کو ایک نہ ختم ہونے والے اندھیرے کے درمیان محسوس کیا۔ مردہ گھر....زندگی ختم تو صرف مردہ گھر رہ جائیں گے، اس نے پلٹ کر گل بانو کی طرف دیکھا۔ ابھی ایسے بہت سے سوال تھے، جو اس کے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے۔ اس نے لیٹے لیٹے محسوس کیا، موسم بدل گیا ہے۔ ہوا تیز ہے۔ اس نے دیکھا، ایک سایہ اپنی قبر سے اٹھا اور کھڑکی کی طرف بڑھ گیا، جہاں سفید چاندنی جھلملا رہی تھی۔ دروازے ہل رہے تھے اس وقت ایک خاص قسم کا کیمیائی اثر اس کے اندر ہو رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے بازو شل ہیں اور جسم کے درجہ حرارت میں کمی آ گئی ہے... اور سامنے جو مجسمہ ہے، وہ ہوا میں اڑ رہا ہے۔ اس نے گھبرائی ہوئی آواز سنی۔ پلٹ کر دیکھا۔ یہ گل بانو تھی.....

سفید چاندنی کی شعاؤں کے درمیان ایک دوسرا مجسمہ۔

آندھی تیز ہے.....

آندھی تھی، اس کا پتہ سپرا کو کافی دیر بعد ہوا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ گل بانو سہمی ہوئی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے لہجے میں خوف تھا....اور وہ اس کی طرف بغور دیکھ رہی تھی۔

تیز آندھی ہے؟

تم کیسے جانتی ہو؟ سپرا نے پوچھا۔

چادریں شور کر رہی ہیں....گل بانو نے سفید ہلتی چادروں کی جانب دیکھا.... بادل بھی گرج رہے ہیں.....سب کچھ بھیانک.....

مگر ڈریگن سے کم.....

ڈریگن کیوں آیا؟

ڈریگن گیا کب تھا؟ سپرا ہنسا....وہ تو پہلے دن سے ساتھ ہے۔



کچھ بیحد برا ہونے والا ہے۔ گل بانو آہستہ سے بولی۔

سپرا دھند میں مجسمے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ڈریگن لوگوں میں خوش قسمتی لاتا ہے۔ ڈریگن میں بڑی طاقت، وقار اور ذہانت ہوتی ہے۔ ڈریگن کی شکل خوفناک ہے مگر.....وہ مقابلہ کرتا ہے۔

مقابلہ زندگی سے؟

نہیں۔ موت سے.....

سپرا آہستہ سے بولا۔ مقدس ڈریگن۔ قدیم چین کے شہنشاہوں نے خود کو ڈریگن سمجھا۔ ڈریگن شاہی اختیار کی —— یہ مافوق الفطرت طاقت کی کہانی ہے جو بار بار دہرائی جا رہی ہے۔ زندگی کی طاقت اور اسرار کی کہانی۔ ڈریگن روحانیت کے دیوتا کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔ لوک کتھاؤں کے مطابق چینی اجداد ہوانگ تائی کے ذریعہ وسطی چین کے انضمام سے قبل، چینی قوم کا قبیلہ گانچی تھا۔ اس قبیلے کے بادشاہ چیو کو شکست دینے اور مڈل چن کو متحد کرنے کے بعد ہنگ ٹائی نے مختلف قبائل کو اپنے حق میں پایا۔ کل دیوتا کو ڈریگن کی شکل ملی۔ ڈریگن کی شکل میں ریچھ کے سر اور سانپ کا جسم بھی شامل تھا۔ کچھ برس قبل بھی ایک ہوا میں اڑتے ہوئے ڈریگن کو دیکھا گیا تھا اور اب دوبارہ وہ آسمان پر نظر آیا۔

گل بانو نے خوفزدہ ہو کر کہا، کچھ بیحد برا ہونے والا ہے۔...

ہاں، ڈریگن نے ہماری آسمان کی زمین پر قبضہ کر لیا ہے۔

آسمان کی زمین پر؟ گل بانو نے ٹھہر کر پوچھا۔

ہاں، ایسا میں نے سنا۔ کل جب بازار گیا تو کافی لوگ اس بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ آسمان پر ہماری زمین.....کیا ہماری زمینیں، زمین پر ہیں....؟

گل بانو نے آہستہ سے دہرایا....دستاویز....کاغذات....

گل بانو نے پھر دہرایا۔ تیز آندھی....

مگر سپرا کے ذہن میں کچھ اور ہی چل رہا تھا۔ قبرستان میں دستاویزات کے لیے کھدائی کرنے والے، شمشانوں کی راکھ چننے والے، آسمانی حصے سے ملک کی زمین کا غائب ہوجانا، ڈریگن کی آمد، ایک مخصوص بُو، جو اس کے ساتھ چلتی ہوئی آکٹوپس میں تبدیل ہوگئی....اور وہ ایک سرد انگلی جو اس کے تعاقب میں ہے۔

دشت لایعنیت.....

نغمۂ لایعنیت.....

نغمۂ ناشنیدہ.......

ایک موسیقی ہے، جو فضا میں ابھر رہی ہے۔ یہ موسیقی اس نے خانہ بدوشوں کے قافلے میں سنی تھی۔ وہ اس موسیقی کو قدیم گرنتھوں سے لے کر آئے تھے۔ اور یہ موسیقی جب گونجتی تو چشموں کے پانی اُبل پڑتے۔ فوجی ٹرکوں کی تعداد میں اضافہ ہوجاتا۔ بادلوں کا کارواں آسمان پر چھاجاتا اور چاروں طرف اندھیرا ہوجاتا۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ گل بانو، تم گنگنا سکتی ہو اور جیسا کہ اس دن وہ گنگنا رہے تھے۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں....اور میں گواہ ہوں۔

اے ظلمتوں کے بادشاہ
ہماری مدد کر
ہماری زبانوں کو زہریلا کردے
ہماری نفرتوں کو مینار بنادے
ہمارے سایوں کو ظلمت کی تاریکی بخش دے....
اے ظلمتوں کے بادشاہ
ہماری مدد کر....



بند کرو یہ گانا....گل بانو زور سے چلائی۔ وہ آرہے ہیں اور وہ ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔

کون ...؟

ظلمتوں والے، تاریکی والے، گھٹاؤں والے....میں ان کی آہٹ سن رہی ہوں....

کچھ...کچھ بہت برا ہونے والا ہے....

سپرا نے گل بانو کی طرف دیکھا۔ اسے احساس ہوا، مجسمہ کے ہاتھ گل بانو کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس کی دھڑکنیں تیز ہوگئی تھیں۔

صبح ہوگئی۔ سپرا اٹھا۔ دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا۔ بے اطمینانی کی سی کیفیت تھی۔ وہ کئی بار مجسمہ کے قریب ٹھہرا۔ پھر پلٹ کر گل بانو کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی قبر پر آرام سے لیٹی ہوئی تھی۔ باہر یقیناً خانہ بدوش ہوں گے۔ وہ ان کی آوازیں سن سکتا تھا...اور ان ٹرکوں کی آوازیں بھی جو شور کرتے ہوئے سڑک سے گزر رہے تھے... اور ان آوازوں کو زیادہ دیر تک برداشت کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔ اس کے دماغ میں ہلچل مچی ہوئی تھی...اور اس وقت وہ جن کیفیات سے گزر رہا تھا، اسے کوئی نام دینا آسان نہیں تھا۔ ایک کشمکش اس کے اندر چل رہی تھی۔ کیا وہ حقیقت میں مردہ ہے۔ یا مردہ ہونا فقط نمائش ہے؟ کیا وہ ریحانہ کو بھول گیا۔ ان تمام چہروں کو جن کو وہ قبر میں سلاکر آیا تھا۔؟ آخری نیند اور اس نے اپنے مردہ ہونے کا اعلان کیا تھا۔ یہ مردہ خانہ آباد کیا۔ سرد لاشیں۔ سرد لاشوں کو دیکھنے کا اتفاق کئی بار ہوا۔ لیکن وہ کس قسم کا مردہ ہے، جو سوچتا ہے.... بازار جاتا ہے....شاپنگ کرتا ہے۔ یہاں تک ٹھیک ہے مگر یہ گل بانو۔ وہ گل بانو کا اسی طرح خیال رکھتا ہے، جیسے

ریحانہ کا رکھتا تھا۔ وہ گل بانو سے مکالمے کرتا ہے۔ اس کے لیے ضروری سامان کی خرید وفروخت کرتا ہے۔ سپرا کو یقین تھا۔ گل بانو نے مردہ گھر کی خاموشی کو توڑنے کا کام کیا ہے اور اس طرح وہ زیادہ دنوں تک مردہ نہیں رہ سکتا۔ کبھی نظیرے آجاتا ہے اور کبھی گل بانو اپنی پرانی کہانیاں لے کر بیٹھ جاتی ہے۔ کیا وہ زندہ ہے؟ اس کی حرکات سکنات میں ایک زندہ آدمی کی واپسی ہوئی ہے؟

لیکن وہ مر چکا ہے.....

نڈھال سپرا بار بار خود کو یقین دلانے کی کوشش کررہا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ جیسے ڈائنا سور مرگئے۔ جیسے ریحانہ چلی گئی۔ جیسے اس کا بیٹا چلا گیا۔ اور وہ سب بھی مر چکے ہیں جو باہر قبرستانوں میں قبریں کھود رہے ہیں اور وہ بھی جنہیں ٹرکوں میں بھر بھر کر گمنام جگہوں پر لے جایا جارہا ہے۔ کوئی زندہ نہیں ہے۔ کچھ نے ڈھونگ کیا ہوا ہے۔ مگر یہ اس کا ڈھونگ نہیں ہے کہ وہ مردہ ہے اور اس کی تمام خواہشیں مر چکی ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ سوچتا ہے، باہر نکلتا ہے۔ وہ صرف خود کے مردہ ہونے کا کا یقین کررہا ہے۔ مگر اس کی اصلیت کچھ اور ہے۔

سپرا نے کمرے میں ٹہلنا جاری رکھا۔ دو ایک بار مجسمہ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ اس کے اندر کی اتھل پتھل یہ باور کرانے کی کوشش کررہی تھی کہ وہ زندہ ہے اور یہ سب گل بانو کا کیا دھرا ہے۔ نہ وہ اس مردہ گھر میں آتی۔ نہ اس مردہ گھر کے اصول و قانون میں فرق پڑتا۔ گل بانو نے آکر مردہ گھر کی خاموشی میں خلل ڈالنے کی کوشش کی ہے.....

اس نے دیکھا۔ گل بانو اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور بغور اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے اس کی کیفیت سمجھنے کی کوشش کررہی ہو۔ وہ اس وقت سرد خانہ میں تھا اور اپنے اندر کے



غصے کو سرد کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سفید کفن سے ڈھکی ہوئی لاشیں دیکھیں اور پھر خود کا جائزہ لیا۔ سفید چادروں سے ہوکر دودھیا چاندنی کمرے میں بکھر رہی تھی۔

کافی دیر بعد گل بانو نے پوچھا کیا بات ہے۔؟

سپرا نے ٹہلنا جاری رکھا۔ گل بانو کے اس سوال پر اسے غصہ آرہا تھا۔ اس کی کنپٹیاں جل رہی تھیں۔

گل بانو نے پھر پوچھا۔ ’کیا بات ہے ...؟‘

’کیا میں مردہ ہوں؟‘

سپرا نے اس کی طرف دیکھا۔

نہیں کہتے ہوئے گل بانو ٹھہر گئی۔ اس نے سپرا کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ’یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو‘

جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔ ’کیا میں مردہ ہوں؟‘

’نہیں‘

’میں مردہ ہوں‘، سپرا زور سے چلایا۔ مگر یہ تم ہو جس نے مردہ گھر کی خاموشی کا خون کردیا ہے... اُہ... سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ مگر ایک بری ساعت.... تم ایک خون کر کے مردہ خانے آگئی... اور تم نے سب ختم کردیا۔ میں تمہارا خیال رکھنے لگا۔ تم میری خواہشوں کو بیدار کرنے لگی۔ تم برہنہ ہوئی اور مجھ پر بجلی گرانے کی کوشش کی۔ مگر تم ہار گئی۔ اس کے باوجود مجھے یہاں تمہاری موجودگی منظور نہیں۔ تمہاری موجودگی مجھے زندہ ہونے کا احساس دلاتی ہے اور یہ میں نہیں چاہتا۔

’میں .... میں بے بس ہوں....‘ گل بانو نے کہنا چاہا۔

’اپنے لیے....‘

’میں لاچار ہوں....‘

'اپنے لیے...'

'میں کہاں جاؤں گی؟'

'یہ تمہارا مسئلہ ہے۔'

'نہیں۔اب تمہارا مسئلہ بھی ہے۔'

'کیسے؟'

'میں گرفتار کر لی جاؤں گی۔ پھر مجھ سے پوچھا جائے گا، میں اتنے دنوں تک کہاں چھپی تھی۔ ظاہر ہے میں تمہارا نام لوں گی...اور تم بھی پکڑے جاؤ گے۔'

'میں ...میں پکڑا جاؤں گا....؟'

'سپرا پر وحشت سوار تھی۔تم نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا ہے...اور اسی وقت تم میرے گھر سے نکل جاؤ۔'

'میں نہیں جا سکتی۔' گل بانو آرام سے اپنی قبر پر بیٹھ گئی۔

'یہ میرا گھر ہے...'

گل بانو نے جملہ آدھے میں ہی روک دیا۔ 'گھر نہیں مردہ خانہ....اور مردہ خانے میں کوئی بھی آ سکتا ہے۔ کیا تم نے قبرستانوں کو نہیں دیکھا جہاں ہزاروں مردے ہوتے ہیں۔'

'لیکن یہ میرا مردہ خانہ ہے.....'

'مردہ ہو۔ زندوں کی طرح بات مت کرو۔ مردوں کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ ان کی آخری آرام گاہ کون سی ہے۔ یہ تمہارا مردہ خانہ نہیں ہے۔ یوں کہہ سکتے ہو کہ یہ مردہ خانہ ہے۔'

سپرا کو غصہ آ رہا تھا۔ اس نے مشکل سے غصے پر قابو پایا۔ غصہ ہونا بھی زندہ انسان کی علامت ہے۔ مردہ غصہ نہیں کرتے۔ وہ عاجزی کے ساتھ بولا۔



'خدا کے لیے، یہاں سے کہیں اور چلی جاؤ۔'

'بالکل بھی نہیں۔ مجھے یہ مردہ پسند ہے۔'

'کون؟'

تم۔گل بانو کھلکھلا کر ہنسی۔ سپرا نے مجسمہ کی طرف دیکھا اور حیران ہوا کہ اس موقع پر مجسمہ والی عورت کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پیدا ہو گئی تھی۔لیکن سپرا ابھی بھی غصے پر کنٹرول کرنے میں کمزور ثابت ہوا تھا۔ اس کا جسم سلگ رہا تھا۔ دماغ میں زلزلہ آیا ہوا تھا۔ اور باہر ٹرک شور کر رہے تھے۔ وہ مسلسل باہر سے آنے والی آوازوں کو سنتا ہے۔مردے کہاں سنتے ہیں۔ یہ کافی نہیں ہے۔ اسے برف کی سلیوں کو لانا ہوگا۔ کمرے کے درجۂ حرارت کو تبدیل کرنا ہوگا۔ اس نے پھر خیال کیا، ابھی تک اس نے بھوک پر قابو نہیں پایا ہے۔مگر اس کا قیاس تھا کہ جو مردے روحوں کی شکل میں گھروں میں منڈلاتے ہیں، وہ فریج بھی کھولتے ہوں گے اور ناشتہ پانی پر ہاتھ بھی صاف کرتے ہوں گے۔ مردہ روحیں سڑکوں، شاہراہوں پر بھی بھیڑ کا حصہ ہوتی ہیں، یہ بات اس نے سن رکھی تھی۔

اس نے گل بانو کی آواز سنی، جس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

بڑے بڑے شارک ہیں۔

کہاں.....

تمہارے اندر.....وہ ہنسی....شارک، وہیل اور ہپوپوٹیمس.....

یہ ہپوپوٹیمس کہاں سے آیا....؟

گل بانو آہستہ سے بولی۔ اسے میں لے کر آئی ہوں۔ کبھی سرکس دیکھا ہے۔ ایک لڑکی ہپوپوٹیمس کے ساتھ چلتی ہے۔

ہاں دیکھا ہے....

وہ لڑکی میں ہوں
اور ہپو پوٹیمس؟

’اس کے بارے میں نہیں جانتی۔ مگر وہ تم بھی ہو سکتے ہو‘ گل بانو اس دفعہ کھلکھلا کر ہنسی۔

سپرا کو غصہ آیا۔ واہیات۔ اس کمرے میں ہنسی ہے، قہقہہ ہے، مکالمے ہیں اور زندگی ہے۔ پھر یہ مردہ گھر کیسے ہوا۔ اسے احساس ہوا، مردہ جسم کو یرغمال بنالیا گیا ہے... اور مجرم گل بانو ہے۔ اسے غصہ آرہا تھا۔ آندھی رات میں ہی ختم ہوگئی تھی۔ چادروں کے باہر یقیناً سورج نے شعاؤں کا تحفہ برسایا ہوگا۔ سڑک گیلی ہوگی... اور کمزوروں کا قافلہ سر جھکائے سڑکوں سے گزر رہا ہوگا۔ کمزور اور مردہ۔ جیسا کہ وہ ہے۔ اس نے گل بانو کی طرف دیکھا۔ اس دفعہ اسے زور سے غصہ آیا۔ وہ چیخا۔ یہ مردہ گھر نہیں ہے اب۔ تم نے سب ختم کردیا۔ آہ.... سب ختم کردیا۔ عورت چاہے تو سب کچھ ختم کرسکتی ہے۔ مردوں کی شانتی بھی۔ مردوں کی خاموشی بھی۔ عورتیں مردوں کو بھی آرام سے نہیں دیکھ سکتیں۔

سپرا کے ہاتھ ہوا میں لہرائے۔ اس کے بعد وہ رُکا نہیں۔ ایک ایک کرکے گھر کے تمام پردوں کو نوچتا چلا گیا۔ پردے کھل رہے تھے۔ کمرے میں دھوپ کی چاندنی بکھر رہی تھی۔ روزن کھل رہے تھے۔ کھڑکیاں چمک رہی تھیں۔ وہ اس وقت نیم پاگل پن کی حالت میں تھا۔ اس نے تمام پردے نوچ ڈالے۔ پھر اس کے بعد مجسمہ والی عورت کے قریب بڑھا۔ مگر اچانک ٹھہر گیا۔ اسے احساس ہوا، مجسمہ والی عورت کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں اور گل بانو آرام سے اپنی قبر پر بیٹھی ہوئی فریج سے نکال کر برگر کھا رہی ہے۔



’زندوں میں آگئے۔‘ گل بانو نے پوچھا۔ کھڑکی کے باہر کی دھوپ دیکھو۔ روزن کے باہر جھلملاتے نور کا عکس دیکھو۔ اب اس گھر کو دیکھو.... یہاں روشنی کی حکومت ہے۔ روشنی جو زندہ رہنے کی دلیل ہے۔ سپرا چیخا۔ مجھے یہ روشنی نہیں چاہیے۔ مردہ خانے کی روشنی اسے وحشت میں مبتلا کررہی تھیں۔ یہ کیا کیا اس نے؟ اسے اپنے غصے پر قابو پانا چاہیے تھا۔ یہ روشنی.... کھڑکی سے سامنے والی سڑک صاف نظر آرہی تھی۔ اس طرف ایک قطار سے کچھ درخت بھی تھے۔ کچھ بنگلے بھی بنے ہوئے تھے۔ ان بنگلوں میں زیادہ تر خاموشی رہتی ہے۔ بڑے لوگ موت سے قریب ہوتے ہیں اور خاموشی کو پسند کرتے ہیں۔ یہاں سے اسے چمکتا ہوا سورج بھی صاف نظر آرہا تھا۔ روزن سے، کھڑکیوں سے اور روشنی سے بُو کا احساس بڑھ گیا تھا اور سپرا کو دوبارہ احساس ہوا کہ بو سے نکل کر آکٹوپس اس کے کمرے میں چلنے پھرنے لگے ہوں۔ کھڑکی کی پشت کے منظر سامنے آگئے۔ سلاخوں کے اس طرف جھاڑیوں کے پیچھے ممکن ہے مردہ خانے کا بورڈ اب بھی پڑا ہو۔ سامنے کے بنگلے کی دیواروں پر بوسیدگی کے آثار نمایاں تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کو کسی سے مطلب نہیں تھا۔ وہ اپنی ہمت یکجا کرکے دوبارہ جھاڑیوں کی طرف دیکھتا ہے۔ سفید پردے زمین پر پڑے ہیں اور ایک سرخ چیونٹا ان کے درمیان سے دیوار پر چڑھنے کی کوشش کررہا ہے۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اس گہری نیند میں ڈوبنا چاہتا ہے جو مردوں کا مقدر ہے۔ مگر یہ لڑکی، اس نے گل بانو کی طرف دیکھا جو اطمینان کے عالم میں قبر پر بیٹھی ہے اور مسکراتی آنکھوں سے کھڑکی کے شیشے سے آنے والی روشنی کی کرنوں کو دیکھ رہی ہے۔ ایک وہ راستہ جو دھوپ کی کرنوں کی طرف جاتا ہے۔ ایک وہ راستہ جو تاریکی کی طرف جاتا ہے۔ تاریکی، جس میں نور کو نگلنے کی طاقت ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی تاریکی۔ ممکن ہے، موت کے بعد یہی تاریکی ہو... اور وہ اس

تاریک نظام میں اپنی بو کے ساتھ داخل ہو.....

اس نے دیکھا۔نور جہاں مسکرا رہی تھی، نور جہاں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

تو یہ مردہ خانہ ہے اور تم مر چکے ہو۔

ہاں۔

تم جنت میں ہو یا دوزخ میں!

سپرا ایکدم سے چونک پڑا۔' مطلب؟'

گل بانو ہنسی۔ میرا خیال ہے، تم جنت میں ہو۔...اور تمہاری نیکی کے عوض تمہیں ایک حور بھی دی گئی ہے۔ ویسے نیک عورتوں کے لیے کہا گیا ہے کہ ان کا واسطہ غلمان سے ہوگا۔اور اس حلیہ میں تم کسی بوڑھے غلام سے کم بھی نہیں لگتے۔

'پاگل پن...' سپرا زور سے چیخا۔روشنی بند کرو۔

جنت میں روشنی تو ہوگی۔؟

روشنی بند کرو۔سپرا پھر چیخا۔

'جنت میں سانپ ہوں گے؟' گل بانو نے پوچھا۔آگے بڑھ کر کھڑکی کھولی اور ایکدم سے چونک پڑی....کوئی آ رہا ہے....اور میں پہچان سکتی ہوں۔

'کون....'

'نظیرے...'

وہ پہلے سے کہیں زیادہ لنگڑاتے ہوئے چل رہا ہے...اور میرا خیال ہے وہ کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آ رہا ہے۔وہ دس منٹ میں یہاں پہنچ جائے گا۔

'دس منٹ میں، اس کمرے میں اندھیرا ہونا چاہیے۔تم سمجھ رہی ہو نا۔ مردہ گھر...'



سپرا روشنی سے اندھیرے کی طرف آ گیا تھا۔

دس پندرہ منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔

(3)

## مردہ گھر تیار تھا

پنجرہ کچھ دیر کے لیے کھلا پھر بند ہو گیا۔اس نے پنجروں میں سدھائے ہوئے جنگلی جانوروں کو دیکھا تھا۔ایک دیوار سے دوسری دیوار کی طرف کھیلتے ہوئے۔ سفید براق چادریں سج گئی تھیں۔ روزن کے پاس سپرا نے ایک مکڑی دیکھی جو دیوار سے لگی بیٹھی تھی۔سپرا نے مجسمہ کو غور سے دیکھا۔اب شعائیں کھڑکی اور روزن کے پار تھیں۔کمرے میں بو بسی ہوئی تھی مگر حیرت ہے کہ اس بو کو گل بانو نے محسوس نہیں کیا تھا۔گل بانو ٹہلتی ہوئی نظیرے کا انتظار کر رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ سپرا اپنی قبر والی جگہ پر لیٹ گیا۔آنے والے مہمان سے اسے کوئی کام نہیں تھا۔گل بانو نے دروازہ کھولا اور لنگڑاتا ہوا مہمان اندر داخل ہوا۔گل بانو آگے بڑھی اور اس سے لپٹ گئی۔اس کے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ سمجھنے سے قاصر

تھی کہ ابھی ان آنسوؤں سے اس کا کیا رشتہ ہے۔ مگر وہ رو رہی تھی اور نظیرے اس
کے سر پر دست شفقت رکھتا ہوا خود بھی زار و قطار رو رہا تھا۔

سپرا اس انسانی جذبات کو سمجھ سکتا تھا۔ ذہن و دماغ کا ایک حصہ نامعلوم
دنیاؤں کی سیر کرتا رہا ہے... اور ساتویں حس نامعلوم دنیاؤں میں قدم رکھتے ہوئے
کچھ باتوں کی جانب اشارہ کر جاتی ہے، جس کا تعلق اندیشے، اسرار اور خوف سے
بھی ہوتا ہے۔ ایک سونامی آئی اور چلی گئی۔ گل بانو اور نظیرے نیچے بیٹھ گئے۔ سیاہ
قبر کے پاس سے صرف ان کے چہرے نظر آرہے تھے۔ لیکن سپرا دونوں کی گفتگو سن
سکتا تھا۔ شروعات گل بانو نے کی....

موسم بدل رہا ہے....

نظیرے خاموش رہا....

خانہ بدوشوں کی تعداد بہت بڑھ چکی ہے۔

نظیرے اس بار بھی خاموش رہا۔

گل بانو کے ہونٹوں پر کپکپی تھی۔ 'بہت دن ہو گئے، موت کے ساتھ رہتے
ہوئے۔ لیکن اب بھی سوچنے سے قاصر ہوں کہ کہاں جاؤں؟ ڈر لگتا ہے کہ باہر نکلی
اور پکڑی گئی تو؟ یہی سوچ کر اس مردہ خانے میں ہوں۔ مگر کب تک؟'

گل بانو سوالوں سے دامن بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے احساس تھا، کچھ
برا ہوا ہے... اور نظیرے گہری سوچ میں غرق ہے۔ مگر ابھی وہ کچھ بھی برا سننے کے
لیے تیار نہیں تھی۔ وہ ان کھنڈرات میں تھی جہاں قحبہ خانہ آباد تھا اور جہاں اس کا
بچپن گزرا تھا جہاں اس کی سہیلیاں تھیں۔ پھر اماں کے ساتھ وہ ایک اجنبی بنگلہ کا
حصہ بن گئی اور اب یہ مردہ خانہ، جہاں دن کی روشنی کی جگہ موت کی روشنی حاوی
ہے۔ سرسراتی چادروں سے نکلتی شعائیں اسے خوفزدہ کرتی ہیں اور وہ موت کا مجسمہ،



وہ عورت، اس سے باتیں نہیں کرتی، بلکہ ہر وقت اسے موت کا احساس دلاتی رہتی
ہے... اور باہر کی دنیا راٹھور کی دنیا ہے۔ پتہ نہیں اس کو تلاش کرنے والے تھک گئے
ہوں گے یا اب بھی اس کی تلاش میں ہوں گے۔ گل بانو کو یقین تھا، پولیس کبھی اپنی
تلاش بند نہیں کرتی... اور راٹھور کو مرے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔ یقین
کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ باہر نکلی تو ضرور پکڑی جائے گی۔ اس نے آہستہ سے
کہا.....

'سب ختم ہو گیا نظیرے۔ وہ باغ... اور احتجاج کا کیا ہوا؟'

'وہاں گیدڑ آ گئے... اور بہت سے بندر...'

نظیرے کی آواز سرد تھی۔ احتجاج ختم ہو گیا۔ دستاویز تلاش کیے جانے لگے اور
انسان غائب ہونے لگے....

'غائب....؟'

ہاں... لاکھوں غائب... بلکہ کروڑوں.... اور اچانک آپ کے سامنے سے کوئی
غائب کر دیا جاتا ہے... اور آپ کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ تم نے ٹرکوں کی آوازیں نہیں
سنیں.....؟

'ہاں سنی ہیں...'

ٹرک آتے ہیں اور انسان غائب.... ہمارے جیسے، اقلیتی انسان غائب اور
غائب ہو کر کہاں جاتے ہیں، کچھ نہیں معلوم... اور اسی لیے اب کچھ دنوں سے
دستاویز اور کاغذات کا معاملہ بھی خاموش ہو گیا ہے۔ ضحاک نے باہر نکلنا بند کر دیا
ہے۔ راتیں پُر اسرار اور لمبی ہو گئی ہیں۔ ندیاں سوکھ گئی ہیں۔ سڑکوں پر چلنے والے
کمزور ہو گئے ہیں.... اور خانہ بدوش.... ان کی تعداد بڑھ چکی ہے۔ اب چاروں
طرف یہی خانہ بدوش نظر آتے ہیں۔

'خانہ بدوش.....جو ہم پر نظر رکھتے ہیں؟'

'ہاں۔ گہری نظر...اتنی گہری نظر کہ ہم اچانک اٹھتے ہیں اور غائب کر دیے جاتے ہیں۔ یہ ان کی نظر کا کرشمہ بھی ہے۔ ہماری نگرانی کے لیے وہ چاروں طرف ہیں۔ وہ ہوا میں بھی گھلے ہوئے ہیں...اور ان کے پاس گھوڑے بھی ہیں۔ کبھی کبھی ہماری تلاش میں سیکڑوں گھڑ سوار بھی آتے ہیں۔ اور ان کے ہاتھوں میں بندوق بھی ہوتے ہیں۔ اس وقت سڑک خالی ہوجاتی ہے۔ ٹریفک رُک جاتا ہے۔ مگر ہم یہ سب کیوں باتیں کر رہے ہیں۔ میں تمہیں بتانے آیا تھا کہ.....'

نظیرے کہتا کہتا رُک گیا۔

'نہیں اس بیان کو جاری رکھو۔ ابھی میں کچھ اور سننا نہیں چاہتی۔' گل بانو نے حکم دیتے ہوئے کہا...اور یہ زرد آندھی، سانسوں میں گھٹن.....اور ایک مخصوص قسم کی بو.....اور ڈریگن.....

نظیرے نے بات کاٹ دی۔ ڈریگن نہیں.....مگر بو ہے اور اتنی شدید کہ کمزور عوام ماسک لگا کر گھوم رہے ہیں۔ سڑکیں ٹھنڈی ہیں اور گھڑ سوار سورج کی روشنی کا تعاقب کرتے ہوئے دوڑتے ہیں۔ مگر ڈریگن، یہ آنکھوں کا دھوکہ ہے۔.....

'آنکھوں کا دھوکہ.....؟'

'تمہیں آئینہ میں کس کی شکل نظر آتی ہے؟'

'میں نے مہینوں سے آئینہ نہیں دیکھا۔ مگر آئینہ میں، میں ہوتی ہوں۔'

'ڈریگن بھی ایک فریب ہے۔' نظیرے کہتا کہتا ٹھہر گیا۔ وہ اسی سلطنت کا حصہ ہے اور آسمان کی زمینیں فروخت کر دی گئی ہیں۔'

'کیا ہم آسمانوں میں ہیں۔؟'



'اب ہم زمین پر بھی کہاں ہیں۔ یہ بھی فریب ہے۔ ہم زمین پر کہیں نہیں ہیں۔ اور جس تعداد میں ہیں، وہ تعداد بھی غائب کر دی جائے گی۔'

مسیح سپرا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں...اور بند آنکھوں میں نظیرے کے الفاظ اتر رہے تھے۔ وہ نظیرے کو ایک مسخرہ سمجھتا ہے۔ قحبہ خانے میں پیدا ہوا ایک دلاّ۔ مگر یہ دلاّ ان لوگوں سے اور ان تمام لوگوں سے بہتر ہے جو اپنی بینائی کھو چکے ہیں۔ اس نے گھڑ سواروں کی آواز سنی۔ پھر ٹرکوں کے شور کو سنا۔ یقیناً ان ٹرکوں میں اپاہج اور بے زبان ہوں گے۔ ایک بڑا سا ملبہ ہوگا، جہاں یہ دفن کر دیئے جائیں گے۔ سرخ رنگ میں، آتش کدوں میں اور بے جان جسموں کی شکل میں۔ سپرا کو گنٹر گراس کا ناول ٹن ڈرم کی یاد آئی۔ یہاں بھی ایک آتش کدہ روشن تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے شعلے اٹھ رہے تھے۔ پستہ قد آسکر اپنی چیخ کے ساتھ شیشوں کو توڑ سکتا ہے۔ معمولی ٹن ڈرم کو بجا کر روشنی پیدا کر سکتا ہے۔ وہ کثیف روشنی کے ملبے سے پیدا ہوا اور اسے قبر کی کھدائی میں ایک ڈرم ملا۔ ڈرم کو قبر سے نکالا اور بجانا شروع کیا۔

وہ ناشنیدہ نغموں کی زد میں ہے اور ڈرم بج رہا ہے۔ اس نے نظیرے کی آواز سنی جو کہہ رہا تھا۔

'احتجاج کے ڈرم پھٹ گئے۔ خانہ بدوش جیت گئے.....اور چاروں طرف پھیل گئے۔ اب وہ ہمارے درمیان ہیں اور ہمیں خاموشی سے اپنے ساتھ لے کر انجانی سمتوں میں غائب ہوجاتے ہیں.....اور گل بانو، اب تمہیں اپنے گھر کی فکر کرنی ہوگی.....کیونکہ.....'

'گھر کی فکر.....' گل بانو کا لہجہ جذباتی تھا...ابھی نہیں۔ ابھی موسم کا حال بتاؤ نظیرے۔ ابھی میں کچھ اور سننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔' گل بانو کی آنکھوں میں

آنسو تھے۔کیا کوئی مانے گا نظیرے؟ ہماری دنیا یا ہماری تاریخ کا ایک دلاّ ایسا بھی تھا، جو ہوش کی باتیں کرتا تو دانشور اس کے سامنے حقیر نظر آتے۔ جو پیشے سے دلاّ مگر مستقبل کا حال جاننے والا۔ تجھے میں نے کتنا غلط سمجھا تھا نظیرے....نظیرے... آج میں ہوش میں نہیں ہوں۔ یاد ہے اس دن...تم نے کچھ سنایا تھا۔آج میں اپنے حال میں نہیں ہوں۔ کچھ سنا نظیرے۔ میرے ہوش کی دوا کر۔ میری روح آج بہت بے چین ہے۔

کیا سناؤں۔نظیرے آہستہ سے بولا....

کچھ بھی۔ کچھ ایسا جو میری روح کے اضطراب کو کم کردے.... کچھ بھی نظیرے....اورنظیرے نے سنانا شروع کیا۔اور سناتا چلا گیا۔

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ
نہ دست و ناخنِ قاتل نہ آستیں پہ نشاں
نہ سرخیِ لبِ خنجر نہ رنگِ نوکِ سناں
نہ خاک پر کوئی دھبا نہ بام پر کوئی داغ
کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ
نہ صرفِ خدمتِ شاہاں کہ خوں بہا دیتے
نہ دیں کی نذر کہ بیعانۂ جزا دیتے
نہ رزم گاہ میں برسا کہ معتبر ہوتا
کسی علم پہ رقم ہو کے مشتہر ہوتا
پکارتا رہا بے آسرا یتیم لہو
کسی کو بہرِ سماعت نہ وقت تھا نہ دماغ
نہ مدعی نہ شہادت حساب پاک ہوا





سپرا سن رہا تھا۔موجیں اٹھ رہی تھیں۔ ڈریگن غائب تھا۔ اور وہ گھڑ سوار بھی۔فوجی ٹرک بھی۔ سپرا کو یقین نہیں تھا، یہ لنگڑاتا ہوا مہمان...اور یہ جس طرح کمرے کے اندر داخل ہوا، اس شخص کے دل میں اس قدر درد کی گہرائی ہوسکتی ہے۔ اسے ۷ جنوری کا دن یاد آیا....کٹے ہوئے سر...چلتی ہوئی گولیاں.... پولیس کا قہر.... سورج کی گرم شعائیں.... اڑتی ہوئی دھول۔ یہ منظر شعلوں کی طرح لپکے...اور غائب ہوگئے۔وہ الف لیلوی شہر میں تھا۔طلسمات کی دنیا میں۔اس کے اندر ہلچل مچی۔جسم میں خون کا دوران تیز ہوا...سپرا دوبارہ لیٹ گیا....اور یہ دن اس شخص کے نام ہے جو لنگڑاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا.....اور نیند کے نام...اور گہری نیند کے نام...اور بہت لمبی نیند کے نام...اور اس دنیا کے عزائم کے نام، جس نے ہمیں گہری نیند کے حوالے کردیا ہے...اور ان کیڑے مکوڑوں کے نام، جن کے ناشنیدہ نغموں نے ہم سے سماعت اور بصیرت چھین لی ہے...اورضحاک کے نام، جس کے دونوں سانپ ایک دن کسی کی قید میں ہوں گے...اور ان مسرتوں کے نام، جو خوابیدہ وادیوں کی سیر کو نکل گئی ہیں۔مگر۔ سپرا کی آنکھوں میں اس وقت نیند نہیں تھی۔اس نے سنا۔گل بانو کہہ رہی تھی...

’آہ یہ کیسا نغمہ تھا، جو سیدھے دل میں اُتر گیا۔ مجھے وہ باتیں یاد آئیں جب زندگی میں کہیں کوئی نغمہ نہیں تھا۔ میں نے پرانے گھر کے بڑے جالے میں ایک خوفزدہ مکڑی کو دیکھا تھا۔ وہ مکڑی میں تھی....اور مجھے وہ طوفان بھی یاد ہے....نظیرے نے بات درمیان میں ہی روک دی۔ خالہ چلی گئیں.....

’خالہ...‘ گل بانو کا چہرہ تبدیل ہوا۔اس نے نظیرے کی طرف دیکھا۔نظیرے

کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔

’ہاں۔ خالہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔ آخری دنوں میں، میں ہی ان کے پاس تھا۔ خالہ کا تھا ہی کون....جیل سے واپس آنے کے بعد خالہ بہت ٹوٹ گئی تھیں۔ روز ہی دروازے سے باہر کی طرف دیکھا کرتی تھیں۔ تمہیں بہت یاد کرتی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ تم ایک دن واپس آجاؤ گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر کچھ ٹھیک نہیں ہوا....اور خالہ چلی گئیں۔‘

’اماں چلی گئیں....‘ گل بانو پر ہزیان کا دورہ پڑا۔ وہ چیخ چیخ کر رونے لگی.... میں جانتی تھی، تم یہی خبر لے کر آئے ہو نظیرے۔ اماں چلی گئیں....اور مجھے خبر بھی نہیں۔‘

سپرا نے دیکھا، اچانک گل بانو کے چہرے کا رنگ بدلا۔ وہ کھلکھلا کر ہنسی... ’ایک دور ختم ہو گیا۔ اماں کے صندوق سے میں نکلی تھی۔ اب میرے بعد صندوق سے کوئی نہیں نکلے گا۔ اماں کے صندوق میں سرخاب چھپے تھے۔ سرخاب اڑ گئے۔‘ وہ ہنستی چلی گئی۔ اور اچانک گل بانو پر رونے کا دورہ پڑا۔ میں اماں سے مل بھی نہیں سکی اور وہ چلی گئیں۔ میں اماں کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جانا چاہتی ہوں۔

’ممکن نہیں۔‘ نظیرے نے آہستہ سے کہا۔ قبریں غائب ہو رہی ہیں۔ قبرستان میں پھاوڑے چل رہے ہیں۔ اماں کی کوئی قبر نہیں۔

کوئی قبر نہیں۔ مطلب۔ گل بانو چونک کر بولی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔؟

نظیرے کا چہرہ زرد تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ بولنا شروع کیا۔ چار دن پہلے اماں کے منہ سے خون آیا۔ اسپتال میں بھرتی کیا۔ جس دن بھرتی کیا، اس دن ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ کوڑا گاڑی میں مردہ جسموں کو لے جایا جا رہا تھا۔ کہاں؟ کسی کو نہیں معلوم۔ مجھے اماں سے ملنے نہیں دیا گیا۔ اسپتال کے دروازے ملنے والوں



کے لیے بند تھے۔ آج صبح اماں کی خیریت لینے گیا۔ بلکہ روز ہی جاتا تھا اور واپس آجاتا تھا۔ آج کافی ہنگامہ کرنے کے بعد مجھے بتایا گیا کہ اماں نہیں رہیں۔ اسپتال والوں نے ان کی لاش نہیں دی۔ اماں کا سفر ختم ہوا۔ اماں اسپتال سے غائب کر دی گئیں۔ وہاں اب بھی بہت سے مریضوں کے پُرسان حال جمع ہیں۔ وہ زیادہ زور زبردستی کرتے ہیں تو انہیں پکڑ کر جیل کی سلاخوں میں بند کیا جا رہا ہے۔

’اماں نہیں رہیں۔ اماں کی کوئی قبر بھی نہیں ہے۔‘ گل بانو پر یہ خبر کسی بجلی کی طرح گری تھی۔ اس کے آنسو خشک تھے۔ وہ ماضی کی سرنگ میں داخل تھی اور اسے اماں کا چہرہ یاد آرہا تھا۔

نظیرے آہستہ سے بولا۔ میں مکان کی کب تک دیکھ بھال کروں گا۔ اب تم کو آنا ہوگا۔ آنا ہوگا گل بانو.....اور اگر نہیں آئی تو....‘ اس کے لہجہ میں خوف تھا۔ مکانوں پر قبضہ کیا جا رہا ہے۔ وہ لوگ اماں کے مکان پر بھی قبضہ کر لیں گے۔‘

’اماں کی یادگار....‘ گل بانو کی آنکھوں میں اجنبی کا چہرہ چمکا اور اماں کا چہرہ بھی، جب وہ بندیا لگایا کرتی تھیں۔ جب سورج اپنی جگہ تھا اور جب فصلوں پر ٹڈی دل کا حملہ نہیں ہوا تھا۔ جب ڈریگن نہیں آئے تھے جب ضحاک کے دو سانپ نمودار نہیں ہوئے تھے....میرا مکان....میری زمین...میری ملکیت.....گل بانو اس وقت خلا میں دیکھ رہی تھی۔ نظیرے نے الوداع کہا اور چلا گیا۔ اس نے دروازہ بند کیا۔ کمرہ دودھیا روشنی سے نہایا ہوا تھا۔ وہ آہستہ قدمی سے چلتی ہوئی اپنی قبر پر آکر بیٹھ گئی۔ دل و دماغ میں دھماکے گونج رہے تھے، ان میں بندروں کا شور بھی شامل تھا۔ تو اماں چلی گئیں....اور اماں کا کچھ پتہ بھی نہیں۔

سپرا کی خواہش تھی کہ وہ اٹھے اور گل بانو کے سر پر ہاتھ رکھے۔ تعزیت کے دو

بول بولے۔مگر اس نے خیال کیا، وہ مردہ ہے اور مردے تعزیت نہیں کرتے۔ وہ لیٹا رہا۔مگر وہ دیکھ رہا تھا کہ گل بانو پر سرسام کا دورہ پڑا ہے۔اس کی کیفیت عجیب ہو رہی ہے۔ٹھیک اسی وقت اس کو ہارن کی آواز سنائی پڑی۔ یہ ہارن کسی گاڑی کا ہارن نہیں تھا۔اسے شدید احساس تھا کہ اس وقت اس ہارن کا بجنا خطرے کی گھنٹی ہے۔یہ ہارن یقینی طور پر پورے شہر میں گونج رہا ہوگا۔کچھ دیر بعد ہارن بجنا بند ہوگیا۔اس نے اطمینان کی سانس لی۔لیکن اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی اور اس کا دل کہہ رہا تھا کہ کوئی غیر متوقع حادثہ ہونے والا ہے۔

اسے احساس تھا کہ ہارن کی آواز سن کر سڑکوں پر لوگوں نے جمع ہونا شروع کر دیا ہوگا۔یہ آواز اس کی کھوپڑی پر بھی اثر ڈالتی ہے۔قبر کی مٹی میں دبی ہوئی ایک کھوپڑی۔ وہ خواب میں ایک محل کا قید خانہ دیکھتا ہے۔یہاں اسے محافظ نظر آتے ہیں۔قید خانے کی کوٹھریاں کشادہ ہیں۔مگر کوٹھریوں میں نہ کھڑکی نہ روزن۔ اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے لائق ہو چکی ہیں اور وہ پہاڑی نغموں کو سنتا ہے جو قید خانے کے باہر کھڑے محافظ گا رہے ہیں۔'اور وہ ہم میں سے نہیں ہیں۔ ان کا چہرہ بھی ہم میں سے نہیں ہے۔ان کی گفتگو کا انداز بھی ہم میں سے مختلف ہے۔انہوں نے ہماری زمینوں پر قبضہ کیا ہوا ہے....اور ہم دیوتاؤں کی مدد سے انہیں ہلاک کریں گے اور ان سے اپنی زمینیں چھین لیں گے۔'

اور یہی وقت تھا، جب دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی۔ باہر سے کچھ لوگوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔سپرا ان آوازوں کو سن سکتا تھا۔

'وہ یہیں ہے...اور وہ ایک عیسائی ہے۔'

'آج صبح ایک شخص اس سے ملنے آیا تھا۔'

'وہ جاسوس ہے...اور ڈھونگ کر رہا ہے۔'



'یقیناً وہ ایک خطرناک شخص ہے۔'

دستک تیز ہوگئی۔گل بانو نے گھبرا کر سپرا کی طرف دیکھا۔سپرا نے گل بانو کو کمرے میں جانے کا اشارہ کیا۔ہارن گونجنے کے بعد ہی سپرا کو احساس ہوگیا تھا کہ کچھ خطرناک ہونے والا ہے۔اس نے مجسمہ کی طرف دیکھا۔مجسمہ سے ایک ریچھ اچھلا اور اس کے کندھے پر سوار ہوگیا۔سپرا نے دروازہ کھول دیا۔پولیس کے آٹھ دس لوگ تھے۔کچھ سپاہی۔دو بڑے افسران بھی تھے۔

وہ دندناتے ہوئے کمرے میں آگئے۔ پولیس اور افسران حیرت سے کمرے کا جائزہ لے رہے تھے۔

'پاکستان یا قبرستان۔؟'

'قبرستان۔' سپرا آہستہ سے بولا۔

'پاکستان کیوں نہیں؟'

'پاکستان ابھی قبرستان نہیں بنا۔'

'بن جائے گا۔' بڑا افسر جس نے چشمہ لگا رکھا تھا۔اس نے ایک زور کا طمانچہ سپرا کے گال پر مارا...اور یہ بڑھیا کون ہے۔قبرستان کی محافظ؟ ایک سپاہی نے کہنا چاہا۔

'نہیں۔قبرستان لے جانے والی۔'

اس بار سپرا کے رخسار پر دوسرا طمانچہ پڑا۔

اور تم کون ہو؟ افغانی؟ پاکستانی؟

'مردہ.....'

'مردے طمانچے نہیں کھاتے؟' پولیس والے نے بوٹ سے سپرا کی پشت پر

حملہ کیا۔ سپرا چکرا کر گرا، پھر کھڑا ہو گیا۔

’مردے طمانچہ کھاتے ہیں۔ مردے قبروں سے باہر نکل آئے ہیں۔‘

’کیسے؟ بڑے افسر نے پوچھا۔‘

’یہ آپ بہتر جانتے ہیں۔ آپ مردوں سے دستاویز مانگ رہے ہیں۔؟

’ہاں....‘ بڑا افسر قہقہہ مار کر ہنسا.....اور تم لوگوں کے پاس دستاویز نہیں....اور تم نے پہلے ہی قبر بنا رکھی ہے۔‘ بڑا افسر ٹھہرا۔ اس نے سیاہ چادر سے ڈھکی ہوئی قبر کی طرف دیکھا۔ ’یہ قبر کس کی ہے؟‘ وہ زور سے چلایا۔ ’تلاشی لو۔ یہاں کوئی اور بھی ہے۔‘

سپرا خاموش رہا۔ اس کے آکٹوپس غائب تھے۔ مگر سپاہیوں کے جسم سے نکلنے والی بو نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ سپاہی اور افسران موت کے فرشتہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس درمیان دو سپاہی گل بانو کو لے کر حاضر ہو گئے۔

’یہ لڑکی ملی۔ کمرے کے اندر تھی۔‘

بڑے افسر نے غور سے لڑکی کا چہرہ دیکھا اور زور سے ہنسا۔ ’اس لڑکی کی پولیس کو ایک مدت سے تلاش تھی۔ یہ وہی لڑکی ہے جس نے راٹھور کا قتل کیا تھا اور اس کی تصویریں ٹی وی پر دکھائی گئی تھیں۔‘

’میں نے کوئی قتل نہیں کیا....اور میں بھی مردہ ہوں۔‘ گل بانو نے آرام سے کہا۔ وہ اس وقت قطعی خوفزدہ نہیں تھی۔

’اچھا تو آپ نے قتل نہیں کیا۔ وہ کیسے؟‘ بڑا افسر ہنسا.....

’وہ ایسے کہ بندر آگئے، کچھوے آگئے، ندی کے پانی میں اچھال آیا۔ طوفانی ہوا کا زور تھا اور سمندر کی مچھلیاں مرگئی تھیں۔۔‘

’یہ کیا بیان ہے۔؟‘ بڑے افسر غصے سے بولا۔



گل بانو کا لہجہ سرد تھا، وہی بیان جو جو اوپر سے آتے ہیں۔ آقا دیتے ہیں۔ خدائی بیان، فوجداری بیان۔ پہلے ایک بلی آئی۔ پھر چوہا۔ پھر ہاتھی آیا۔

’غیر ذمہ دارانہ بیان....‘

افسر غصے سے بولا۔ ’تم دونوں کو گرفتار کیا جاتا ہے۔ تم کو راٹھور کے قتل کے جرم میں اور تم کو، ایک قاتل کو پناہ دینے کے جرم میں....اور ہاں ممکن ہو تو اس درمیان اپنے لیے کسی قبرستان کا بندوبست کرلو۔‘

سپرا کی آواز سرد تھی۔ ’قبرستان پر تو آپ لوگوں نے ہل چلا دیا۔‘

’ہاں۔ ہم نے ہل چلا دیا۔ ویسے بھی تم لوگوں کو دو گز زمین کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ دو گز زمین بھی ہماری ہے۔‘

آسمان کا رنگ زرد تھا۔ باہر خانہ بدوشوں کی ٹولیاں تھیں جو گاتی بجاتی سڑک سے گزر رہی تھیں۔ گل بانو اور سپرا پولیس وین میں بیٹھ گئے۔

سپرا نے صرف اتنا دیکھا، ایک بڑا سا گدھ اڑتا ہوا آیا اور عدالت کی مینار پر بیٹھ گیا۔

# باب ششم

# مردے کا مقدمہ

کافکائی مقدمہ میں
جوزف کے، کینچوے میں تبدیل ہو گیا
مگر یہاں کینچوا مردہ تھا



اور مردہ کینچوے سے
جوزف کے باہر آرہا تھا۔

"It's only because of their stupidity that

they're able to be so sure of themselves."
_ Franz Kafka, The Trial

"Logic may indeed be unshakeable, but it



cannot withstand a man who is
determined to live."
-- Franz Kafka, The Trial

(1)

## مسیح سپرا کی ڈائری سے

ہوا سرد ہے اور موت مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر۔ میں اس وقت ایک سیل میں بند ہوں اور مجھے نہیں معلوم کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میں اس دنیا کا عادی ہوں اور نہ مجھے روزن کی ضرورت ہے اور نہ کھڑکیوں کی۔ نہ میں زندہ ہوں نہ مجھے زندہ رہنے کی خواہش ہے۔ میں لاعلم ہوں کہ میرا گناہ کیا ہے اور مجھے سیل میں کیوں ڈالا گیا۔ میں ان لاکھوں کروڑوں حادثوں سے بھی لاعلم ہوں، جنہیں اٹھایا گیا اور بند کوٹھریوں میں ڈھکیل دیا گیا۔ ان میں سے ایک میں بھی ہوں اور یہاں کے لوگ مجھے تعلیم یافتہ دہشت گرد کے نام سے مخاطب کرتے ہیں اور مجھے ان کی باتوں پر کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو ایک بلیک ہول میری آنکھوں کے آگے نمودار ہوتا ہے۔ مجھے درد کا احساس نہیں ہوتا۔ جب مجھے اس کوٹھری میں لایا گیا، میں نے اس گدھ کو دیکھا تھا جو عدلیہ کے مینارے پر پنکھ

سکوڑے بیٹھا ہوا تھا۔

میں اس کیفیت کو پیچھے چھوڑ آیا ہوں جس میں ریحانہ تھی اور اس کی ایک انگلی قبر سے نکل کر میرے ہمراہ گھر آ گئی تھی۔ اس وقت اس کٹی ہوئی انگلی کی مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں مجھے گل بانو کا احساس ضرور ہے اور مجھے نہیں پتہ کہ اسے کس سیل میں رکھا گیا ہے اور کیوں۔ لیکن مجھے وارنٹ افسر نے یہ ضرور بتایا ہے کہ ہماری پیشی ایک ساتھ ہوگی اور ایک ساتھ چلے گی اور یہ اچھی بات ہے۔ مجھے علم ہے کہ ایک کوٹھری سے نکل کر مردہ خانے کی کوٹھری میں آ کر گل بانو نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ میں نے بے رحمی کے مظاہرے دیکھے ہیں...اور وہ سارے منظر میں بھولنا نہیں چاہتا۔ وہ....قبروں کی کھدائی کرنے والے.... وہ دستاویزات کے لیے قطار میں لگے لوگ اور حکام کے چابک کھاتے ہوئے.... وہ گولیاں کھانے والے...اور وہ ضحاک کے دو سانپ اور اس کے زہر سے ہلاک ہونے والے۔ میں بہت کچھ سوچتا ہوں اور اس بات سے انکار کرتا ہوں کہ مردے سوچ نہیں سکتے۔ اس ماحول میں مردے ہی سوچتے ہیں اور مردے ہی گولیاں کھاتے ہیں، میں ان سے، جو مجھے لے کر سیل میں آئے، میں کسی سے کسی شریفانہ رویہ کی توقع نہیں کر سکتا۔ شریفانہ رویے پر مجھے ہنسی آتی ہے۔ قدیم ہندوستان میں یہ رویے قیدیوں کے ساتھ بھی رائج تھے۔ اب یہ رویے انہوں نے مسخ کر ڈالے۔ یہ سائنس کو بھی نہیں مانتے۔ معصوم خانہ بدوش.... یہاں سب کچھ رامائن کے زمانے کا ہے یا رامائن سے بھی قدیم زمانے کا۔ اور میرے اندر ہمت تھی کہ میں اس بھیڑ کا سامنا کر سکوں اور میں نے کیا۔ جب گولیاں چل رہی تھیں اور میں اس بھیڑ کے قریب تھا۔ میں نے ان خانہ بدوشوں کو دیکھا تھا، جو میرے قریب سے گزرے.... اور وہاں ان کے گزرتے ہی انسانی سایے جل گئے۔ ان کے ہاتھ سیاہ اور آسمان کی طرف تھے اور



ان کی پشت سے چمگادڑ الٹا لٹکے ہوئے تھے۔ میں نے اس بوڑھے مجسٹریٹ کو دیکھا، جب میں سیل میں لے جایا جا رہا تھا، اس کی آنکھیں کمزور تھیں اور وہ نظیرے کی طرح لنگڑا کر چل رہا تھا۔ مجھے وہ صلیبیں نظر آئیں، جن کا تصور میں نے مسیح کے زمانے میں کیا تھا۔ مگر یہ صلیبیں سیل میں داخل ہونے سے قبل مجھے قدم قدم پر نظر آئیں اور ان صلیبوں میں خون لگے تھے۔ مجھے اس بات سے ناراضی نہیں کہ سیل میں لانے سے قبل مجھ پر تھپڑ اور مکّے برسائے گئے اور میری آنکھیں مار سے بری طرح سوج گئیں۔ میں ان سب سے واقف تھا، بلکہ میں سیل میں لائے جانے سے قبل کچھ زیادہ ہی سوچ چکا تھا۔ مثال کے لیے مجھے آتش دان میں ڈال دیا جائے گا۔ یا میرے جسم پر تیزاب پھینکا جائے گا یا میرے سر کو بوٹوں سے بری طرح کچل دیا جائے گا.....اور اس لیے اس تصور کے بعد میں گل بانو کا تصور کرتا ہوں کہ وہ کس حال میں ہے اور بڑے بڑے کینچوے کس حد تک اس کا گوشت کھانے میں کامیاب رہے ہیں۔

میں نے دیکھا، زمین پر بچھا ہوا ایک بستر ہے۔ ایک گندہ سا ٹائلٹ، بوسیدہ دیواریں.....اور میرے جسم سے ٹیس اٹھ رہی ہے۔ جبکہ مجھ کو مارنے والے مجھ سے خائف تھے۔ وہ بار بار میرے لباس اور بڑھی ہوئی داڑھی کو دیکھ رہے تھے اور پوچھ رہے تھے، کیا تم صحیح میں مردہ ہو۔ میں ہر بار ہاں میں جواب دیتا۔ مگر جب میں نے کہا کہ میں ایک بری روح ہوں تو مجھے پیٹنے والے دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔

مجھے رات اور دن کے ہونے کا احساس نہیں ہے۔ وقت گزارنے کے لیے میں چھپکلی اور چیونٹے سے کھیلتا ہوں۔ دیواروں پر انگلیوں سے تصویر بناتا ہوں.... اور اس قلعے کو دیکھتا ہوں جو اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے۔ میں ریحانہ کو دیکھتا ہوں،

جو مجھ سے ملنے آئی ہوئی ہے اور سلاخوں کے باہر کھڑی ہے۔اس کے دائیں ہاتھ میں چار انگلیاں ہیں۔ میں اسے آغوش میں لینے کے لیے اپنی باہیں پھیلاتا ہوں۔ میں اپنے بیٹے کو دیکھتا ہوں، جو مجھ سے خائف ہے۔ مجھ سے زیادہ اس کوٹھری کو دیکھ کر خائف ہے، جس میں مجھے قید رکھا گیا ہے۔ جب دو پولیس والے مجھے لے کر سیل میں آئے اور وہ مجھے مار رہے تھے تو مجھے شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ وہ میرے منہ سے کچھ سننا چاہتے ہیں۔مگر میں اس وقت کافور کی مہک سونگھ رہا تھا اور مجھے ایسے کمتر الفاظ پیارے نہیں تھے،جن سے میں نے زندگی میں کبھی دوستی نہیں کی تھی۔ میں ان دنوں کو یاد کرسکتا ہوں جب میں پارلیامنٹ میں تھا اور میرے ساتھ اکثر میزیں تھپتھپا کر کچھ ایسا بول جاتے تھے جن میں تضحیک کے آتشی سیال ہوتے تھے اور جنہیں دہرانا بھی میرے بس کی بات نہیں ہوتی تھی۔

شام میں ایک افسر آیا، اس نے بتایا کہ گل بانو خانہ بدوشوں کے پاس ہے اور خیریت سے ہے۔ اس کی ہتھ کڑیاں کھول دی گئی ہیں اور جلد اسے پیشی کے لیے لے جایا جائے گا۔کافی دیر تک کھڑے رہنے کے بعد مجھے چکر آرہے تھے۔ سانسوں میں بھی گھٹن کا احساس ہورہا تھا۔ مجھے رات کا کھانا دیا گیا مگر مجھ سے کھایا نہیں گیا۔ ابھی میں مجرم ثابت نہیں ہوا تھا مگر مجھے اس سیل میں جگہ دی گئی جہاں پہلے سے ہی، بہت سے خطرناک قیدی موجود ہیں۔ ان قیدیوں کے درمیان میں بھی کسی خطرناک قیدی سے کم نہیں ہوں....اور جیسا کہ اس افسر نے میرے حلیے کو دیکھ کر کہا، یہاں جو خطرناک قیدی ہیں، تم ان سے کہیں زیادہ خطرناک نظر آرہے ہو۔ مجھے اس تعریف سے کوئی الجھن نہیں ہوئی، یہاں جو بھی آتا، افسر یا سپاہی، وہ مجھ سے کمترین لفظوں کی امید کرتے،مگر میں نے اپنے ہونٹ سل دیئے ہیں...اور الفاظ کے بارے میں میرا نظریہ وہی ہے، جو میں نے اس وقت قائم کیا تھا، جب



میں کرائم اسٹوری لکھتا تھا۔ اور میرا نظریہ یہ تھا کہ الفاظ قیمتی ہوتے ہیں۔ سخاوت الفاظ کی شدت اور حدّت کو بیمار کردیتے ہیں۔

## دوسرا دن

گزشتہ شب میرے کمرے کی تلاشی لی گئی اور یہ میرے لیے مضحکہ خیز تھا کہ اب اس حال میں تلاشی لینے کی کیا ضرورت ہے۔ انہوں نے میرے لباس کی بھی تلاشی لی اور پوچھا، بندوق چھپا کر کہاں رکھی ہے۔ میں نے پوچھا، جو آپ کے افسر مجھے دے گئے تھے۔؟ اس بات پر سپاہی نے مجھے ایک زور کا طمانچہ مارا۔ مگر اب میں ان چھوٹی موٹی باتوں کا عادی ہوچکا ہوں۔ میں پھر اسی نتیجہ پر پہنچ رہا تھا، کہ یہاں کوئی بھی زندہ نہیں ہے۔ دیواریں مردہ، فرش مردہ، سلاخیں مردہ، قیدی مردہ...الفاظ مردہ...سلاخوں کے باہر ٹہلتا ہوا سپاہی بھی مردہ، وہ ایک بدوضع ڈھیلی ڈھالی پگڑی پہنے تھا...اور بار بار میری سلاخوں کے سامنے آکر کھڑا ہوجاتا۔ میں نے اس سے دریافت کیا۔

تم نے چوہا دیکھا؟

وہ اچانک چونک گیا.... چوہا....

ہاں۔موم کی طرح نرم چوہا۔ وہ ان دیواروں پر ہے اور مجھے ڈراتا ہے۔

’پاگل...‘

وہ دوبارہ پہرہ دینے لگا۔ میرے سیل کے پاس والے کمرے کا ایک قیدی مرگیا تھا۔ وہ بزرگ تھا اور دمّے کا مریض۔ مجھے اس کے جسم سے اٹھنے والی بو کا احساس تھا۔ پہرہ دینے والے سپاہی نے بتایا تھا کہ یہاں جیل میں مرنے والوں کا حساب نہیں رکھا جاتا۔کل تم بھی مر سکتے ہو اور تمہیں بھی کسی ندی نالے میں بہا دیا

جائے گا یا کسی قدیم کنویں پھینک دیا جائے گا۔

دوسرے دن کھانے کے وقت میں کئی قیدیوں سے ملا۔ ایک قیدی میرا ہم عمر اور ہم خیال تھا اس نے بتایا کہ ایک دن وہ بھاگ جائے گا جبکہ جیل سے بھاگنا آسان نہیں ہے....اور یہ بھی بتایا کہ اس کا نام اس کا دشمن ہے اور اس لیے یہاں کے لوگ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ایک مخصوص نام کے ساتھ یہاں یہی سلوک کیا جاتا ہے۔ اس نے بہت کچھ ایسا بتایا، جس پر یقین کرنا مشکل ہے۔ مثال کے لیے اس نے بتایا کہ اس جیل میں برف کے کچھ کمرے ہیں اور ان کمروں سے آوازیں آتی ہیں۔ پچھلی بار اس کے زندہ ساتھی کو اس کمرے میں پھینک دیا گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہاں کے افسران کا رویہ خوفزدہ کرنے والا ہے اور ان کی انگلیاں قینچیوں کی طرح ہیں اور انسانی جسم کاٹنے میں یہ قینچیاں مہارت رکھتی ہیں۔ یہ نیا انکشاف تھا اور اپنے حجرے میں واپس لوٹنے تک مجھے اختیار تھا کہ میں اپنے بارے میں سوچ سکوں۔ وہ سب چلے گئے، جن کے بارے میں سوچتا تھا کہ یہ لوگ کبھی نہیں جائیں گے۔ یہ لوگ پتھر کے وزنی ٹکروں سے بندھے ہیں....اور ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گے۔ لیکن یہ سب مجھے فریب دے رہے تھے اور میں نے بھی زندگی کو فریب دینے کی کوشش کی۔ میں مردہ گھر میں آ گیا۔ کچھ خانہ بدوش فاختائیں ذبح کر رہے تھے۔ کچھ گھروں کو خاکستر کر رہے تھے۔ کچھ بجھی ہوئی راکھ کے بھبھوت ماتھے پر مل رہے تھے اور انگلیوں سے فتح کے نشان بنا رہے تھے....اور میں دیکھ سکتا تھا کہ ایک بڑی آبادی جیل میں ہے اور مردہ ہے۔ چودہ برس کا بنواس کاٹ کر کچھ مردے قبر سے باہر نکلتے ہیں تو ناکارہ اور بے حس اور کسی کام کے نہیں ہوتے۔ میں ایسا بہت کچھ دیکھ رہا تھا۔



یہ میرا زندان نہیں ہو سکتا۔ یہاں ہر قدم، ہر موڑ پر کچھ خانہ بدوش کھڑے ہیں۔ اور میں نے ایسے مناظر زندان میں پہلے کبھی نہیں دیکھے۔ پہلے کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ کچھ لوگ ہمیں اجنبی بنانے کے لئے ہمیں اس خاک سے جدا کرنے کی کوشش کریں گے، جس کی محبت نے ہم آشفتہ سروں کو جان دینے کے لئے تو مجبور کیا مگر یہ مٹی کی محبت تھی کہ ہم نے ہجرت قبول نہیں کی۔ اور ہجرت قبول نہ کرنے کے باوجود حال یہ ہے کہ، وہ قرض چکائے ہیں جو واجب بھی نہیں تھے۔

آزادی کے بعد خانہ بدوشوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ خانہ بدوشوں کی موجودگی کے باوجود بھی کبھی ہمارے کالر آلودہ نہیں ہوئے۔ کبھی ہم دوسرے تیسرے بلکہ چوتھے درجے کے مسافر نہیں بنے۔ کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ کچھ ابن الوقت خداؤں نے ہمیں جلا وطن کرنے کا فرمان سنا دیا ہے۔ کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ اسکولوں، کالجوں، اسپتالوں میں اور زندگی کے ہر شعبہ حیات میں یہ دیکھنے کی کوشش ہوگی کہ کون خانہ بدوش ہے اور کون نہیں؟

کبھی کسی اسپتال کے دروازے محض اس لئے بند نہیں ہوں گے کہ یہاں غیر خانہ بدوشوں کا علاج نہیں ہوتا۔ بیحد خوفناک دنوں میں ان آنکھوں نے کیا کیا نہیں دیکھا؟ اور یہ آنکھیں اب بھی دیکھ رہی ہیں اور دم بخود ہیں کہ خانہ بدوش زندگی پر موت کا سیاہ پردہ کیوں ڈال رہے ہیں؟ ایک غیر خانہ بدوش سڑک پر گرا ہوا ہے۔ کچھ لوگ اسے گھیرے ہوئے ہیں اور وہ خانہ بدوشوں کے جوتوں کی خاک چاٹ رہا ہے۔

ایک سبزی والے کو مارا جا رہا ہے۔ غیر خانہ بدوش عورتوں کو گھروں میں داخل ہو کر پیٹا جا رہا ہے۔ غیر خانہ بدوش لڑکیوں کی عصمت تار تار کر دی گئی ہے۔ کوئی

غریب غیر خانہ بدوش ٹرک سے گھر لوٹ رہا ہے، کوئی ٹوپی پہن کر کہیں جا رہا ہے مگر اسے خبر نہیں کہ اب وہ گھر نہیں پہنچے گا۔ وحشی ہجوم اسے ہلاک کرنے کے لئے گھات لگائے بیٹھا ہے۔

مینارے شہید کیے گئے۔ ایک غیر خانہ بدوش بزرگ کی داڑھی پکڑ کے سڑکوں پر گھسیٹا گیا۔ میڈیا نے تیزاب سے فصلیں تیار کیں اور یہ فصلیں پک گئیں تو موت کے دروازے کھول دیے گئے۔

ایک دن آنکھیں بند اور سب کچھ ختم۔ کیا نئی نسل اسی مردہ بازار میں پیدا ہوگی؟

اور جب جب ایسا محسوس کیا، مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ میرے بازؤں میں طاقت نہ کے برابر ہے۔ میں چھت کے پنکھے سے جھول رہا ہوں... اور کسی کمزور بچے کی طرح میرے پاؤں چھوٹے ہوگئے ہیں۔ اور میں خانہ بدوشوں کی آواز سنتا ہوں۔ مجھے سڑک پر روک کر ایک خانہ بدوش نے کہا، تم لوگوں کی ضرورت نہیں ہے۔ سنا تم نے۔ میں گھر آیا تو میں نے محسوس کیا، میرا جسم اکڑ گیا ہے اور میں برف میں تبدیل ہوں۔ برف کا آدمی۔ اس وقت ریحانہ زندہ تھی۔ میں ریحانہ کے سامنے کھڑا ہوگیا اور مجھے یاد ہے، میں نے اپنے کپڑے اتار دیئے تھے اور میں ریحانہ سے کہہ رہا تھا۔ اسنو مین۔ تمہارے سامنے ایک برف کا آدمی کھڑا ہے.... دیکھو..... میرے سارے جسم پر برف ہی برف ہے۔ اور میرا جسم یخ ہو رہا ہے۔ جسم سے نکلنے والے پسینے بھی برف میں تبدیل ہوگئے ہیں اور میں اکڑ گیا ہوں۔ اس حالت میں بستر پر لیٹ نہیں سکتا۔ مجھے گرم شاور کی ضرورت ہے اور ریحانہ نے کہا تھا، ایک ننگا بھالو۔ جیسا کہ تم اس وقت ہو۔ اور تمہیں گرم شاور کی بالکل بھی ضرورت نہیں۔ تمہیں ایک مادہ بھالو کی ضرورت ہے۔ وہ ہنسی اور اس کے سفید



ہیرے جیسے دانت سامنے آگئے تھے۔

## تیسرے دن

صبح نو بجے وارنٹ افسر نے کہا کہ آج میری پیشی ہے... اور میں چاہتا تو بہت کچھ کرسکتا تھا۔ مگر... تم نے سنا، اب بندر بھی خوفزدہ ہو رہے ہیں۔ میں چاہتا تو تم سے کئی طرح کے کاغذات پر دستخط لے سکتا تھا یا تمہیں مار کر کہیں بھی پھینک سکتا تھا۔ مگر بندر بھی اب تبدیل ہو رہے ہیں۔ بندروں کو خوراک نہیں مل رہی.... اور کچھ بندروں نے سرعام بغاوت بھی کردیا ہے اور یہ تمہارے لیے اچھی خبر ہے کہ ابھی تک زندہ ہو اور محفوظ ہو۔ بندروں کا شکر کرو کہ وہ بھی باغی ہو رہے ہیں۔

11 بجے میں پولیس گاڑی میں بیٹھ گیا۔

عدالت میں میری پہلی پیشی تھی۔

## (2)

مسیح سپرا نے جیل میں ہی غسل کیا۔ جیل میں ہی ناشتہ کیا، وہ دیر تک سیل میں ٹہلتا رہا۔ چھپکلی دیوار پر موجود تھی اور اس کی موجودگی سپرا کو اچھی لگتی تھی۔ وہ دیر تک چھپکلی کو اوپر نیچے، شرارتیں کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کا قیاس ہے کہ دیوار سے چپک کر چھپکلی کی ایک آنکھ دیوار میں بھی بن جاتی ہے اور وہ دیکھنے والے شخص پر شکاری کی طرح نظر رکھتی ہے۔ معمول کی طرح سپرا نے وہی لباس زیب تن کیا، جو مردہ خانہ سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس نے جیل میں داڑھی ترشوانے سے بھی انکار کردیا۔ اسے کسی وکیل کی بھی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ وہ ایک مردہ تھا۔ اور مردوں کو کسی وکیل کی حاجت نہیں ہوتی۔ تاہم وہ اس بات سے خوش تھا کہ کافی دنوں بعد اس کی ملاقات گل بانو سے ہوسکتی ہے۔

جیل کے کمرے میں ٹہلتے ہوئے وہ دیر تک انصاف کے رویوں پر غور کرتا رہا۔ اس کو پرانی عمارت یاد تھی۔ وہ خانہ بدوش بھی یاد تھے جو پرانی عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجا رہے تھے۔ نچلی عدالت سے، ہائی کورٹ، پھر سپریم کورٹ تک جو فیصلے آئے وہ خانہ بدوشوں کے حق میں تھے۔ جبکہ خانہ بدوشوں کی حرکتوں کو مجرمانہ فعل کہا گیا تھا اور تمام ثبوت وشواہد پرانی عمارت کے حق میں تھے۔ مگر اس کے باوجود تمام



دلائل وثبوت بیکار گئے اور بھگوان جیت گئے۔ بھگوان جنہوں نے ۷ جنوری کو غائب کردیا۔ بھگوان نے پرانی عمارت کو بھی غائب کردیا، ثبوت وشواہد کے ہوتے ہوئے۔ اس لیے عدالت میں اس کے یا گل بانو کو لے کر کیا فیصلہ ہوگا، وہ اس بارے میں زیادہ کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے خوشی ہوئی کہ جیل کی سلاخوں کے اندر وہ بو دوبارہ آ گئی تھی اور چادر سے لپٹے ہوئے آکٹوپس بھی دوبارہ اس کے ساتھ چہل قدمی کرنے لگے تھے۔

وہ مطمئن تھا، مگر اس نے عدالت کی مینار پر پنکھ سکوڑے بیٹھے گدھ کو بھی دیکھا تھا۔ تاہم ابھی اس خیال کو رفع دفع کرتے ہوئے وہ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ ہڈی.... سور.... سور کے ہاتھوں میں ہڈی..... اور لہراتے ہوئے پرچم اور وہ مخصوص بو جو آکٹوپس کے پاؤں سے الجھ کر سلاخوں کے باہر پھیل رہی تھی۔

انصاف اور بُو.... اسے بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔

فاضل عدالتوں میں کسی معاہدے کی بنیاد پر کیس کو ختم کرنے کے خلاف سپریم کورٹ کی طرف سے دیئے گئے سخت فیصلے کے دوررس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ عدلیہ نے فیصلہ دیا تھا کہ ڈکیتی، عصمت ریزی اور قتل جیسے معاملات میں فریقین کے مابین عدالت سے باہر ہونے والے کسی بھی سمجھوتہ کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

عام طور پر کمرہ عدالت کے پچھلے حصے میں جج کا ایک اور کمرہ ہوتا ہے جس میں اس سے ملاقات کی جاسکتی ہے لیکن جج سے ملنے کے لئے، اس کے چپراسی یا اسٹینو کے ذریعہ ایک پیغام بھیجا جانا پڑتا ہے اور وہ اس کلرک کے ساتھ مل جاتا ہے جو اس کی تاریخ رکھتا ہے۔ لہٰذا، نچلی عدالت میں کھلے عام رشوت لینے سے روکنے کے لئے ٹھوس اقدام ابھی تک دیکھنے میں نہیں آیا ہے۔ وکلاء بھی اس کے عادی ہوچکے

ہیں۔
اسے خیال آیا کہ وہ مردہ خانے سے کسی دوزخ میں آ گیا ہے اور اس کے نصیب میں یہ دوزخ ہے جہاں سیاہ اور بدکار حبشی ہیں۔ اپنی عذر خواہی کے ساتھ وہ ایک ایسی شکل میں واپس آیا ہے کہ اس کے چہرے پر نور کا سایہ تک نہیں اور چہرے پر پھٹکار برس رہی ہے۔ اس نے دوزخ کی ویرانیوں کا خیال کیا اور اس بات کا بھی کہ عدالت میں اسے کیا جواب دینا ہے۔ وہ ناراض تھا کہ ایک مردے کو دوزخ کی عدالت میں لایا گیا ہے اور یہ کسی جرم سے کم نہیں۔

سپرا کو اندازہ تھا کہ اس طرح کی جیلوں میں قیدیوں کے ساتھ کس طرح کا سلوک کیا جاتا ہے۔ ایک قیدی کو گرم تارکول پر چلایا گیا۔ بید کے مضبوط ڈنڈوں سے پیٹا گیا۔ اس نے آوازیں سنی تھیں۔ چیخنے کراہنے کی آوازیں... قیدیوں کی ننگی پشت پر سرخ آگ کے گولے سے نشانات بنائے گئے... اور کچھ ایسے بھی قیدی تھے، جو اس جہنم میں لائے گئے اور دو چار لات گھونسوں کے بعد ہی وہ جہنم رسید ہوگئے۔ ان کی عورتیں نالہ کرتی رہ گئیں مگر پولیس والوں کو کوئی فرق نہیں پڑا۔ اور وہ قیدی جو ایک سانڈ کے ساتھ پکڑا گیا تھا، اس کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی مگر وہ جیل کی زیادتیوں کو برداشت نہیں کر پایا۔ سانڈ تو کھلے میں چھوڑ دیا گیا مگر اس کی روح پرواز کر گئی۔ ایسے ایسے بیشمار قصے تھے، جو اس وقت سپرا کو یاد آ رہے تھے۔ اور اس بات کے لیے وہ تیار تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر اپنا گناہ قبول نہیں کرے گا۔ وہ مردہ ہے اور اس نے کوئی گناہ، کوئی جرم نہیں کیا۔ اس کے تصورات میں حرارت تھی اور وہ اپنی کھوپڑی کے اندر الفاظ کی مبہم شکلوں کو ایک دوسرے میں پیوست ہوتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ صوتی آہنگ کی بھنبھناہٹ سے جن لفظوں کی تشکیل ہو رہی تھی وہ کچھ اس طرح



تھیں.... بھم بھم... ڈم... ڈم... پرانی عمارت.... دوزخ.... مردہ خانہ... بھم بھم... واپس لوٹتی ہوئی گولیاں.... کٹے ہوئے سر... ڈم ...ڈم۔ اس کے سامنے مغلوب سرگوشیوں کی کوئی واضح تصویر نہیں تھی مگر پرانی عمارت کی وہ تصویر زندہ ہوگئی تھی، جسے اس نے قریب سے دیکھا تھا۔ وہ بدمزاجی کے ساتھ گھر لوٹا تھا اور بہت دن تک خانہ بدوش اس کے خوابوں میں آتے، وہ انہیں بندروں کی مانند اچھلتا کودتا اور مینارے توڑتا ہوا دیکھتا رہا۔ وہاں کبوتر بھی تھے جو اڑے اور دھند میں غائب ہوگئے۔ اور اس نے وہ برف کا قلعہ بھی دیکھا تھا، جہاں سروں پر ٹوپی پہنے افراد 'ہمدردی کی موت' کے لیے التجا کر رہے تھے۔ اور اس نے دیکھا، کچھ لوگ ہیں جو ان افراد پر کوڑے برسا رہے ہیں۔
سپرا کو وارنٹ افسر کی بات یاد آئی۔ جس نے کہا تھا کہ بندر بھوکے ہیں اور بندروں میں بغاوت ہے اور اسی لیے وہ محفوظ ہے، ورنہ اب تک وہ چیل اور گدھوں کی خوراک بن چکا ہوتا۔ لیکن وارنٹ افسر یہ بھول گیا کہ وہ زندہ ہی کب ہے جو چیل اور گدھوں کی خوارک بنتا۔

کنکر ڈوما کورٹ۔ باہر ایک بڑا سا آہنی دروازہ۔ آہنی دروازے کے پاس سیاہ ڈریس میں بہت سے وکیل ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ ان میں لڑکیاں بھی تھیں اور سب کے ہاتھوں میں فائلوں کا وزن بہت زیادہ تھا۔ پولیس جیپ رُکی۔ وہ پولیس کے دو سپاہیوں کے ساتھ اترا۔ دو قدم چلتے ہی اسے پولیس والوں کے ساتھ گل بانو نظر آئی۔ گل بانو کے ساتھ اس کا وکیل بھی تھا۔ گل بانو نے سفید لباس پہن رکھا تھا اور اس وقت وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ گل بانو نے سپرا کو بتایا کہ یہ ایسا معاملہ ہے، جہاں اس کی موجودگی کی اہمیت ہے اور اس کا وکیل اس کا خاص خیال

رکھے گا۔گل بانو کے وکیل کا نام سنتوش چوپڑا تھا۔ اس نے سپرا سے پولیس کی موجودگی میں دو ایک باتیں پوچھیں اور یہاں سے ہوکر وہ کورٹ کی تیسری منزل پر پہنچ گئے، جہاں سنوائی ہونے والی تھی۔ یہاں بھی سپرا کو مخصوص بُو کا احساس ہو رہا تھا اور اسے یہ بھی خیال تھا کہ اس کے قدموں کے ساتھ گھسٹتے ہوئے آکٹوپس یہاں بھی آچکے ہیں اور وہ ان کی شناخت کرسکتا ہے۔

سپرا نے گل بانو سے آہستہ سے پوچھا.....

کیا تمہیں بُو کا احساس ہو رہا ہے.....

ہاں....بطخیں ہیں اور سمندری چیونٹیاں

’یہاں کیا ہوگا؟‘

گل بانو ہنسی....مردوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے....؟

ہاں مردے....بطخیں اور سمندری چیونٹیاں....

گل بانو نے بتایا، جو جج ہے اس کا نام بھی راٹھور ہے۔ کرشن پرساد راٹھور۔ ایک اور ریچھ۔‘

’یہ ریچھ برف میں کیا کرتے ہیں۔؟‘

’سوکھے، مردہ جانوروں کو کھاتے ہیں۔‘ وہ بلا وجہ ہنسی۔ مگر میں خوفزدہ نہیں ہوں۔ مجھے ریچھ کے شکار میں مزہ آتا ہے اور بھالو کے شکار میں بھی....اور میں موسیقی سنتی ہوں، جو مجھے سکون دیتی ہے اور میں تصویریں بناتی ہوں، جس پر اکثر برف جم جاتی ہے....اور برف میں دبے جانور ابھر کر کینوس پر پھیل جاتے ہیں۔‘

’برف میں جمے جانور۔‘ سپرا نے سر ہلایا۔

یہ پہلی پیشی تھی اور اسے سکون میسر تھا کہ کوئی ناگوار حادثہ پیش نہیں آئے گا۔ جج



ایک پستہ قد آدمی تھا۔ رنگ سیاہ۔ آگے کی کرسیوں پر سیاہ پوش وکیلوں نے اپنی جگہ لے لی تھی۔ گل بانو اور سپرا کو اپنی باری کا انتظار تھا۔ کھڑکی سے باہر سپرا کو نیلے آسمان پر برف جمی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا قیاس تھا کہ کہیں دور یقیناً برف گری ہوگی اور اس لیے نیلے آسمان پر برف کے دھبّے موجود ہیں۔ بطخیں، سمندری چیونٹیاں اور ریچھ۔ اب اسے سنوائی کا انتظار تھا اور تقریباً آدھے گھنٹے بعد گل بانو اور سپرا کا نام پکارا گیا۔ پولیس کے ساتھ اور وکیل کے ساتھ یہ دونوں لوہے کی جالی کے پیچھے کھڑے ہوگئے۔

سپرا کے لیے یہ جاننا دلچسپ تھا کہ سرکاری وکیل نے گل بانو کے خلاف بارہ سو صفحات پر مشتمل رپورٹ تیار کی تھی اور سپرا کے خلاف رپورٹ سترہ سو صفحات پر مشتمل تھی۔ رپورٹ میں دونوں کو ہی خطرناک اور دہشت گرد بتایا گیا تھا۔ سپرا کو یقین تھا کہ یہ رپورٹ کئی پیشیوں کے بعد ہزاروں صفحات میں تبدیل ہوجائے گی۔ پہلے گل بانو کا نام پکارا گیا۔

سرکاری وکیل نے جرح کرتے ہوئے بتایا کہ یہ لڑکی باغ کے احتجاج میں بھی شامل تھی اور جیسا کہ آپ کو علم ہے می لارڈ کہ وہاں دہشت گرد تھے اور ایسے لوگوں کا کام ملک میں دہشت گردی کی فضا قائم کرنا ہے۔

سرکاری وکیل نے صاف کیا، کہ یہ لوگ حکومت کو نہیں مانتے، عدلیہ کو نہیں مانتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ مخالفت کا راستہ اپناتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ملک کی امن وشانتی کے لیے خطرہ ہیں....اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی وجہ سے قیمتیں بڑھتی ہیں۔ جن کی وجہ سے بے روزگاری ہے۔ یہ لوگ آئی ایس آئی ایجنٹ بن جاتے ہیں اور دشمنوں کی مدد کرتے ہیں۔ ہم فلائی اوورس بناتے ہیں، یہ توڑ دیتے ہیں۔

یہ ایک مذہبی زبان بولتے ہیں جو ہمارے ملک کے لیے اجنبی ہے۔ یہ کشمیری اور پاکستانی جہادیوں کے ساتھ ہیں اور ان میں بڑی تعداد میں گل بانو جیسی لڑکیاں شامل ہیں۔

سرکاری وکیل نے راٹھور کی خصوصیت بتاتے ہوئے کہا، ایک شریف ایماندار افسر، جس نے باغ میں ہونے والے احتجاج کو ختم کرایا۔ جو ساری زندگی اپنا فرض نبھاتا رہا، گل بانو رات گیارہ بجے ہوٹل پہنچی....اور ایک فرض شناس ایماندار پولیس افسر کا قتل کر کے فرار ہوگئی۔ گل بانو نے سنگین جرم کیا ہے اور اس کو پھانسی سے کم سزا نہیں ہونی چاہیے۔

جج نے گل بانو اور اس کے وکیل کی طرف دیکھا۔ وکیل نے اپنی رپورٹ جج کی طرف بڑھادی۔ جج نے ایک نظر رپورٹ کی طرف ڈالی۔ پھر گل بانو سے پوچھا۔ تم اقرار کرتی ہو کہ تم نے قتل کیا ہے۔

’نہیں۔‘

سرکاری وکیل نے کہا، یہ جھوٹ بولتی ہے سر۔ تمام ثبوت اس بات کے گواہ ہیں۔ سی سی ٹی وی فوٹیج بھی موجود ہے، جب یہ ریسپشن سے باہر نکل رہی تھی۔ ہاں راٹھور جس کمرے میں ٹھہرا تھا، وہاں خفیہ کیمرہ موجود نہیں تھا۔ ہوٹل کے منیجر کے مطابق وہ کمروں میں خفیہ کیمرہ نہیں لگاتے۔ مگر جس وقت یہ لڑکی ہوٹل سے باہر جارہی تھی، اس وقت کے فوٹیج موجود ہیں۔

’اس وقت کیا وقت ہوا تھا؟‘ گل بانو کے وکیل نے پوچھا۔

’ایک بج کر سینتیس منٹ۔‘

’دن کونسا تھا۔‘

’چھ جنوری۔‘



’غلط۔ گل بانو کے وکیل نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس دن چھ جنوری تھا۔ یہ حقیقت ہے۔ مگر بارہ بجے کے بعد تاریخ بدل گئی۔ یعنی ۷ جنوری۔ ۷ جنوری، رات ایک بج کر سینتیس منٹ۔

’ہاں۔‘ سرکاری وکیل نے کہا۔

’تو آپ غداری کر رہے ہیں،‘ گل بانو کے وکیل نے کہا۔ بھگوان نے ۷ جنوری کی تعریف غائب کردی، گل بانو کے وکیل نے جج صاحب کی طرف دیکھا۔

’جب ۷ جنوری ہندوستانی کیلنڈر میں موجود ہی نہیں ہے تو قتل کیسے ہوا؟ کہاں ہوا؟ ممکن ہے راٹھور غائب ہوگیا ہو۔ ان دنوں ستارے، سیارے بھی غائب ہو رہے ہیں۔ بڑی تعداد میں سانڈ اور گائیں لاپتہ ہوگئیں۔ کبھی کبھی حکمراں بھی غائب ہوجاتے ہیں۔ پھر کابل، فرانس، اٹلی، چین، جاپان سے برآمد ہوتے ہیں۔‘ گل بانو کے وکیل کا لہجہ سخت تھا....اور اس بات کا اعتراف آپ بھی کریں گے می لارڈ کہ ۷ جنوری کے غائب ہونے کی بات کسی عام آدمی نے نہیں کی تھی۔ ایک طاقتور آدمی نے کی تھی۔ ملک کی دو بڑی طاقتیں اور ان میں ایک نے ساکشات بھگوان کے درشن کیے تھے....

جج نے خاموشی سے گل بانو کی جانب نگاہ اٹھائی۔

تم ہوٹل کیا کرنے گئی تھی؟

راٹھور سے ملنے۔

کتنا بجا تھا؟

’ٹھیک گیارہ۔ میں نے پہنچنے کے بعد موبائل دیکھا تھا اور اسی لیے مجھے وقت یاد ہے۔‘

’اور تم نے قتل نہیں کیا۔‘

’بالکل بھی نہیں۔‘

سرکاری وکیل نے کہا۔ اس نے قتل کیا ہے اور اس دن چھ جنوری تھا۔

گل بانو کے وکیل نے مداخلت کی۔ اور جیسا میں نے کہا می لارڈ۔ 12 بجے کے بعد وقت تبدیل ہو چکا تھا۔ ۷ جنوری، جو کیلنڈر میں موجود نہیں ہے۔ اور یہ دن ہم نے نہیں بلکہ دیوتاؤں نے غائب کیے ہیں اور ۷ جنوری پر ایمان لانا حب الوطنی نہیں غداری ہے۔

’ہونہہ۔‘

جج نے گہری سانس لی۔ پیچھے بیٹھے پیشکار کو کچھ نوٹس لکھوائے اور پھر جج نے مسیح سپرا کی طرف دیکھا۔ اس کے لباس کو۔ اس کی بڑھی ہوئی داڑھی کو... اور ناراضگی سے پوچھا....

’یہ سب کیا ہے...‘

’لباس...‘

’مگر یہ لباس تو نہیں ہے...‘

’ ہاں، لباس نہیں ہے۔ کفن ہے.... سفید کفن.... سپرا نے آہستہ سے کہا۔

’مگر کفن تو مرنے کے بعد.....‘ جج نے غصے سے سپرا کی طرف دیکھا۔

’میں بھی لاش ہوں، مردہ...‘

’مردہ...‘ جج نے حیرانی سے کہا، کیا مردے بولتے ہیں؟

’ہاں بولتے ہیں۔ چلتے ہیں۔ سڑک پر اگر ایک ہزار آدمیوں کا قافلہ ہے تو ان میں پانچ سو مردے ہوتے ہیں۔ مردے زندہ آدمیوں کے ساتھ گھروں میں بھی رہتے ہیں۔ میں بھی ایک مردہ ہوں بلکہ جن سپاہیوں نے میرا گھر دیکھا ہے، آپ ان سے پہلے بیان لیجیے۔



سپاہی نمبر ایک چلتا ہوا جج کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کا لہجہ خوفزدہ تھا۔

’ہاں سرکار۔ میں تین بار اس کے گھر گیا۔ اس نے اپنے گھر پر مردہ خانے کا بورڈ لگا رکھا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ آبادی والی جگہ پر مردہ خانہ نہیں ہو سکتا۔

’پھر....‘

’اس نے بورڈ ہٹا دیا۔ مگر ایک بار مجھے اس کے کمرے کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میں بہت ڈر گیا تھا۔ بھوتاہا کمرہ تھا.... اور یہ شخص بھی بھوت تھا۔‘

دوسرے سپاہی نے کہا، جب ہم اسے گرفتار کرنے گئے تو وہاں ایک قبر نظر آئی اور ایک عورت.....

’عورت کون؟‘ جج نے پوچھا۔

سپرا نے بتایا۔ موت کا فرشتہ۔

’فرشتہ؟‘ جج کو فرشتہ کا مطلب نہیں معلوم تھا۔

سرکاری وکیل نے بتایا۔ پران ہرن کرنے والا.... یمراج...

تو کیا تم نے پران ہرن کرنے والے کو اس کے کمرے میں دیکھا تھا؟

’ہاں۔‘ سرکاری وکیل نے اعتراف کیا۔ وہاں اندھیرا تھا اور ایک مورتی تھی جس کو یہ آدمی موت کا فرشتہ کہہ رہا ہے۔

’تو یہ مردہ ہوا؟‘

’نہیں می لارڈ، میں آپ کو اس کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔‘

1800 صفحات پر مشتمل فائل جج کو پیش کی گئی۔ جج نے اس فائل کو دیکھنا اس وقت ضروری نہیں سمجھا۔ یہ فائل پیشکار کی طرف بڑھا دی۔

سرکاری وکیل نے بولنا شروع کیا۔ ’یہ آدمی پہلے مصنف تھا۔ مرڈر کی کہانیاں لکھتا تھا۔ یہ واقف تھا کہ مرڈر کیسے کیے جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ پہلے بھی اس نے مرڈر

کیے ہوں۔مگر ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے یہ پکڑا نہیں گیا۔ یہ آدمی راجیہ سبھا کا ممبر بھی بن گیا۔جبکہ ایسے کسی آدمی کو راجیہ سبھا تک پہنچنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ یہ راجیہ سبھا سے نکالا گیا...اور اب سے کچھ مہینے پہلے اس نے اپنے گھر کو مردہ گھر بنالیا۔بلکہ میں تو کہتا ہوں، یہ کسی انٹرنیشنل گروہ کا حصہ ہے۔ورنہ آپ ہی سوچیے، کیا کوئی اپنے گھر کو مردہ گھر بنا سکتا ہے۔ اس سازشی آدمی سے یہ اگلوانا ضروری ہے کہ یہ کس کے لیے کام کرتا ہے اور ملک کے خلاف کیا سازش کررہا ہے۔'

'میں مردہ ہوں۔' سپرا نے زور سے کہا۔

سرکاری وکیل نے دوبارہ کہا۔'اور اس کا دوسرا بڑا جرم یہ ہے کہ اس نے ایک قاتل کو پناہ دی اپنے گھر.....'

'گھر نہیں مردہ خانہ.....اور مردہ خانہ میں کوئی بھی مردہ آسکتا ہے۔'

سرکاری وکیل نے گل بانو کی طرف اشارہ کیا۔ اس لڑکی کو دیکھیے می لارڈ، کیا یہ مردہ نظر آرہی ہے۔

گل بانو آہستہ سے بولی۔ ہاں میں مردہ ہوں۔ اور اسی لیے میں مردہ گھر گئی۔

اور وہاں میں نے اپنی قبر بھی تیار کی تھی۔

گل بانو کے وکیل نے ناراض ہوکر کہا۔ می لارڈ، جب تک جرم ثابت نہیں ہوجاتا آپ سرکاری وکیل کو منع کیجیے کہ میرے موکل کو بار بار قاتل کہنا بند کریں۔

جج نے سرکاری وکیل کو کچھ اشارہ کیا۔سپرا نے محسوس کیا، گھٹن بڑھ گئی ہے...اور مخصوص بو نے فضا میں پھیلنا شروع کیا ہے اور اس کے چادر سے لپٹے آکٹوپس اب سرکاری وکیل کے پاؤں سے کھیل رہے ہیں۔اسے گدگدی ہورہی ہے...اور وہ بار بار اچھل رہا ہے۔

'تو تم مردے ہو۔؟' جج نے پھر پوچھا۔



پورے ہوش وحواس میں اور اپنی آزادی کے ساتھ؟

نہیں۔مردے حواس میں نہیں ہوتے۔مردے نہ غلام ہوتے ہیں نہ آزاد۔

جج نے سرکاری وکیل کی طرف اشارہ کیا۔اس مردے کی میڈیکل رپورٹ چاہیے۔

جج نے دس دن بعد دوسری پیشی کا آرڈر جاری کیا۔

سرکاری وکیل نے آخری درخواست کی۔ مجرم کو حراست میں ہی رہنے دیا جائے۔ایسے خطرناک مجرم باہر رہیں گے تو ثبوتوں کو ختم کردیں گے۔

انہیں حراست میں رکھا جائے۔

جج نے حکم جاری کیا۔گل بانو اور سپرا پولیس کے سپاہیوں کے ساتھ چلتے ہوئے گیٹ تک آگئے۔وہاں پولیس جیپ موجود تھی۔گل بانو نے الوداع کہا اور جیپ میں بیٹھ گئی۔ سپرا دوسری جیپ میں بیٹھ گیا۔اب اسے دس دنوں بعد ہونے والی دوسری پیشی کا انتظار تھا۔

(3)

## دوسری پیشی

وہ دوبارہ سیل میں واپس آ گیا۔ یہ عمارت اسے کسی پرانے کھنڈر کا احساس دلا رہی تھی۔ وہ مراقبہ میں تھا۔ اور اس وقت، ان لمحات میں موت کے ہر رنگ کو بہت قریب سے محسوس کر سکتا تھا۔ سپرا نے محسوس کیا، موت چہرے پر سکون لا دیتی ہے۔ اور اس وقت دیوار پر سرخ چیونٹے کے رینگنے کے باوجود اس کے چہرے پر سکون ہے۔ اس نے سنا تھا کہ آخری وقت میں مرنے والے کے دماغ میں بہت کچھ چل رہا ہوتا ہے۔ اور مرنے والے کا چہرہ دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے وہ گہری نیند میں ہو۔ اسے ریحانہ کا چہرہ یاد ہے۔ اذیت کے باوجود اس کے چہرے پر سکون تھا۔ اپنے بیٹے سے ملنے کا سکون۔ وہ ریحانہ سے جاننے کا خواہشمند تھا کہ جب موت تم سے ذرا دور رہ گئی ہے، آخر تمہارے چہرے پر یہ طمانیت کیسی ہے؟ زندگی کے آخری لمحات میں ایک جنگ اس کے اندر بھی چل رہی تھی۔ بہت کچھ کھونے کی جنگ۔ درد سے نجات حاصل کرنے کی جنگ۔ اس کو سانس لینے میں تکلیف ہو رہی



ہے.... اور سپرا نے خیال کیا تھا کہ ناک کی نلکیوں سے روح کا رشتہ منقطع ہو رہا ہے۔ ریحانہ کا جسم کمزور پڑنے لگا تھا۔ وہ نیم غنودگی کی حال میں تھی اور اپنے بچے کو آواز دے رہی تھی۔

چیونٹے کے ساتھ دیوار پر چڑھتی ہوئی چھپکلی۔ اب اسے اس کھیل میں مزہ آ رہا تھا۔ مگر اسی وقت دروازہ کھلا اور ایک آفیسر جس کو اس نے اس سے پہلے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

' میرا نام سلیمان ہے اور میں اس وقت تمام وارڈ کا معائنہ کر رہا ہوں۔ میں بیرک انچارج ہوں۔ اور جب تک میں ہوں، تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور ہاں، تمہارا معاملہ اب صرف تمہارا معاملہ نہیں رہ گیا ہے۔ یہ ایک مخصوص مذہب کا معاملہ بھی بن گیا ہے۔ سمجھ رہے ہونا۔ تمہیں احتیاط سے کام لینا ہے۔ اور کم از کم میرے جیتے جی یہاں تمہیں کوئی نہیں مار سکتا۔ تمہاری حمایت میں کچھ ایجنسیاں بھی سامنے آ گئی ہیں۔ جبکہ ٹی وی چینل والے تمہیں مجرم ثابت کرنے کی پرزور کوشش کر رہے ہیں۔ اور ہاں، یہ سمجھ لو کہ کچھ بندروں نے بغاوت کر دی ہے۔ اور یقیناً تم کو اس کا فائدہ ملے گا۔

انسپکٹر سلیمان نے نہ اس سے کچھ پوچھا، نہ جاننے کی کوشش کی۔ نہ زیادہ دیر رُکے۔ جملہ پورا کیا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ سپرا کو یقین تھا، یہ سلیمان ان ایک فیصد سے بھی کم لوگوں میں سے ایک ہے، جو اس وقت پولیس میں موجود ہیں۔ ان کی موجودگی صفر کے برابر ہے۔ تاہم اسے سلیمان کی بات پر یقین کرنا چاہیے کہ وہ یہاں محفوظ ہے۔ مرنے کے بعد عام طور پر مردے محفوظ ہی رہتے ہیں۔ اس رات قیدیوں میں کچھ جھگڑا ہوا۔ سپرا کو یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں کچھ سیل ایسے بھی ہیں جس میں ایک ساتھ پندرہ سے بیس قیدیوں کو رکھا جاتا ہے۔ اور ان

میں سے کسی نہ کسی کی موت واقع ہوتی رہتی ہے۔حبس اور گھٹن نے دوبارہ چھپکلی کی طرح اپنے پاؤں پھیلائے۔ ایک بار پھر وہ موت کے تعاقب میں نکل گیا۔مرنے والے کو اپنی موت کا علم چار پانچ روز یا مہینہ قبل ہی ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ اس عمل میں زیادہ وقت نہیں لیتے۔انہیں اچانک احساس ہوتا ہے کہ ملک الموت قریب ہے اور وہ مرنے والے ہیں۔موت کی گھڑی جیسے جیسے قریب آتی ہے تناؤ پیدا کرنے والے کیمیکل میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔سپرا نے سوچنا شروع کیا۔ وہ کب مرا تھا۔ جب وہ پرانی عمارت سے لوٹا...اور بندروں نے اور خانہ بدوشوں نے مل کر پرانی عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔یا ڈاکٹر سارنگ کی موت کے بعد؟ یا بیناکشی کی موت کے بعد یا بیٹے کی موت کے بعد یا جس دن ریحانہ مری؟ اس دن تاریخ کیا تھی....وہ پُر امید تھا کہ اس سے،موت کے حوالے سے سوال پوچھا جاسکتا ہے اور اسے دن تاریخ کو یاد رکھنا چاہیے۔ایک دفعہ سارنگ نے موت کے بارے میں اس کی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔ڈاکٹر سارنگ کے مطابق،موت کے وقت جسم ایک خاص طرح کے تناؤ سے گزرتا ہے۔تناؤ کے لیے انڈورفن ہارمون ذمہ دار ہوتا ہے۔اور اگر چہرے پر خوشی ہے تو یہ سیروگوفن ہارمون کی وجہ سے ہوتا ہے۔ کچھ چوہوں میں مرتے وقت سیروگوفن ہارمون کی مقدار چوگنا پائی گئی۔انسان سے زیادہ خوشی چوہے محسوس کرتے ہیں اور موت کے وقت بھی تناؤ میں نہیں رہتے۔

چوہے۔سیل میں چوہے بھی ہیں جو اچھلتے کودتے پاخانہ کی سرانڈ میں سے ہوکر باہر نکل جاتے ہیں۔اس نے کئی بار ان چوہوں کی اچھل کود کا جائزہ لیا تھا۔ چوہے اور مینڈک، جو سائنسی تجربات کا اکثر شکا ہوتے ہیں۔سپرا کو یقین تھا کہ جب جسم کام کرنا بند کرتا ہے تو دماغ کے مینڈک اور چوہے بھی دور چلے جاتے ہیں۔ممکن



ہے آخری لمحات کا تجربہ بہت مختلف ہو، یعنی جیسا کہ وہ سوچتا ہے۔اس سے کہیں زیادہ مختلف......سپرا کو ایک امریکی سائنسداں کا ایک تجربہ یاد آ گیا۔اس نے موت کو قریب سے دیکھا اور محسوس کیا تھا۔دماغ میں اسٹراک لگنے کی وجہ سے، دماغ کے بائیں حصّے نے کام کرنا بند کردیا تھا۔ وہ روحانی احساس سے گزرا اور اس نے دیکھا کہ اس کے دادا کی ایک انگلی ہے، جو اوپر کی جانب اٹھی ہوئی ہے۔پھر اسے دادا کا چہرہ نظر آیا۔اور اس نے دیکھا، دادا کی انگلی کسی کی طرف اشارہ کررہی ہے۔اس کے دادا کیتھولک تھے۔ایک زمانے میں پادری بھی رہ چکے تھے۔ پھر اس نے اپنے والد اور والدہ کو دیکھا۔لیکن دادا، والد، والدہ اور اس کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔اور اچانک اس کی نیند کھل گئی۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ خطرہ ٹل چکا ہے۔امریکی سائنسداں موت کی وادیوں سے واپس آیا تھا اور بعد میں صحت مند ہونے کے بعد اس نے اپنے تجربے کو تحریری شکل دی تھی۔ وہ انگلی۔دادا کی انگلی۔

سپرا کو ریحانہ کی انگلی یاد آرہی تھی جو قبر سے نکلنے کے بعد اس کے ساتھ ساتھ مردہ گھر آئی تھی۔ اور وہ اس کٹی ہوئی انگلی کو اکثر دیکھتا رہتا ہے۔ جیسے یہ انگلی کچھ اشارہ کررہی ہو۔ کچھ بتانے کی کوشش کررہی ہو۔سپرا نے ان لوگوں کو بھی دیکھا تھا، جن کے لیے یہ قبول کرنا مشکل تھا کہ ان کا آخری وقت آچکا ہے۔اور وہ ماڈل لڑکی جو اپنے لیے ایک خوبصورت فلیٹ خریدنے کی خواہشمند تھی۔ایک دن پہلے ہی سپرا اس سے ملا اور دوسرے روز وہ نہیں تھی۔ایک خلا، جس میں مردے گھوم رہے ہیں۔ ایک نظام، جہاں کوئی زندہ نہیں ہے۔اس نے جیل کی کوٹھریوں پر نظر ڈالی۔اسے یقین تھا، یہ تمام قیدی مرچکے ہیں اور یہ فریب نظر ہے کہ دنیا انہیں زندہ سمجھ رہی ہے۔

تیسرے دن کی صبح تھی۔ دوپہر کھانے کے بعد اس کا ساتھی کھانا لے کر اس کے قریب آ گیا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

’تو تم مر چکے ہو.....؟‘

’ہاں...‘

میں بھی مر چکا ہوں۔ یہاں جو بھی ہیں، سب مر چکے ہیں۔ مگر اس بات پر کوئی اعتبار نہیں کرتا۔ مگر تمہاری کہانی پر میں اعتبار کر سکتا ہوں۔

’کیوں؟‘

ساتھی زور سے ہنسا۔ ہم پیدائشی سور ہوتے ہیں۔ جانوروں سے زیادہ ذلیل۔ جبکہ پیدا ہونے کے بعد ہم مسلسل خوش فہمی میں رہتے ہیں کہ ہم انسان ہیں۔ اور انسان اپنی اچھائیوں کے لیے دلیلیں گڑھتا ہے جبکہ ہر دلیل اسے برائی کے قریب کرتی ہے۔ پھر اپنی نفسانی خواہشات کے بوجھ تلے دب کر انسان بے حس اور مردہ ہو جاتا ہے۔

ساتھی نے سپرا کی طرف دیکھا۔ دراصل موت، زندگی کو اسپیس دیتی ہے۔ انسان میں اربوں خلیات ہوتے ہیں جو روزانہ بنتے اور ٹوٹتے ہیں۔ خطرناک خلیات، زندہ رہنے والی قوت کو مار دیتی ہے۔ جب نئے خلیات کا بننا رُک جاتا ہے تو انسان کی حالت رفتہ رفتہ خراب ہونے لگتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ مرنے لگتا ہے۔

سپرا کو اس آدمی میں دلچسپی تھی۔ یہ پڑھا لکھا قیدی تھا اور دو ایک بار پہلے بھی اس کے پاس آ چکا تھا۔ جاتے وقت اس نے پلٹ کر سپرا کو دیکھا اور کہا۔

’میرے خلیوں نے بھی کام کرنا بند کر دیا ہے۔ میں کسی وقت بھی مر جاؤں گا۔‘

وہ مر چکا تھا لیکن جیل کے ڈاکٹروں نے اس کے مرنے کا اعلان چوتھے دن



کیا۔ سپرا کا خیال تھا کہ اس کا ساتھی دماغی موت کا شکار ہوا، یعنی سب سے پہلے اس کے دماغ نے حرکت کرنا بند کیا اور جیسا کہ وہ کہہ کر گیا تھا کہ میرے خلیوں نے کام کرنا بند کر دیا ہے۔ دراصل دماغ کی نچلی تہوں میں کچھ خلیات دماغی موت کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں، جب وہ اس کے پاس آیا وہ اپنا شعور کھو چکا تھا اور اسے یقین ہے کہ ساتھی کی ریڑھ کی ہڈی میں درد اٹھا ہوگا اور پھر آہستہ آہستہ وہ موت کی طرف بڑھ گیا ہوگا۔

●●

دوسری پیشی سے ایک رات قبل انسپکٹر سلیمان دوبارہ اس کے سیل میں آئے اور سپرا کو بتایا کہ کل راٹھور اس کے خلاف فیصلہ سنا سکتے ہیں مگر اسے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی حمایت میں ایک بڑی دنیا سامنے آ چکی ہے۔ امریکی اور برٹش اخباروں نے مرسی ڈیتھ کو لے کر مضامین لکھے ہیں اور اس کے حق میں بیان دیا ہے۔

’لیکن میں نے تو مرسی ڈیتھ کے لیے اپیل نہیں کی ہے۔ میں تو پہلے سے مردہ ہوں۔‘

ہاں تم نے اپیل نہیں کی ہے اور تم پہلے سے مردہ ہو۔ مگر اس وقت ایک مردے کی حفاظت میں بہت سے لوگ سامنے آ گئے ہیں۔

انسپکٹر سلیمان نے اس دفعہ بھی زیادہ وقت نہیں لیا اور چلے گئے۔ اب دروازہ بند تھا۔ اس نے چھپکلی کو لہرا کر دیوار سے زمین پر گرتے ہوئے دیکھا۔ چھپکلی دوبارہ اچھل کر بھاگتی ہوئی دیوار کے اوپر چڑھ گئی تھی۔

## دوسرے دن

جج راٹھور اپنی جگہ لے چکے تھے۔آگے کی صف میں وکلاء بیٹھے تھے۔آدھے گھنٹے بعد گل بانو اور سپرا کا نمبر آیا۔سرکاری وکیل نے میڈیکل رپورٹ جج کی طرف بڑھائی اور کہا....دیکھیے ، یہ زندہ ہے اور جھوٹ بولتا ہے۔

’نہیں میں مردہ ہوں۔‘ سپرا نے آہستہ سے کہا۔

’اور یہ میڈیکل رپورٹ؟‘

گل بانو کے وکیل نے کہا۔میڈیکل رپورٹ اکثر غلط ثابت ہوتی ہے۔ یہ دیکھیے۔‘ اس نے ایک کاغذ بڑھایا۔روس کی رہنے والی شاشا گورباچوف۔ 24/ اپریل 1997 ڈاکٹر نے اس کو مردہ ثابت کیا مگر وہ زندہ رہی۔ اور پورے سولہ برس زندہ رہی۔

گل بانو کے وکیل نے ایک دوسرا کاغذ ڈاکٹر کی طرف بڑھایا۔واشنگ ٹن، 7مارچ 1888، ڈاکٹر نے نیٹ والٹ کے حوالے سے کہا کہ وہ زندہ ہے اور سانسیں چل رہی ہے۔ وہ ایک عرصہ سے کوما میں تھا۔مگر اس کی موت ڈاکٹر کے بیان کے ایک ماہ قبل ہی ہو چکی تھی۔

گل بانو کے وکیل نے ڈاکٹر کی طرف ایک تیسری رپورٹ بڑھائی۔ یہ کیرل کے گاؤں کا رہنے والا ہے۔4/مارچ 1956 کو یہ مرگیا۔مگر مرنے کے بعد بھی کئی برسوں تک یہ اپنے گاؤں میں دیکھا گیا۔اور یہ کوئی بھوت نہیں تھا۔ یہ باضابطہ گاؤں میں گھومتا رہتا تھا۔



گل بانو کے وکیل نے ثبوت کے طور پر چوتھا کاغذ جج راٹھور کی طرف بڑھایا....اور یہ دیکھیے ، یہ خاتون مارگریٹ کا تعلق اٹلی سے تھا۔اتفاق کہ 7 جنوری 1966 کو اس کی موت ہوئی مگر اس کی ماں بتاتی ہے کہ مارگریٹ گھر میں اکثر آتی تھی اور اس کا گھریلو کاموں میں ہاتھ بٹاتی تھی۔

جج نے کاغذات کو غور سے دیکھا۔اشارہ کیا کہ اب مزید کاغذات کی ضرورت نہیں۔جج کے ہونٹوں پر، پُراسرار مسکراہٹ تھی۔

’یہ دلیلیں کہاں سے لاتے ہو۔...‘

’آقائی سے جو اندھیرے والا اور ظلمتوں والا ہے۔‘ گل بانو کے وکیل نے کہا۔

’آقائی؟‘ سرکاری وکیل ہنسا....مگر آقائی کی دلیلیں تو....‘وہ دوبارہ ہنسا۔

سپرا کے ہونٹوں پر سنجیدگی تھی۔آقائی کی دلیلیں بندروں اور ریچھوں کی سمجھ میں آجاتی ہیں۔مگر....چوہے،. بلیاں، کتے بھی اسی ملک میں رہتے ہیں۔

گل بانو کے وکیل نے سرکاری وکیل سے پوچھا۔تو آپ آقائی، جو زعفرانی پھولوں کی سوغات بانٹتے ہیں، آپ کو ان پر یقین نہیں۔؟

سرکاری وکیل چونک گیا۔یقین کیسے نہیں۔

’مگر ابھی آپ نے کہا، آقائی کی دلیلیں تو....تو کیا؟ فرضی ہیں؟ من گڑھت ہیں، فقط جملے ہیں اور آپ انہیں قبول نہیں کرتے۔؟‘

’میں نے ایسا نہیں کہا‘ سرکاری وکیل اس وقت دباؤ میں تھا۔میرے کہنے کا مطلب تھا.....

’آقائی دلیلیں اگر صحیح ہیں تو یہ آدمی مسیح سپرا بھی صحیح ہے۔ یہ مر چکا ہے۔ اور آپ کو اختیار نہیں کہ ایک مردے کو عدالت میں بلاکر عدالت کا وقت ضائع کیا

جائے۔گل بانو کے وکیل نے ایک اور کاغذ جج صاحب کے ہاتھ میں بڑھایا۔ یہ آقائی کا بل۔ پندرہ لاکھ کا۔ جو عوام تک نہیں پہنچا۔ اس نے دوسرا کاغذ بڑھایا۔ یہ ملک کے ۳۲ انڈسٹریلسٹ جو غائب ہوگئے، یعنی مر گئے، مگر زندہ ہیں۔ آقائی بتائیں گے کہ یہ ملک کے لیے مر چکے ہیں۔ یہ ان فائلوں کی لسٹ ہے جو دفتروں میں زندہ تھیں مگر خاکستر ہوگئیں۔ مر گئیں مگر ان فائلوں کے بھوت زندہ ہیں اور آقائی کو خوفزدہ بھی کر رہے ہیں۔

سرکاری وکیل چپ تھا۔ جج نے سپرا کی طرف دیکھا۔ یہ ثبوت کافی نہیں۔ تمہیں مرنے کے کچھ اور ثبوت بھی پیش کرنے ہوں گے۔

اب جج گل بانو کی طرف مڑا....

'ہاں تو آقائی، جج کو اپنی غلطی کا فوراً احساس ہوا۔ ہاں تو....'

'گل بانو' گل بانو نے آہستہ سے اپنا نام دہرایا۔

'ٹھیک ہے۔ٹھیک ہے۔' جج نے دوبارہ دہرایا۔ اور فائلوں کو دیکھنے لگا۔

'یہ فاحشہ ہے سرکار... اور میں نے اس کی پوری ہسٹری کی چھان بین کی ہے۔'

گل بانو ہنسی۔ میں نے کب کہا کہ میں جج ہوں۔ ہسٹری مجھ سے پوچھ لیتے۔ میں قحبہ گھر کے صندوق سے نکلی اور ساؤتھ ایکس پہنچ گئی.... اور شریف زادیوں کی طرح پھول بیچنے لگی۔

سرکاری وکیل حیرت سے گل بانو کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے گل بانو کو درمیان میں ہی روکا، اور پھر دہرایا، چھ جنوری کی رات.....

گل بانو کے وکیل نے کہا۔ می لارڈ، یہ پھر سے ٦ جنوری کی رات پر آ گئے۔ اور انہیں یہ معلوم نہیں کہ ۱۲ بجے کے بعد دوسرا دن شروع ہو جاتا ہے۔گل بانو مسٹر راٹھور سے ملنے ضرور گئی مگر جب واپس آئی تو ۷ جنوری شروع ہو چکا تھا۔



'۸ جنوری....' سرکاری وکیل نے رخنہ دیا۔ ۷ نہیں ۸ جنوری، کیونکہ می لارڈ، ۷ جنوری تو بھگوان لے گئے۔گل بانو نے جب قتل کیا، وہ ۸ جنوری کی تاریخ تھی۔

'بالکل بھی نہیں۔ ۷ جنوری۔ اور ۷ جنوری کیلنڈر میں نہیں ہے۔ اور اس لیے اس جرح سے کوئی فائدہ نہیں کہ گل بانو نے قتل کیا۔

جج صاحب کو الجھن ہو رہی تھی۔ یہ آپ لوگوں نے کیا ۷ جنوری، ۸ جنوری کی رٹ لگا رکھی ہے۔

'میں نے نہیں می لارڈ، آقائی نے، بھگوان نے ۷ جنوری کا دن کیلنڈر سے غائب نہیں کیا ہوتا تو پھر معاملہ دوسرا ہوتا۔ بھگوان نے ایک دن کیلنڈر سے غائب کیا ہے تو کچھ سوچ کر ہی کیا ہوگا۔ اس لیے اس معاملے کی چھان بین کے لیے اس پہلو پر بھی نظر ڈالیے کہ ۷ جنوری کو کیا کیا ہوا تھا'

گل بانو کے وکیل نے ایک اور دستاویز جج کی طرف بڑھایا۔ اس میں ۷ جنوری کی تمام تفصیلات لکھی ہیں۔ضحاک کا طلوع ہونا، غائب ہونا۔ پولیس کا فائرنگ کرنا۔ گولیوں کا چلنا اور مہابھارت سیریل کی طرح گولیوں کا واپس آ جانا۔ طلبا کا جلوس نکالنا اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو جانا۔شیئر مارکیٹ کا گر جانا۔ اس دن چار معزز انڈسٹریلسٹ ہجرت کر گئے تھے۔ اس دن پیاز کی قیمت سو روپے ہوگئی تھی۔ آلو ۸۰ روپے۔ دھنیا کی پتی، کریلا، مرچ، لہسن، ادرک تک کی قیمتیں آسمان چھو گئی تھیں۔ اور اس دن ۸۰ گھوڑے، ۱۲۰ سور اور دو سو گدھوں کی موت ہوئی تھی۔ ان سب کی تفصیلات درج ہیں۔

'ان سب سے کیا نتیجہ نکلتا ہے؟' جج نے استفسار کیا۔

'بہت صاف می لارڈ۔ ہمارے معزز گنجے سر والے نے دیوتا کو دیکھا۔ دیوتا کو یہ دن منظور نہیں تھا، لیکن ۷ جنوری تو تھا اور ۷ جنوری کو یہ تمام حادثے ہوئے۔'

سرکاری وکیل نے کہا۔ تو آپ مانتے ہیں کہ ۷ جنوری تھا۔

نہیں۔ اس طرح سے نہیں جیسے آپ کہہ رہے ہیں۔ یہ ایک نحوست بھرا دن تھا اور بھگوان نے غائب کردیا۔ کیا آپ مانتے ہیں کہ ۷ جنوری تھا۔؟

'نہیں'، سرکاری وکیل نے خوفزدہ ہوکر کہا۔

پھر تو معاملہ ہی صاف ہوگیا۔ یعنی قتل ہوا ہی نہیں.... اور یہ آپ بھی کہہ رہے ہیں۔ جب ۷ جنوری غائب ہوگیا تو میری موکل نے خون کس کا کیا۔؟

'لیکن خون تو ہوا ہے... اور یہ ہے راٹھور کی پوسٹ مارٹم رپورٹ'، سرکاری وکیل نے رپورٹ جج کی طرف بڑھائی۔

گل بانو کے وکیل نے لقمہ دیا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ پر ۸ جنوری کی تاریخ ہے، اس کا مطلب صاف ہے کہ جیسا ہمارے سرکاری وکیل کہہ رہے ہیں، قتل ۷ جنوری کو ہوا۔

'می لارڈ' سرکاری وکیل نے آواز بلند کرتے ہوئے کہا۔ یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ جب ۷ جنوری کلینڈر سے غائب ہوگیا، اس کا سیدھا مطلب ہے کہ ۶ جنوری کے بعد، رات ۱۲ بجے ۸ جنوری کی شروعات ہوئی۔ قتل ۸ جنوری کی رات کو ہوا.... اور گل بانو فرار ہوکر مردہ گھر پہنچی۔

گل بانو نے زور سے کہا۔ یہ تو کمال ہے۔ کیا ساری دنیا میں ایک وہی مردہ گھر تھا۔ میں نے قتل کیا اور مردہ گھر پہنچ گئی۔ میں بھی مردہ ہوں.... اور میں پہلے سے مردہ گھر میں تھی۔

سپرا نے محسوس کیا کہ آواز میں بھی دھمک ہوتی ہے۔ بہت ممکن ہے، آواز میں مکڑیوں کی طرح جالے بھی ہوتے ہوں۔ اس وقت یہ جالے دونوں وکیل اور گل بانو کی گفتگو سے ہوکر جج کے ارد گرد لپٹ گئے تھے۔ اس نے جج کو الجھن میں



دیکھا۔ وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ جیسے وہ کسی فیصلے تک پہنچنے کی کوشش کررہے ہوں۔ مگر درمیان میں آوازوں کو جوکیلیں تھیں وہ اسے چبھ رہی تھیں، اس نے پلٹ کر پیشکار کی طرف دیکھا اور پندرہ دن آگے کی تاریخ دے دی۔

سپرا آنکھیں بند کرتا ہے۔ گہری سانس لیتا ہے۔ وہ اس فیصلے سے لاعلم ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ وہ اس بارے میں سوچنا نہیں چاہتا۔ لیکن عدلیہ کی عمارتوں میں کچھ اچھے لوگ بھی ہیں۔ اسے رجنی گندھا کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ پولیس کے سپاہیوں کے ساتھ آگے بڑھتا ہے تو کچھ فاصلے پر اسے گل بانو نظر آتی ہے۔ گل بانو میں اعتماد ہے.... اور اسے خوشی ہے کہ ان عمارتوں کے عفریت اسے نگلنے میں ناکام رہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے چوزوں کو دیکھتا ہے، جو ایک قطار سے سیاہ سوٹ والوں کی جانب لپک رہے ہیں۔ ننھے چوزے... اسے عدالت کی مینار پر گدھ نظر آتا ہے۔ اس گدھ کو اس نے پہلے بھی دیکھا تھا۔

وہ ایک بار پھر اپنے سیل میں لوٹ آیا تھا۔

(4)

# تیسری پیشی

سپرا کو جیل کے کمرے میں کچھ زیادہ تکلیف نہیں تھی، وہ مردہ تھا اور یہ کمرہ کسی بھی مردے کے لیے بہتر کمرہ تھا۔ کمرے میں پاخانے کی بو تیز تھی۔ چیونٹا، چھپکلی اور چوہے، یہ تین مہمان تھے، جن سے اس کا سامنا ہر کچھ دیر بعد ہوتا رہتا تھا۔ سلاخوں کے باہر کی چیخوں میں اس کی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مگر اس درمیان باہر کی دنیا میں ایسے بہت سے حادثے ہوئے تھے، جن کی تفصیلات اسے یہاں کے قیدیوں سے ملی تھی۔ تیز طوفان میں گھروں کا گر جانا۔ ڈریگن کا دوبارہ دکھائی دینا اور ضحاک کے دونوں اژدہے کہاں گم ہوگئے، یہ کسی کو پتہ نہیں تھا۔ اس درمیان خانہ بدوشوں کا ہنگامہ جاری رہا۔ درختوں سے پارلیامنٹ تک، پارلیامنٹ سے سڑکوں تک اور سڑکوں سے دریا اور نالوں تک.... اور اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ خانہ بدوشوں کے درمیان دو گروہ بن گیا ہے۔ ایک گروہ رزق اور روزگار کی بات کر رہا ہے اور دوسرا گروہ اس قسم کی باتیں کرنے والوں کو غدار سمجھتا ہے۔ اس درمیان کچھ علاقوں میں تیزاب کی بارش بھی ہوئی تھی اور یہ وہی علاقے تھے، جہاں مخصوص اقلیتیں رہائش



پزیر تھیں۔

گر چہ اس کی خواہش تھی کہ وہ جیل کے عملہ سے یہ کہے کہ میں ایک مصنف ہوں اور مجھے قلم کاغذ دیا جائے۔ مجھے کچھ لکھنا ہے۔ مگر سپرا جانتا تھا کہ اس کی فرمائش پوری نہیں کی جائے گی۔ وہ اپنے پرانے ناولوں کو یاد کر رہا تھا۔ جس میں اس نے قتل کے طریقے بتائے تھے... اور اس زمانے میں جب بھی وہ ناول لکھتا اس کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ قتل کے نئے طریقے ایجاد کرے... اور وہ کسی حد تک کامیاب بھی رہتا۔ جیل کی سیلن زدہ کوٹھری سے سپرا کو کوئی شکایت نہیں تھی۔ اسے یقین ہے کہ اس کے پاس چھٹی حس ہے۔ اور حواس خمسہ سے وہ نامعلوم نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ جنگل کی تہذیب پر خوش تھا، جہاں شیر کو شیر اور ریچھ کو ریچھ نہیں کھاتے۔ مگر یہ انسان ہے جو جنون کی آگ میں جھلس کر انسان کو ہی کھا جاتا ہے۔ وہ اس وقت خانہ بدوشوں کی آوازیں سن رہا ہے... اور اسے یقین ہے کہ باہر کی دنیا میں ان کے تماشے چل رہے ہوں گے۔ سپرا نے سر کو جھٹکا دیا اور سوچا، مجھے سمندر کا شور کیوں سنائی دے رہا ہے۔ یہ کلہاڑی سے لکڑی کاٹنے کی آوازیں ہیں۔ گاڑیوں کی گنتی اور جانچ ہو رہی ہے۔ دوسرے پہر کا سورج جھاڑیوں سے نظر آ رہا ہے۔ اور جھاڑیوں کے قریب خانہ بدوش ہیں، ہاتھوں میں تیر کمان لیے.... سپرا ان مناظر سے باہر نکلتا ہے۔ وہ ایک بار پھر اپنی موت کا تعاقب کرتا ہے۔ وہ ایک مصنف ہے اور مر چکا ہے۔ لیکن اس کی ہڈیاں سالم ہیں۔ جسم پر گوشت ہے اور وہ چل پھر سکتا ہے۔ اسے ایک سرنگ اور روشنی نظر آ رہی ہے، جیسا کہ اکثر مرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے... اور کئی کمزور دل والے اس اچانک کی روشنی کو دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔

اب اس کی پیشی پندرہ دن بعد ہے اور یہ پندرہ دن اس کے لیے بے حد

اذیت ناک ثابت ہونے والے ہیں۔تاہم ایک مردہ جسم پر اذیتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ دوسرے دن لنچ بریک میں وہ کچھ اور قیدیوں سے ملا۔ یہ ایک گھنٹے کا وقت اس کے لیے مزے کا ہے۔اس نے محسوس کیا کہ زیادہ تر قیدیوں کے ہونٹوں پر اس کا نام تھا۔ ان قیدیوں کو سپرا کے قصے کی معلومات ہوگئی تھی۔ کچھ اسے چھوکر دیکھ رہے تھے کہ واقعی وہ مردہ ہے یا مذاق کر رہا ہے۔سپرا کو یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے مردہ ہونے کا ذکر اس وقت دنیا کے تمام اخباروں میں چھایا ہوا ہے۔ٹویٹر، فیس بک اور سوشل ویب سائٹس پر می ٹو نے کرشمہ کر دیا ہے۔ لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں ہیں جنہوں نے خود کو مردہ بتایا اور می ٹو مہم میں بڑی تعداد میں لوگ جڑتے جا رہے ہیں۔اور جیسا کہ انسپکٹر سلیمان نے تفصیل سے بتایا، وہ اپنی تیسری آنکھ کھول کر اس منظر کو دیکھ سکتا ہے۔اور اس منظر کو اس نے، اس وقت بھی دیکھا تھا جب ریحانہ کی موت ہوئی تھی۔ جب اس کا بیٹا ایکسیڈینٹ کے بعد اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔اور اس کے کچھ دوست اچانک غائب ہو گئے تھے۔ اور اس نے سڑکوں پر ویرانی دیکھی۔ درختوں سے ٹوٹتے ہوئے پتوں کو دیکھا۔خزاں کے رنگ میں اس کا چہرہ تحلیل تھا اور دھند بھرے آسمان میں سپرا خود کو رقص کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ می ٹو۔ سب مردے ہیں۔

●●

بندر درختوں سے اچھلے اور زمین پر گر گئے۔خانہ بدوشوں نے ترشول سنبھالا اور کنارے ہو گئے۔ایک بہت بڑا قافلہ تھا اور قافلہ کا ہر شخص سفید کفن میں تھا۔اور ان کے ہاتھوں میں بینر تھا اور بینر پر لکھا تھا۔ہم سب مردے ہیں۔

ایک بینر پر لکھا تھا۔ یہاں کوئی زندہ نہیں۔



ایک لڑکی آگے بڑھی اور میڈیا والوں کو جواب دیا۔جس دن ہماری زبان کٹ گئی، کان میں شیشے ڈالے گئے، ہم مردہ ہو گئے۔

’لیکن یہ کب ہوا؟‘ ایک میڈیا والے نے پوچھا۔

’اس دن جب آپ بھونپو بن گئے۔ہم نے ٹی وی دیکھنا بند کر دیا۔ جب آپ بندروں کی نقل کر رہے تھے۔ہم نے سوشل ویب سائٹ سے ناطہ توڑ لیا، جب خانہ بدوش ترشول سے کھیل رہے تھے اور سڑکوں پر موت کا رقص ہو رہا تھا، ہم گھروں میں بند ہو گئے اور گھر والوں نے ہمیں مردہ قرار دیا۔

ایک بزرگ آگے بڑھا۔ اس کی عمر ۸۰ سے زیادہ کی تھی، مگر اس کی آواز میں جوش تھا۔ جب بندر یگیہ اور ہون کر رہے تھے، مذہب سے ہمارا اعتبار اٹھ رہا تھا۔ جب ہمیں کوڑا گاڑیوں میں پھینکا جا رہا تھا....اور یہ منظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، میں اسی دن مر گیا تھا۔

ایک بوڑھی عورت آگے بڑھی۔ اس کی آواز میں درد کے ساتھ غصہ بھی شامل تھا۔

’جب ہمارے گلک چھین لیے گئے اور ہماری دولت امیروں میں تقسیم کر دی گئی۔ ہمارے چولہے ٹھنڈے تھے اور بچوں کے چہرے مرجھائے ہوئے، میں اسی دن مر گئی تھی۔

ایک نوجوان پوری طاقت سے چیخا۔ دیکھنے، سننے اور سوچنے پر پہرہ بیٹھایا گیا اور ہم مر گئے۔

قافلہ ایک جگہ رُکا۔خانہ بدوشوں کے درمیان سرگوشیاں جاری تھیں۔ وہ اس طرح ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے جیسے سوچ رہے ہوں کہ وہ زندہ ہیں یا وہ بھی مر گئے۔ کچھ اور بھی تھے جو زور زور سے نعرے لگا رہے تھے۔

آزادی شکار ہوئی ہم مر گئے۔
جب انسانی آبادی میں ریچھوں کی تعداد بڑھ گئی
جب خوف کی لہروں میں ابال آیا۔
جب معصوم تتلیوں کے پر نوچے گئے۔
جب ایک شخص نے میری اجازت کے بغیر میرے سینے پر ہاتھ لگایا۔ میں اسی وقت مر گئی۔
جب خانہ بدوشوں کی حکومت قائم ہوئی
جب تعلیمی سرگرمیوں پر تیزاب پھینکا گیا
جب پرچم کے رنگ تبدیل کیے گئے۔

ہم بے زبان ہیں اور مردہ۔ہم بے حس، لاچار ہیں اور مردہ۔ ہمارے حواس خمسہ نے کام کرنا بند کردیا ہے۔ ہمارے پاس دماغ ہے مگر مردہ۔ ہم انسانی آبادیوں میں بستے ہیں۔مگر مردہ۔ہم مردہ تہذیبوں کے گورکن ہیں اور اب زندوں جیسا ہمارے پاس کچھ بھی نہیں۔

اس رات انسپکٹر سلیمان دوبارہ آیا۔ اس دفعہ اس کی آنکھوں میں چمک تھی... اور اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کسی خاص مقصد سے آیا ہے۔سلیمان نے آتے ہی کہا۔تم ہیرو بن گئے ہو۔

’مردہ ہیرو۔‘

’جو بھی ہو، مگر اس وقت ساری دنیا میں تمہارا ذکر ہو رہا ہے۔ دنیا کے گوشے گوشے میں کہا جا رہا ہے کہ ہم سب مردے ہیں۔ پتہ نہیں تھا کہ زندوں کی بستیوں میں اچانک بیشمار مردے تیار ہو جائیں گے۔



سپرا آہستہ سے بولا.... تیار نہیں، انسانوں کو ذبح کیا جا رہا تھا۔

چاروں طرف مردے۔انسپکٹر سلیمان ہنسا۔ میں کیا ہوں؟ کل رات تو میں بھی دیر تک سوچتا رہا کہ میں زندہ ہوں یا میں بھی مر چکا ہوں۔

سپرا نے محسوس کیا، بہت دنوں بعد اس کے لباس سے آکٹوپس نکلا اور آکٹوپس نے آہستہ آہستہ سلیمان کے پاؤں کو جکڑ لیا۔ سلیمان کے چہرے پر پُراسرار مسکراہٹ تھی۔

’آزاد کیوں نہیں ہو جاتے....؟‘

’کیسے؟‘

’جیسے مردے آزاد ہوتے ہیں۔‘

’مردے کیسے آزاد ہوتے ہیں؟‘

سلیمان نے سپرا کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔’زعفرانی بادلوں پر سوار ہو جاؤ۔تم کہو تو میں گھڑسواروں سے بات کروں‘ اس نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ یہ ایک راستہ ہے جہاں تم بچ سکتے ہو۔ابھی وقت ہے، سوچ لینا۔‘

انسپکٹر سلیمان جیسے آیا تھا، ویسے ہی باہر نکل گیا۔زعفرانی بادل، گھڑسوار۔ دیر تک یہ جملے سپرا کے کانوں میں گونجتے رہے۔معصوم فاختہ مگر باہر سے ریچھ۔ سپرا کو فاختاؤں کی یاد نے گھیرا۔ ہر جگہ غول در غول نظر آنے والی فاختائیں گم کہاں ہو گئیں؟ منفرد دھیمی میٹھی آواز، کبھی چھتوں، محرابوں اور درخت کی شاخوں پر مگر اب فاختائیں نہیں ہیں۔ شکاریوں نے فاختاؤں پر اتنے ظلم ڈھائے کہ فاختاؤں کا نظر آنا ہی بند ہو گیا۔ سپرا کو احساس تھا کہ روح فاختہ کی شکل میں ہوتی ہے۔معصوم اور میٹھے نغمے گانے والی۔فاختائیں ان غیر زمینی دنیاؤں میں جا بسی ہیں، جہاں روحیں

رہتی ہیں۔ وہ فاختہ ہے یا فاختہ کا ہم شکل، اور وہ ایک روح ہے، جو اس وقت جیل کی سلاخوں میں ہے۔

دسویں دن انسپکٹر سلیمان دوبارہ آیا۔ اس کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ تھی۔

تم نے کچھ سوچا۔

'کس بارے میں'

سلیمان ہنسا۔ اڑنے کے بارے میں۔ زعفرانی گھڑ سوار اور معصوم میمنا۔

'کیا ان کے پاس مردوں کی کمی ہے۔؟'

سلیمان سنجیدہ تھا۔' ان کے پاس مردے ہیں مگر بہت کم۔ انہیں تمہاری طرح ایک زندہ، مردہ چاہیے۔ اور یقین کرو، تم ہوا میں گھڑ سواری کرو گے۔'

'جبکہ میں گھڑ سواری بھول چکا ہوں'

سلیمان کا لہجہ اس بار برف کی طرح سرد تھا۔ یہ تمہارے حق میں اچھا ہوتا۔ ورنہ تم تو پہلے سے ہی مردے ہو۔

سپرا نے آہستہ سے کہا۔' قبر کے مردوں کو زیادہ تنگ نہیں کرنا چاہیے۔'

'جیل کے مردوں کو....'

انسپکٹر سلیمان نے بوٹ بجایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

سپرا نے سوچا۔ ایک خاموش بوڑھے کے طور پر ان واقعات سے میں اب بھی تجربہ حاصل کرتا ہوں۔ مجھے موسم کے بدلنے کا احساس ہے۔ لیکن اس سے زیادہ احساس اس بات کا بھی ہے کہ برفیلے علاقوں میں پائے جانے والے کچھ خطرناک بھالو ہمارے بھی ہیں۔ تیزی سے اور اچانک حملہ کردینے والے کچھ ریچھوں کا تعلق ہم سے بھی ہے۔ اور جنگل جب کٹنے لگے تو فاختاؤں نے بسیرا بدل لیا۔ اور حملہ آور



خانہ بدوشوں میں کچھ ایسے بھی ہیں، جن میں ہمارے مخصوص لباس کا عکس ہے۔ اوپر اور نیچے ملا کر اب میرے دس دانت غائب ہو چکے ہیں اور ایک دانت اس وقت ہلنے لگا، جس وقت انسپکٹر سلیمان کمرے سے غائب ہوا۔ سپرا نے سوچا، یہ بہت حد تک مجھ پر منحصر ہے کہ میں اس دانت کو شہید نہیں ہونے دونگا۔ ابھی کچھ اور دن اس دانت کی حفاظت کر سکتا ہوں اور یہ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ مجھے زبان سے نکلنے والے لعاب پر گرفت مضبوط رکھنی ہے اور کوشش کرنی ہے کہ زبان کا رخ اس طرف نہیں ہو، جس طرف وہ ہلتا ہوا دانت ہے۔ اور اگر میں ایسا کر لیتا ہوں تو میں کئی مہینوں تک ہلتے ہوئے دانت کو گرنے سے روک سکتا ہوں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت دنوں تک یہ دانت میرے دوسرے مضبوط دانتوں کے درمیان نہیں ہوگا۔ ممکن ہے دو ماہ یا تین ماہ میں کمزور دانت کی عمارت اچانک گر کر کسی لقمے میں سما جائے۔

تیسری پیشی کا دن آ گیا تھا اور اس وقت تک سپرا نے ہلتے ہوئے دانت کو گرنے سے محفوظ رکھا تھا۔ اسے کوئی الجھن نہیں تھی۔ پولیس وین میں بیٹھ کر سپاہیوں کے ساتھ شان سے کنکرڈوما کورٹ پہنچنا، پیشی کے لیے حاضر ہونا، گل بانو اور اس کے وکیل سے ملنا، اب سپرا کو ان باتوں کی عادت پڑ چکی تھی۔ کورٹ کے باہر ہی گل بانو اور اس کا وکیل مل گیا۔ گل بانو کے وکیل نے بتایا کہ آج فیصلہ ہو سکتا ہے لیکن ہمت ہارنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اب یہ دونوں معاملے عالمی سطح پر اچھالے جا چکے ہیں اور اس کے لیے میڈیا بہت حد تک ذمہ دار ہے۔ گل بانو کے وکیل نے یہ بھی بتایا کہ انٹرنیشنل میڈیا اور بہت ساری انٹرنیشنل تنظیمیں بھی ان کے ساتھ ہیں۔ اور یہ بات اس کو نہیں معلوم تھی کہ دنیا بھر میں بزرگوں کی ہزاروں

تنظیمیں ہیں جو بوڑھے چلاتے ہیں۔ان میں اولڈ ہوم میں رہنے والے بوڑھے بھی ہیں اور وہ بھی جو ایک زمانے مرسی ڈیتھ کی اپیل کر چکے تھے۔مگر اپیل ٹھکرائے جانے پر وہ خود کو مردہ محسوس کرتے ہیں۔گل بانو کے وکیل نے آگے یہ بھی بتایا کہ بزرگوں کی تمام تنظیمیں کھل کر سپرا کی حمایت میں سامنے آچکی ہیں...اور اس لیے کہیں نہ کہیں خانہ بدوشوں کو اس ہنگامے سے دھکّا ضرور لگا ہے۔

سپرا کی زبان پھسلتی ہوئی، ہلتے ہوئے دانت کی طرف جارہی تھی اور وہ بولتے ہوئے خطرہ محسوس کر رہا تھا۔گل بانو کے وکیل نے بتایا کہ اس درمیان پرانی عمارت جیسی چار عمارتیں شہید ہوئیں۔ تین ریاستیں فروخت ہوئیں اور چودہ شاہراہوں کے نام بدلے گئے....اور اس میں مجموعی طور پر ایک ارب کا سرمایہ خرچ ہوا،مگر اس کے باوجود خانہ بدوشوں کے خیمے میں کوئی خوشی نہیں ہے۔ بندروں اور ریچھ کے حملے جاری ہیں۔ ڈریگن دوبارہ آسمان پر نظر نہیں آیا۔آسمان کی زمین پر قبضہ والا معاملہ کھٹائی میں ہے اور سب کچھ معمول پر ہے۔

یہ کیسی آوازیں ہیں۔کھٹر پٹر...کھٹر پٹر....گل بانو نے اچانک دریافت کیا۔

ہاں۔کچھ آوازیں تو ہیں....گل بانو کے وکیل نے کہا....

آکٹوپس....سپرا کہتے کہتے رک گیا۔

ساتھ کھڑے پولیس والوں نے چونک کر سپرا کی طرف دیکھا۔ان میں سے ایک نے پوچھا۔

آکٹوپس.....؟

سپرا نے آرام سے کہا۔ہاں۔وہ اکثر میرے ساتھ ہوتا ہے۔

سپرا نے پولیس والے کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی ہوئی دیکھیں تاہم اسے ان ہوائیوں کی پرواہ نہیں تھی۔



’آج مینار پر گدھ نہیں تھے۔‘ گل بانو کے وکیل نے کہا۔

سپرا کو حیرانی ہوئی کہ وہ اکیلا نہیں تھا،جس نے مینارے پر گدھ دیکھا تھا۔

گدھ کہاں چلا گیا۔؟ گل بانو نے پوچھا۔

’ایک پولیس والے نے بتایا کہ ایک بار ایک گدھ غلطی سے کھلے دروازے ہوکر اس کے گھر کے اندر آگیا تھا۔‘

’کیا گدھ مینار سے اڑ کر عمارت کے اندر آسکتے ہیں؟‘

’کیوں نہیں۔‘ پولیس والے کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔گدھ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔اور اب ہمیں چلنا چاہیے۔

یہ قافلہ تیسری منزل پر آگیا۔گل بانو نے باہر لگے ہوئے بورڈ پر اپنے نام کو پڑھا۔۵ ویں نمبر پر اس کا نام تھا۔یعنی سنوائی جلد ہوسکتی ہے۔جج راٹھور کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔اور اب کچھ ہی دیر بعد مقدموں کی سنوائی ہونی تھی۔ جج راٹھور کو اب تک کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔اس کی آنکھیں چھوٹی تھیں اور وہ گول گول آنکھیں گھما کر آہستگی سے سوال پوچھتا تھا۔اس کی ناک چپٹی تھی اور کچھ کچھ چینیوں سے مشابہت رکھتی تھی ۔پستہ قد تھا اور چہرہ ہر طرح کے جذبات سے عاری۔ سرکاری وکیل کا قد لمبا تھا۔چہرے سے وہ اوباش اور بدمعاش نظر آتا تھا۔جج راٹھور کے مقابلے اس کی آنکھیں بڑی اور خوفناک تھیں۔اس کا پورا حلیہ سمٹ کر اس کی آنکھوں میں آگیا تھا....اور سرکاری وکیل کا بس چلتا تو وہ کب کا دونوں کو پھانسی کی سزا سنا چکا ہوتا۔وہ عجلت پسند تھا اور جلد از جلد فیصلے کے حق میں تھا....اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آج وہ پوری تیاری کر کے آیا ہو۔آدھے گھنٹے بعد گل بانو اور مسیح سپرا کا نام پکارا گیا۔

سرکاری وکیل نے مسیح سپرا کی طرف دیکھتے ہوئے جج سے کہا، میں ان سے کچھ سوال کرنا چاہتا ہوں۔ جج نے اجازت دے دی۔

سرکاری وکیل کی گہری آنکھوں نے سپرا کا جائزہ لیا۔ پھر پوچھا۔

’آپ کہتے ہیں، آپ مر چکے ہیں.....‘

’ہاں....‘

’پھر تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کی موت کس تاریخ کو ہوئی تھی؟‘

’کیا کسی مردے کو اپنی موت کا وقت معلوم رہتا ہے؟ کیا کسی مردے سے کبھی ایسا سوال پوچھا گیا؟ سپرا نے کہا۔

’مردہ آپ کی طرح زندہ نظر نہیں آتا۔ ہاں یا نا میں کہیے۔ آپ کو اپنی موت کی تاریخ یاد ہے۔؟‘

’ ہاں..‘

’کیا تاریخ تھی۔

سپرا نے تاریخ بتائی اور کہا۔ اس دن میری بیوی ریحانہ کا انتقال ہوا تھا——

میں اس قدر صدمے میں تھا کہ جانبر نہیں ہوسکا۔

کیا مردے دیکھ سکتے ہیں؟

ہاں۔

چل سکتے ہیں؟

ہاں

کھا پی سکتے ہیں۔؟

’ہاں...‘ سپرا نے جج کی طرف دیکھا۔ ’بہت سے مردے روحوں کی شکل میں زندہ انسانوں کے ساتھ رہتے ہیں اور میں بھی ایک روح ہوں اور میں بتا سکتا ہوں



کہ روحوں کا الگ ایک سیارہ ہے، جہاں روحیں آباد ہیں لیکن کچھ روحیں گمنام سیاروں سے نکل کر دنیا میں سیر کرتی رہتی ہیں۔ میں ایک مایوس روح ہوں اور بہت کچھ ایسا ہے جو میں اپنی زندگی میں نہیں کرسکا۔‘

’خوب..‘ سرکاری وکیل مسکرایا۔ تو پھر آپ کو دفن بھی کیا ہوگا؟

’ہاں۔‘

’آپ کی تدفین کہاں ہوئی؟‘

’یہ ان لوگوں سے پوچھیے جو میری تدفین میں شامل تھے۔‘

’وہ کون لوگ تھے؟‘

’مجھے نہیں معلوم۔‘

’پھر کس کو معلوم ہے۔؟‘

’اللہ کو، بھگوان کو...‘ سپرا نے مضبوطی سے جواب دیا۔

بھگوان کا ذکر آنے پر سرکاری وکیل کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگیا۔ لیکن اس کی آنکھیں گول گول گھوم رہی تھیں۔

’تو آپ کو پتہ نہیں کہ آپ کس قبرستان میں دفن ہوئے۔؟‘

’بالکل بھی نہیں۔ اور یہ بات صرف خدا جانتا ہے اور میرے عزیز جو مجھے قبرستان تک لے گئے۔‘

سرکاری وکیل نے جج کی طرف دیکھا۔ ’یہ جھوٹ بولتا ہے۔ میں نے اس کے ہمسایوں سے بات کی ہے اور اس کی موت کا کسی کو علم نہیں۔‘

’میرے ہم سایے بڑے لوگ ہیں اور ان سے میرا کوئی رابطہ نہیں ہے۔‘

’تو یہ سمجھا جائے کہ ایک مردے نے ایک قاتل کو پناہ دی۔؟‘

’مردے کو پناہ دی۔ مردہ کوئی بھی ہوسکتا ہے۔‘

گل بانو کے وکیل نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ می لارڈ، آپ نے ٹی وی کی خبروں میں اور اخباروں میں بھی پڑھا ہوگا۔ اب تو دنیا بھر سے کروڑوں کی تعداد میں مردے سامنے آچکے ہیں۔ مردوں نے سڑکوں پر بھی احتجاج کیا۔ مردے اپنے اپنے گھروں سے بھی بلند آواز میں کہہ رہے ہیں کہ وہ مردے ہیں اور ان حالات میں جب ایک شخص خود کہہ رہا ہے کہ وہ ایک مردہ ہے تو اس کو مردہ تسلیم کرنے میں پریشانی کیوں؟

سرکاری وکیل نے لاچاری سے کہا، 'وہ اپنی اپنی زندگی سے تھکے ہوئے لوگ ہیں۔'

'ایسا کہنے کے لیے آپ کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔'

'کچھ اپنے معاشرے سے خوفزدہ ہیں، کچھ سیاست سے، کچھ تنہائی سے؟'

'کیا آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے۔؟'

'قیاس ہے۔' سرکاری وکیل نے کہا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ۶ جنوری کی رات قتل ہوا اور قتل ایک فاحشہ عورت نے کیا تھا۔'

'بالکل بھی نہیں۔' گل بانو نے انکار کیا۔

سپرا نے آہستہ سے کہا۔ مردہ یا روح۔ اس پر زیادہ سوال وجواب ممکن نہیں ہے۔ سائنس کے مطابق، کسی مادے کو وجود میں لانا ناممکن ہے۔ کسی مادے کو معدوم بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کچھ پیدا نہیں ہوتا.... اور کچھ تباہ نہیں ہوتا۔ سب چیزیں اپنی ہیئت یا شکل بدلتی رہتی ہیں۔ ہم دونوں اس وقت ارواح کی شکل میں ہیں۔

'بکواس، سرکاری وکیل زور سے بولا... ہم ہیں اور یہ ہمیں زندہ سمجھنے کے لیے کافی ہے۔' اس نے جج کی طرف دیکھا۔ می لارڈ، اب میں جو کہنے جارہا ہوں، مجھے یقین ہے آپ بھی مجھ سے اتفاق کریں گے اور اس میں اتفاق نہ کرنے جیسی کوئی



بات نہیں ہے۔

سپرا نے محسوس کیا، اچانک سرکاری وکیل کی گول گول گھومتی آنکھوں میں ایک گدھ آکر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی اور اس وقت وہ خانہ بدوش قبیلے کا ایک کارکن نظر آرہا تھا۔ جج کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ہلچل ہوئی اور اس نے پرامید نظروں سے سرکاری وکیل کی طرف دیکھا۔' اجازت ہے۔'

سرکاری وکیل ایک وقفہ کو خاموش ہوا پھر اس نے پراعتماد نظروں سے جج کی طرف دیکھا اور کہا۔ اب میں جو کہنے جارہا ہوں وہ ایک حقیقت ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس میں شک کرنے جیسی کوئی وجہ نہیں ہے، بلکہ میری بات پر شک کرنا ملک سے غداری کرنے جیسا ہے۔ اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں می لارڈ موسم بدل گیا۔ پرچم بدل گیا۔ حقیقتیں بدل گئی اور ۷ جنوری کی تاریخ بھگوان نے کیلنڈر سے خارج کردی، یہ تمام سچائیاں آپ کے سامنے ہیں اور اس بات پر شک نہیں کیا جاسکتا کہ بھگوان ہیں اور یہ نظام بھگوان چلاتے ہیں اور جیسا کہ بھگوان نے آقائی کو ساکشات درشن دیا اور یہ بات پوری دنیا کو معلوم ہے اور اس لیے اس بات پر یقین کیجیے کہ بھگوان نے کل رات مجھے بھی ساکشات درشن دیا۔

سپرا کی سانسیں رُک گئیں۔ اس نے دیکھا، سرکاری وکیل کی آنکھوں میں بیٹھے گدھ کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔

'آگے کہیے۔' جج راٹھور نے کہا۔ 'بھگوان کو نہ ماننے والی کوئی وجہ نہیں اور یہ مکمل نظام بھگوان کے ہاتھ میں ہے۔'

سرکاری وکیل نے کہا۔ تو بھگوان نے مجھے ساکشات درشن دیئے اور کہا۔ یہ لڑکی قاتل ہے اور گل بانو نے ۶ جنوری کی رات ۱۲ بجے کے بعد جب ۸ جنوری کی شروعات ہوگئی تھی ایک بج کر سینتیس منٹ پر راٹھور کا قتل کیا اور چھپنے کے لیے جگہ

تلاش کرنے لگی تو اسے دہشت گرد مسیح سپرا کا گھر نظر آیا اور اس نے یہاں چھپنے میں عافیت محسوس کی۔ می لارڈ، اب چونکہ بھگوان آ چکے ہیں اور معاملہ دودھ کا دودھ پانی کی طرح صاف ہے اور اس لیے مجھے یقین ہے کہ فیصلہ سنانے میں اب آپ کو کوئی تاخیر نہیں ہوگی۔

’اب چونکہ ساکشات بھگوان درشن دے چکے ہیں، اس لیے اب مزید سوال وجواب کرنا مناسب نہیں،‘ جج نے پیشکار کی طرف دیکھا۔ دودن آگے کی تاریخ لکھوائی اور پھر کہا۔ دودن بعد اس مقدمہ کا فیصلہ سنایا جائے گا۔

آسمان میں مشرق کی طرف پرواز کرتا ہوا ٹڈیوں کا قافلہ تھا۔ مینار پر آج گدھ نظر نہیں آئے۔گل بانو کے چہرے پر خاموشی تھی۔ اور وکیل کا چہرہ بھی اترا ہوا تھا۔تاہم مسیح سپرا کا چہرہ سرد اور بے جان تھا... اور اسے کسی بھی فیصلے سے کوئی شکایت نہیں تھی۔فیصلے کے درمیان خانہ بدوش اور مذہب آگئے تھے۔گل بانو کے وکیل کا خیال تھا کہ پہلے فیصلہ سن لیتے ہیں اور پھر راستہ نکالنے کے بارے میں غور کرتے ہیں۔ابھی خوفزدہ ہونے جیسی کوئی بات نہیں ہے۔سپرا کو بھی فیصلے کا انتظار تھا اور سیلن زدہ سیل کی کوٹھری میں رہتے ہوئے اسے تھکن کا احساس ہونے لگا تھا۔

بھگوان اور ساکشات درشن—

ہوا خاموش تھی۔ سپرا منجمد ہو چکے عضلات میں حرارت دیکھنے کا خواہشمند تھا۔ پھر اسے احساس ہوا، رگوں میں دوڑنے والے خون نے گردش کرنا بند کردیا ہے۔ ایک اندھیرا اس کے چاروں طرف ہے اور کچھ خانہ بدوش ہیں جو اب پرانی عمارت جیسی ایک اور عمارت کو نشانہ بنا رہے ہیں۔



جس وقت وہ پولیس وین میں بیٹھا، اس وقت کچھ ناگا سادھو اور خانہ بدوش ہنگامہ شور شرابہ کرتے ہوئے سڑک سے گزر رہے تھے۔ منحوس ریچھ، سپرا نے سوچا اور پھر اس نے تصور کیا، ایک چیخ گونجتی ہے، کچھ گھڑسوار ہیں جو اس کے مردہ جسم کو کھینچتے ہوئے پہاڑیوں کی طرف جا رہے ہیں۔اس نے تصور کیا، ہم بار بار مرتے ہیں اور پھر بھی خود کو زندہ سمجھتے ہیں۔

●●

یہ دودن اذیت ناک تھے۔ چیونٹا، چھپکلی اور چوہا.....ان اذیت بھرے لمحوں میں یہ دوستی اسے پسند تھی۔ سپرا نے خانہ بدوشوں کو دیکھا جو جیل کے دروازے سے نکل کر اندر کی طرف آرہے تھے۔اور ان کے ہاتھوں میں ترشول اور بھالے تھے۔ سپرا نے کچھ چیخوں کی آوازیں سنیں، پھر خاموشی چھا گئی۔اب ایسی چیخیں روزانہ کی کاروائی کا حصہ بن چکی تھیں اور اس میں کچھ بھی خاص نہیں تھا۔ دودن بعد جج راٹھور نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

’عدلیہ بھگوان کے فیصلوں کے خلاف نہیں جاسکتی۔اب عدلیہ بھگوان کے سپرد ہے اور بھگوان کے احکام کو ماننا عدلیہ کا فرض ہے۔اس لیے بھگوان کے حکم کو دیکھتے ہوئے عدلیہ نے جو فیصلہ کیا ہے، اسے ملزمان کو دل سے قبول کرنا چاہیے۔ کیونکہ ۷ جنوری اور ۶ جنوری کا معاملہ ابھی بھی پس و پیش میں ہے۔لیکن بھگوان کو حاضر وناظر جانتے ہوئے عدالت کا فیصلہ ہے کہ ملزم گل بانو کو دس برس اور ملزم مسیح سپرا کو چھ برس کی سزائے قید و مشقت سنائی جاتی ہے۔

جج نے گل بانو کے وکیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، روم نمبر ۳۵۲ سے آپ فیصلے کی کاپی لے سکتے ہیں۔

سرکاری وکیل فیصلے سے خوش نظر آرہا تھا۔

گل بانو کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

سپرا کا چہرہ سرد اور ابھی بھی جذبات سے عاری تھا۔

باہر نکل کر گل بانو کے وکیل نے کہا' زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ہم اس معاملے کو ہائی کورٹ میں چیلنج کریں گے۔ابھی ہمارے پاس بہت سے راستے ہیں۔'

سپرا نے وین میں بیٹھتے ہوئے پلٹ کر دیکھا۔ مینارہ سنسان تھا۔آج کوئی گدھ مینارے پر نہیں بیٹھا تھا۔ چوہا، چھپکلی اور چیونٹا، وہ اس دنیا میں دوبارہ داخل ہو رہا تھا۔

●●

معاملہ چونکہ بھگوان کی عدالت میں تھا اور فیصلہ بھگوان نے کیا تھا، اس لیے گل بانو کے وکیل مسٹر سنتوش چوپڑہ نے اس معاملے میں ایک دوسرے ساتھی وکیل مسٹر سبرامنیم سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔سبرامنیم درمیانی قد کے تھے، گنجے تھے اور خانہ بدوشوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو لے کر نالاں تھے۔

سبرامنیم نے صاف کیا، معاملہ بھگوان کا ہے۔

....اور بندروں کا بھی۔مسٹر چوپڑہ کے چہرے پر الجھن تھی۔

' بھگوان کا جواب بھگوان ہی ہو سکتے ہیں۔' سبرامنیم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔آپ اس معاملے کو ہائی کورٹ میں چیلنج کر سکتے ہیں مگر آپ کو مضبوط دلیلوں کے ساتھ سامنے آنا ہوگا۔

ایک بندر اچھلتا ہوا کمرے میں آ گیا تھا۔سبرامنیم اچھلے اور کسی طرح بندر کو



کمرے سے بھگانے میں کامیاب رہے۔ان کی سانس پھول رہی تھی۔

' دیکھا۔اب بندر کمرے میں بھی آ جاتے ہیں۔'

'ہاں۔یہ تو ہے۔'

'انہیں روکنا ہوگا۔' سبرامنیم کا لہجہ سخت تھا۔ہم کم تعداد میں ہیں مگر۔ہم کمزور نہیں ہیں....اور اس بات کو ہمیں ثابت کرنا ہو۔'

چوپڑہ کا لہجہ کمزور تھا۔ جہاں مذہب اور عقیدہ آ جاتا ہے، وہاں قانون کے ہاتھ بھی کمزور ہو جاتے ہیں۔

اور ان سب کی وجہ اندھے خانہ بدوش ہیں۔مگر ہمت ہارنے کی ضرورت نہیں ہے۔آپ کو تجربہ ہے اور آپ بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔

سبرامنیم نے کہا۔

چوپڑہ کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مذہب اور عقیدہ۔ سبرامنیم کے دروازے سے نکلتے ہوئے اس نے سوچ لیا تھا کہ نچلی عدالت کے فیصلے کو ہائی کورٹ میں کس طرح چیلنج کرنا ہے۔اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ برہما، وشنو، مہیش، ساکشات درشن، برہما وشنو مہیش کے مطابق دونوں بےقصور ہیں اور سرکاری وکیل یہ بتانے میں ناکام رہے کہ کس بھگوان نے انہیں مجرم قرار دیا۔

گھر آتے ہی چوہان لیپ ٹاپ لے کر بیٹھ گیا۔اب رپورٹ تیار کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مذہب کی کاٹ صرف مذہب ہے۔چوہان کی انگلیاں لیپ ٹاپ پر تیزی سے حرکت کر رہی تھیں۔

(5)

# ہائی کورٹ

یہ وہ خانہ بدوش نہیں تھے جو چھریاں بیچتے اور بازیگروں کی طرح اپنے کمالات دکھاتے تھے۔ جب سردیاں گزر جاتیں، راتیں چھوٹی اور دن لمبے ہوتے، یہ پرندوں کی طرح ہجرت کر کے جھیلوں کے کنارے کی طرف پہنچ کر اپنے خیمے آباد کرتے۔ بندرگاہوں سے جھیل اور جنگلات تک ان کے گھر تھے۔ یہ جدید زمانے کے خانہ بدوش تھے۔ یہ سمجھتے تھے کہ بندرگاہ، جھیل، درخت، زمین، مذہب، بھگوان اور سیاست پر صرف ان کا حق ہے۔ یہ بھی چھریاں تیز کرتے، ترشول اچھالتے، نعرہ لگاتے، سرسبز فضاؤں میں زہر گھولتے اور منہ سے شعلے اگلتے تھے۔ خانہ بدوشوں کے مطابق، دھرم اور آستھا کا مذاق نہیں اڑایا جاسکتا۔ مردوں کے مقدمے میں بھگوان آئے تو تنظیمیں دو حصے میں تقسیم ہوگئیں۔

نچلی عدالت کے بعد ہائی کورٹ کا راستہ کھل گیا۔ برہما، وشنو مہیش کا معاملہ تھا اور پٹیشن منظور کر لی گئی۔ مہندر، چندر چور کے ساتھ تین ججوں والی بنچ کو فیصلہ سنانا تھا۔ مختلف تنظیموں، حزب مخالف اور کمیونسٹ پارٹی کے ترجمانوں نے فیصلے کی



مذمت کی تھی۔

مسٹر کے اچاریہ نے کہا، یہ اس ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ اب بھگوان کہیں گے اور فیصلہ ہوگا۔ انہوں نے ہمسایہ ملک کی مثال دی اور اس عیسائی عورت کے بارے میں بتایا جس کو مذہب کی عدالت نے محض اس لیے سزا دی کہ ایک دوسری عورت کے بیان کے مطابق اس نے ایک مذہبی پیشوا کے لیے غلط الفاظ کا استعمال کیا تھا۔ ممکن ہے اس عورت نے غلط بیانی سے کام لیا ہو مگر مذہبی عدالت سے فتوے جاری ہو گئے۔

حزب مخالف کا کہنا تھا کہ بھگوان ہمارے بھی ہیں۔ مگر بھگوان کو عدالت میں لانا جائز نہیں ہے۔ پھر تو عدالتی فیصلے محض مذہب کی بنیاد پر ہوتے رہیں گے۔

مگر میڈیا مطمئن تھا کہ بھگوان کے کردار سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مگر گل بانو کے وکیل کی نیت پر شک ضرور کیا جاسکتا ہے کیونکہ وہ حزب مخالف کا آدمی ہے۔

مگر یہ معاملہ اب میڈیا کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور چندر چور کی بنچ کو اس کا فیصلہ سنانا تھا۔

چندر چور نے پہلی پیشی میں کچھ ادھر ادھر کے سوال پوچھے۔ پھر سپرا سے کہا، جہاں آپ رہتے ہیں، میں وہ جگہ دیکھنا چاہوں گا۔ فیصلہ وہ جگہ دیکھنے کے بعد ہی کروں گا۔

ایک دن بعد مہندر چندر چور سنگھ، مسیح سپرا کے ساتھ اس کا گھر دیکھنے آئے۔ سپرا نے دروازہ کھولا.... چندر چور نے اندر قدم رکھا اور چونک گیا.... نیم اندھیرا۔ سفید ہلتی ہوئی چادریں، ایک قبر اور موت کا مجسمہ....

یہ مردہ خانہ ہے.... چندر چور کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

'ہاں...'

'یہاں تم رہتے ہو؟'

'ہاں...'

'کتنے دن ہو گئے۔؟'

'اب تو یاد بھی نہیں۔'

'ہاں یاد کیسے ہوگا۔ مردہ خانے میں وقت کسے یاد رہتا ہے۔...'

'موبائل، گھڑی، ٹی وی....؟'

'کچھ بھی نہیں یہاں۔'

'فریز ہے...؟'

'ہاں۔ مردے کھایا کرتے ہیں...'

'اخبار؟'

'مردہ کو اخبار کی ضرورت نہیں ہوتی۔'

'اور یہ مجسمہ....؟'

'موت کا مجسمہ.... یہ عورت مجھے ہر وقت یہ یاد دلاتی ہے کہ میں مر چکا ہوں۔'

'ہاں....اور میں جھینگروں کی آوازیں سن رہا ہوں۔ یہاں مکڑی کے جالے بھی ہیں اور چمگادڑیں بھی.... میں سب کچھ دیکھ سکتا ہوں....اور وہ بورڈ جس کے بارے میں تم نے کہا تھا...'

'مردہ خانہ....وہ ابھی بھی پارک کے پاس پڑا ہوگا۔ اس اطراف میں کوئی نہیں آتا...'

'آبادی میں مردہ خانہ...' چندر چور آہستہ سے بولے....اور سامنے جو بنگلے ہیں، وہاں کس قدر ویرانی اور اداسی ہے۔'



'کوئی زندہ نہیں ہے....' سپرا آہستہ سے بولا

'ہاں۔ کوئی زندہ نہیں ہے۔ میں دومنٹ اس عورت کے پاس کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔ تمہیں کوئی اعتراض....؟'

'بالکل بھی نہیں۔'

سپرا نے دیکھا، چندر چور مجسمے والی عورت کے پاس کھڑے ہو گئے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ لرز رہے تھے۔ شاید وہ موت کے مجسمے سے کچھ باتیں کر رہے تھے۔ مگر اس قدر دھیمی آواز میں، کہ آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

'آخری سوال، کیا یہاں روشنی ہے؟'

'مردہ خانہ کو روشنی کی ضرورت نہیں ہوتی...'

'تمہاری قبر کہاں ہے؟'

'سپرا نے بتایا.... یہ میری قبر ہے۔ بارش سے دھنس گئی ہے، مگر گل بانو کی قبر پکی ہے۔'

'ہاں پکی ہے اور تازہ بھی۔'

مہندر چندر چور سنگھ نے سر ہلایا۔ آہستہ سے پوچھا۔

'موت کیا ہے؟'

ایک انجان سیارے میں آنکھوں کا کھلنا جہاں ہم اس دنیا سے کٹ جاتے ہیں۔

چندر چور کا لہجہ سرد تھا.... یا جب ہمیں اس دنیا سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔

سپرا نے سر ہلایا۔ چندر چور چلے گئے اور وہ اپنے سیل میں واپس آ گیا۔ راستے میں ہوا تیز ہو گئی تھی۔ جھینگر، چمگادڑ، کیڑے مکوڑے اور مردہ خانہ۔ اسے نیند آ رہی تھی۔

اب اسے فیصلے کا انتظار تھا۔

# فیصلہ

سپرا کو حیرت نہیں ہوئی کہ ہائی کورٹ کی مینار پر بھی ایک گدھ موجود تھا۔ اپنے پروں کو پھیلائے۔ پھر اس نے دیکھا۔ گدھ نے پنکھ سکوڑے اور چیختا ہوا مینار سے اڑ گیا۔ چندر چور کی بنچ کو آج فیصلہ سنانا تھا۔ اور اس فیصلے پر ایک دنیا کی نظر تھی۔ باہر میڈیا والے کافی تعداد میں جمع تھے۔ سپرا اور گل بانو پولیس وین سے اترے تو میڈیا والوں نے انہیں گھیرنے کی کوشش کی۔ مگر پولیس والوں نے انہیں دھکا دیتے ہوئے خاموش رہنے کو کہا اور یہ بھی کہا کہ جو فیصلہ ہوگا، وہ انہیں جلد معلوم ہو جائے گا۔ سپرا نے باہر کھڑے لوگوں میں سے کچھ کو چلاتے ہوئے سنا کہ ہم بھی مردہ ہیں۔ مگر اس وقت تک پولیس سپرا اور گل بانو کو لے کر اندر داخل ہو چکی تھی۔

سپرا سارے راستے خاموش رہا۔ اس کے جسم پر اس وقت بھی وہی لباس تھا، جو وہ مردہ خانے میں پہنتا تھا۔ سفید کفن۔ اور مطمئن تھا کہ اس لباس سے کافور کی مہک آتی ہے۔ اور اس مخصوص بو سے آکٹوپس نکل کر اس کی سفید چادروں سے



لپٹ جاتے ہیں۔ گل بانو خاموش تھی اور فیصلے کی منتظر تھی۔ لیکن سپرا کو فیصلے کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ اس وقت بھی ریحانہ کے بارے میں سوچ رہا تھا اور دھند میں ریحانہ کی کٹی ہوئی انگلی زندہ ہو گئی تھی۔ وہ کچھ اشارے کر رہی تھی۔ مگر سپرا اس اشارے کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

چندر چور اور ان کے دونوں ساتھی جج کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے اور اس وقت چندر چور فائلوں پر نگاہیں دوڑا رہے تھے۔

مہندر چندر چور سنگھ نے اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ 'یہ ایک تاریخی فیصلہ ہے اور فیصلہ سنانے سے قبل میں زور زور سے ہنسنا چاہتا ہوں....اور ہنسنے کے لیے مجھے کسی سے اجازت لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ شاید دنیا کی تاریخ کا یہ پہلا فیصلہ ہے، جس کو سنانے سے قبل ججوں کے بنچ کو ہنسنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔ اور میرا خیال ہے ججز کے احترام کے لیے آپ کو بھی اپنی زندگی سے ذرا وقت نکال کر اس ہنسی میں ساتھ دینا چاہیے۔'

مہندر چندر چور سنگھ رُکے۔ پھر انہوں نے ہنسنا شروع کیا۔ باقی دو ججز نے بھی ان کے ساتھ ہنسنا شروع کیا۔ ایوان میں بیٹھے تمام لوگ کھڑے ہو گئے اور سب نے ایک ساتھ ہنسنا اور قہقہہ لگانا شروع کیا۔ سپرا بھی ہنس رہا تھا اور اسے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ باہر کچھ خانہ بدوش تھے جو ہنسی کی آواز سن کر ایوان میں آ گئے تھے اور دیکھا دیکھی ان خانہ بدوشوں نے بھی ہنسنا شروع کر دیا۔

کچھ دیر تک ہنسنے کے بعد چندر چور خاموش ہوئے۔ انہوں نے سامنے کھڑے سرکاری وکیل اور ہال میں بیٹھے وکلاء کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر خاموش رہے پھر انہوں نے بولنا شروع کیا۔

'سب سے پہلے یہ سوال کہ میں ہنسا کیوں...اور میرے ساتھ باقی دو ججز بھی

اس ہنسی میں شامل کیوں ہوئے۔؟' جو فیصلہ میں سنانے جارہا ہوں، اس فیصلے میں آپ کو اس سوال کا جواب مل جائے گا۔ اور کوئی ضروری نہیں ہے کہ آپ کو جواب مل جائے۔ یہ جواب آپ کو اپنے دلوں میں بھی تلاش کرنا ہوگا۔

چندر چور نے کہا۔' میں نے دیکھا ہے کہ ان دنوں فیصلے جو بھی ہوتے ہیں اور فیصلوں کی جو فائل تیار ہوتی ہے وہ ہزاروں بلکہ لاکھوں صفحات پر مشتمل ہوتی ہے۔ کیا کسی فیصلے کو لاکھوں صفحات درکار ہیں؟ کیا اس کے باوجود فیصلے صحیح ہوتے ہیں؟ اگر فیصلوں پر عوام مطمئن نہیں ہیں تو لاکھوں لاکھ صفحات کی بربادی کا کیا مطلب ہے...؟ اور اسی لیے میرا فیصلہ محض ۲۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ فیصلہ محض ایک صفحہ بھی لے سکتا تھا مگر ضروری یہ تھا کہ جو حالات خانہ بدوشوں نے پیدا کیے ہیں، ان حالات سے یہ خانہ بدوش بھی واقف ہوں۔ اگر میں یہ کہوں کہ یہاں جب میں یہاں یہ فیصلہ سنا رہا ہوں، میں کچھ اور بھی دیکھ رہا ہوں۔ گائے، سانڈ، تتلیاں، مور، مورنی، نیل گائے، ریچھ، بندر، چوہے، مرغابیاں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ جنگل سے آہستہ آہستہ پرندے، جانور نکل کر اس ہال میں جمع ہو رہے ہیں تو کیا آپ میری بات کا یقین کریں گے؟

مہندر چندر چور سنگھ ایک وقفہ کے لیے خاموش ہوئے۔ پھر انہوں نے بولنا شروع کیا۔' آپ کو یقین کرنا چاہیے کیونکہ یہ ایک جج بول رہا ہے۔ یہ ہائی کورٹ کی عمارت ہے اور ایک جج کہہ رہا ہے کہ جنگل سے نکل کر جانور یہاں اکٹھے ہو رہے ہیں۔ مگر آپ ان جانوروں کو دیکھ نہیں رہے تو پھر آپ کو اس فرضی خیال پر یقین کیوں کرنا چاہیے۔؟ آپ کو یقین نہیں کرنا چاہیے کیونکہ جب ایوان عدالت میں آپ ان جانوروں کو دیکھ نہیں رہے تو پھر آپ کسی بڑے منصب پر بیٹھے ہوئے شخص پر، یقین کی آنکھیں بند کرکے بھروسہ کرتے ہیں تو یہ غلط ہے۔ مگر آپ نے



کیا۔ شکاری آئے گا؟ آپ نے تالیاں بجائیں۔ گدھ آرہے ہیں۔ آپ نے یقین کیا؟ آپ نے انسانوں پر یقین کرنا بند کردیا۔ مگر جانوروں پر آپ کا یقین بحال رہا۔ اور میں لکڑ بگھے کی طرف اس وقت بھی ہنسا، جب کھونٹی سے ایک گائے برآمد ہوئی۔ اور چالیس لوگ مار دیئے گئے۔ پھر تیسری کھونٹی سے ایک گائے برآمد ہوئی اور لاکھوں مار دیئے گئے۔ گائے مذہب میں آگئی۔ مذہب میں گائے کی پونچھ آگئی۔ ہنسیے۔ یہاں ہنسنے کے لیے بہت کچھ ہے.... اور اتنے تماشے ہیں کہ اس وقت تاریخ، جغرافیہ، سائنس، انسانی نفسیات، معاشیات کی کتابیں، ادب، فنون لطیفہ سے لے کر ساری دنیا ہم پر ہنس رہی ہے۔ ہنسنا کل ایک برانڈ ہوجائے گا۔ بڑی بڑی میوزک کمپنیاں اس برانڈ کو لے کر سامنے آئیں گی اور بڑے بڑے انڈسٹریلسٹ ہنسی قہقہوں کا بھی سودا کریں گے...اور پھر ممکن ہوا تو زمین چھوڑ دیں گے۔ زمین کہاں۔ آسمان.....

مہندر چندر چور سنگھ پھر خاموش ہوئے۔ مسکرائے بلکہ زور سے ہنسے اور انہوں نے کہنا شروع کیا۔' بچپن میں ایک کہانی سنی تھی۔ بھیڑیا آیا۔ بھیڑیا آیا۔ بھیڑیا نہیں آیا۔ ڈریگن آگیا۔ کیا آپ کو ہنسی نہیں آئی؟ سرکس میں تماشہ دکھانے والے کچھ جوکر تھے جن کے پاس دسویں کلاس کے بھی سرٹی فکیٹ نہیں تھے۔ انہوں نے آپ سے سرٹی فکیٹ مانگنا شروع کردیا۔ آپ کو ہنسی نہیں آئی؟ ان کے پاس باپ داداؤں کے دستاویز نہیں تھے۔ مگر انہوں نے آپ سے دستاویز مانگنا شروع کردیا۔ آپ کو ہنسی نہیں آئی؟ نہیں آئی تو کیوں نہیں آئی اور جب شمشان کی راکھ میں دستاویز تلاش کیے جارہے تھے۔ ملک کا ایک بڑا طبقہ بھوک سے مر رہا تھا۔ کسان خودکشی کررہے تھے۔ ملک کا جوان مستقبل کو لے کر پریشان تھا، ایک مخصوص برادری کے لوگ قبرستان کی کھدائی کررہے تھے۔ زمین کے تمام قبرستان کھود دیئے

گئے۔ آپ کو ہنسی نہیں آئی؟ آپ کو ضحاک کے دو سانپوں پر بھی ہنسی نہیں آئی؟ جب لوگ بھوکے تھے، اس وقت ایک جادوگر تماشہ کر رہا تھا اور اس کے تماشے سے خون کے فوارے نکل رہے تھے۔ آپ کو ہنسی نہیں آئی۔؟ جب معیشت کو مضبوط کرنے کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی، ہزاروں کروڑ کے مجسمے تعمیر ہو رہے تھے اور جادوگر کروڑوں اربوں کا غبن کرنے والوں کو اس زمین سے فرار ہونے کا موقع دے رہا تھا۔ میں پوچھتا ہوں، آپ کو ہنسی کیوں نہیں آئی؟ آپ نے سوال کیوں نہیں کیا؟ آپ سب مل کر سوال کرتے تو جواب ضرور ملتا اور بندروں اور ریچھوں کی طاقت کہیں نہ کہیں کم ضرور ہوتی۔ کیا آپ کے لیے یہ ہنسنے کا مقام نہیں کہ ابھی اس وقت اس عدالت میں کیسا کھیل چل رہا ہے؟ دو مردے۔ عدالت مردوں کا مقدمہ لڑ رہی ہے۔ زندوں کا نہیں مردوں کا مقدمہ... اور مردوں کے مقدمے میں سب سے بڑی انٹری بھگوان کی ہوتی ہے۔ سا کشات بھگوان کی انٹری۔ بھگوان درشن دیتے ہیں اور اس زمینی خطہ سے ایک رات غائب ہو جاتی ہے۔ ایک دن غائب ہو جاتا ہے۔ صرف یہی نہیں، سرکاری دفاتر میں رکھی ہوئی ضروری فائلوں میں آگ لگ جاتی ہے۔ فائلیں ہوا میں تیرتی ہوئی غائب ہو جاتی ہیں۔ کوئی جج فیصلہ سنانے سے پہلے ہی غائب کر دیا جاتا ہے۔ راتوں رات پرانی عمارت کا حلیہ بدل جاتا ہے اور کچھ خانہ بدوش اینٹ پتھروں سے کھیلنے لگتے ہیں اور تمام ثبوت وشواہد کی موجودگی کے باوجود ایک سانپ جیت جاتا ہے۔ مذہب کا سانپ.... آپ کو ہنسی نہیں آئی؟

مہندر چندر چور سنگھ نے بھری عدالت پر نظر ڈالی اور پھر کہا۔ 'میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اور جو فیصلہ سنانے والا ہوں، وہی اقرار نامہ میرے باقی دو ججز کا بھی ہے۔ فیصلہ سنانے سے قبل میں نے دیکھا، مینارے پر گدھ آ گئے؟ کیوں آئے گدھ۔؟



اس وقت مجھے رونا آیا۔ گدھ کو عدالت کے مینارے پر نہیں آنا چاہیے۔ جب گدھ آیا تو مجھے غلامی کا خیال آیا۔ اور میں نے سوچا کہ کیا دو قومی نظریہ صحیح تھا؟ صحیح ہے اسی لیے گدھ آئے۔ گدھ پرانی عمارت اور دوسری مذہبی عمارتوں کو نشانہ نہیں بناتے۔ گدھ، ریچھ، بندر کیا ان کی بڑھتی ہوئی تعداد پر آپ کو ہنسی نہیں آتی؟ ابھی کچھ برس پہلے کی بات ہے۔ ایک تماشہ ہوا.... مداری نے ڈمرو بجایا۔ ہمارے قبیل کے چار لوگ جمع ہوئے۔ ان لوگوں نے بھی مینارے پر گدھ دیکھا تھا۔ چار لوگ۔ مگر ان میں سے ایک نے گدھ سے دوستی کر لی اور مینارے پر چڑھ گیا۔ یہاں رات کے بارہ بجے اگر ضرورت ہو تو عدالت کی فیکٹری کھل جاتی ہے۔ فیصلے ہو جاتے ہیں۔ ووٹوں سے بھرا ٹرک غائب ہو جاتا ہے۔ ہاری ہوئی سرکار جیت جاتی ہے۔ جیتی ہوئی سرکار ہار جاتی ہے۔ ہم سب تاش کے پتوں میں جوکر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کوئی ہے جو سکسر پر سکسر لگا رہا ہے مگر غلط طریقے سے اور قدیم گرنتھوں سے سائنس کے کرشمے نکال رہا ہے۔ ہنسیے مت روئیے کہ اندر سے زمین ہل رہی ہے۔ آتش فشاں پھٹ رہا ہے۔ سونامی سب کو بہا لے جا رہی ہے۔ اور کوئی ہے جس نے زمین کو گروی رکھ دیا ہے۔

مہندر چندر چور سنگھ خاموش ہوئے تو دوسرے جج اکھلیش کمار نے بولنا شروع کیا۔ یہ جلد ہی ریٹائر ہونے والے تھے ــــ لمبا قد۔ چہرے پر سنجیدگی۔ اکھلیش کمار نے کچھ دیر ادھر ادھر کا جائزہ لینے کے بعد بولنا شروع کیا۔

اوم .. ، اکھلیش کمار نے بولنے سے قبل زور سے اوم کہا.. پھر بولنا شروع کیا.. برہما، وشنو مہیش .. کائنات کے تین خالق ــــ اوم، ایک مخصوص آواز جو ساری کائنات میں گونجتی ہے.... اور مثبت توانائی کے ساتھ ــــ اور جو لوگ مراقبہ کی گہرائی

میں جانا چاہتے ہیں، وہ اس معجزاتی آواز کو سن سکتے ہیں۔

یہ تین حرف A، U اور M پر مشتمل ہے۔ اس کے معنی ہیں، خدا کی تین شکلیں ـــــــ برہما، وشنو اور مہیش۔ شیو کے دو جسم ہیں۔ ایک جس کا اظہار وسیع پیمانے پر کیا جاسکتا ہے۔ دوسرا، جو لطیف شکل جنسی کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ایک الگ پتھر کی شکل میں شیو کی سب سے زیادہ پوجا کی جاتی ہے۔ شیو نے کائنات کو قائم، برقرار رکھنے اور تباہ کرنے کے لئے تین دیوتاؤں کو بالترتیب برہما، وشنو اور مہیش کو بنایا ہے۔ اس طرح شیو کائنات کا خالق ہے۔ اردھ ناریشور، یعنی مرد اور عورت شیو کی طاقت کی شکلیں ہیں۔ عورت فطرت ہے اور مرد نر۔ فطرت کے بغیر مرد بیکار ہے اور فطرت مرد کے بغیر۔ دونوں کا باہمی تعلق ہے۔ اکھلیش کمار رُکے .....پھر کہنا شروع کیا۔ ’امرت منتھن کے وقت جب دیوتا اور شیطان آپس میں لڑ رہے تھے، سمندر سے امرت برآمد ہوا۔ آگ کا شعلہ اٹھا اور دس سمتوں تک آگ پھیل گئی۔ تمام مخلوقات میں چیخ و پکار مچ گئی۔ دیوتاؤں اور شیطانوں سمیت ریشیوں اور یکشوں وغیرہ نے زہر کی گرمی سے جلنا شروع کیا۔ دیوتاؤں کی دعاوں پر، بھگوان شیو نے زہر پیا اور زہر کی وجہ سے ان کا جسم نیلا ہوگیا اور وہ دنیا میں نیل کنٹھ کے نام سے مشہور ہوئے۔

اکھلیش کمار رکے پھر بولنا شروع کیا.....’ دس سمتوں میں آگ اور چاروں طرف زہر ہی زہر .....مورچہ اسروں نے سنبھالا۔ ایک اشارہ اور رات کے اندھیرے میں موم بتیاں جل اٹھتی ہیں۔ دیے روشن ہو جاتے ہیں۔ ایک اشارہ، تھالی اور تالی سے زمین گونجنے لگتی ہے۔ ایک اشارہ کچھ بھی کرسکتا ہے اور تنہائی کی بساط پر گھوڑے اور مہرے کے کھیل چل رہے ہیں۔

تاریخ کے عالیشان محل میں ایک قید خانہ تھا۔ عظیم الشان قید خانہ۔ میں اس قید



خانے کو دیکھ سکتا ہوں۔ اس قید خانے میں اپنے اپنے وقت کے تمام سکندر موجود تھے۔ اور اس عظیم الشان قید خانے میں ایک قطار سے ان کی لاشیں سجی تھیں۔ ان سب کے چہرے بدنما، بد ہیئت تھے اور اس وقت وہ کسی بھی قسم کا زلزلہ پیدا کرنے کی حالت میں نہیں تھے۔ مگر یقیناً، جب زندہ تھے، ان کا دماغ سازشوں کا گھر رہا ہوگا اور یہ سازشیں انسانی ہلاکت کا بازار گرم کرنے میں مصروف رہی ہوں گی مگر اب قید خانے میں یا سرد خانے میں پڑے تھے اور ان لاشوں سے بدبو پیدا ہو رہی تھی۔‘

اکھلیش کمار نے ٹھہر کر بولنا شروع کیا ـــــــ

’جوناتھن کے شہرہ آفاق ناول گلیورس ٹریول کا کردار چھوٹے قد کے بونوں اور گھوڑوں کے دیس سے واپس آ کر بندروں کے دیس کب گیا، یہ بتانا آسان ہے۔ مگر بندروں کے دیس کی مجبوری ہے کہ آپ جھوٹ پر جھوٹ بولتے رہیں، کوئی سزا نہیں۔ آپ بندروں کی فطرت اور عادت کے مطابق تشدد پر آمادہ ہو کر باغات، کھیت، فصلیں روند ڈالیں، کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ زمین کا تمام سرمایہ، اناج، دھن، سب کچھ ڈکار لیں یا کھا جائیں تب بھی بندروں کی ٹولی اس چھوٹی سی بات کو بندروں کی قدیم وراثت ہی ٹھہرائے گی کیونکہ بندروں کا شغل ہی یہی ہے۔

تاریخ کے صفحات پر کئی چہرے چمکتے ہیں اور اوجھل ہو جاتے ہیں۔ ہٹلر، چنگیز، ہلاکو، نپولین، مسولینی۔ مسولینی کہتا تھا کہ میں تاریخ کے صفحات پر اپنے خونی نشانات چھوڑ جاؤں گا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میرے نشان شیر کے پنجوں کے نشانات سے مشابہ ہوں گے۔ یہ اس شخص کا اعتراف تھا جس نے پانچ لاکھ انسانوں کو اپنی خوشی کے لئے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کیا یہ کہانی ان تاناشاہوں تک آ کر ختم ہو جاتی ہے؟

اکھلیش کمارنے سامنے کھڑے لوگوں کی طرف دیکھا پھر بولنا شروع کیا—— 'ہم کیا پڑھ رہے ہیں؟ جو گدھ ہمیں پڑھنے پر مجبور کررہے ہیں۔ہم کیا دیکھ رہے ہیں؟ جوگدھ ہمیں دکھا رہے ہیں؟ ٹی وی چینلز ہوں یا اخبارات —— کوئی بتا سکتا ہے کہ ہمیں کیا پڑھنا اور دیکھنا چاہیے؟ کچھ چہرے ہیں جو گدھوں سے وابستہ ہیں——اب یہ چہرے ڈراؤنے خواب بن کر ہم سے ہماری زندگی چھین رہے ہیں۔1946 میں جارج آرول نے ایک ناول لکھا '1984' اس ناول کے کردار ہمیں ڈرایا کرتے تھے——ایک ایسی دنیا جہاں ہم سے ہماری زندگی چھین لی گئی ہے——اسکا ایک جملہ اب تک یاد ہے—— بگ برادر از واچنگ یو... ہرجگہ دو آنکھیں ہمارے تعاقب میں ہیں—— ہرجگہ عام انسان پولیس اور فوج کی نگرانی میں ہے ... آپ سوچ نہیں سکتے—— آپ لکھ پڑھ نہیں سکتے—— اور اس کے جرم میں بھی آپکو موت کی سزا سنائی جا سکتی ہے—— ہم اس ناول کو فنتا سی سمجھتے تھے۔لیکن آج یہی معاشرہ ہمارے سامنے ہے ... صبح کے وقت اخبار کا مطالعہ کیجئے تو صاف جھلکتا ہے کہ یہ جھوٹی خبریں ہیں ... ایک دو تین ... اخبار در اخبار دیکھ لیجئے ... جیسے اخبار والے واقف ہی نہیں کہ ہمارے ساتھ موت سے بھی زیادہ بھیانک کھیل شروع ہو چکا ہے ... ہم کیا دیکھیں؟ چلئے ..ٹی وی کے چینلز دیکھتے ہیں ... یہاں بدترین صورت حال ہے ... جبر وخوف کے اس ماحول میں جسم کی جگہ ایک عریاں ڈھانچہ رہ گیا ہے ... روح کی کینچلی اتار دی گئی ہے ... گدھوں کے لفظ سبز گیس اور آلودگی کی طرح ہمارے جسم میں اتار دئے گئے ہیں ... کبھی کبھی حقیقت میں محسوس ہوتا ہے کہ ہم کسی گیس چیمبر میں ڈال دیے گئے ہیں....ہم وحشی دنیا سے نکلے اور اندھوں کے مقبروں میں آ گئے --

ایک بادشاہ کا وفادار ایک بندر تھا۔ایک دن شکار شکار کھیلتے ہوئے بادشاہ کو نیند



آ گئی۔بندر پاس میں تھا۔بندر نے دیکھا کہ ایک مکھی دیر سے بادشاہ کو پریشان کر رہی ہے۔بندر نے تلوار اٹھائی اور ناک پر بیٹھی ہوئی مکھی کو ہلاک کرنے کے ارادے سے تلوار چلا دی۔مکھی اڑ گئی...

کبھی کسی زمین کے ٹکڑے کو مکھی اور پتنگوں کی طرح اڑتے دیکھا ہے آپ نے؟

ایک بانسری والا تھا جو بین بجا کر گھروں سے چوہوں کو بلایا کرتا تھا۔پھر چوہوں کو لے کر آبادی سے دور کسی گھاٹی کی ترائی میں اتار دیتا۔بستی کے لوگوں نے پہلے اس کارنامے کو معجزہ سمجھا۔ایک دن وہ بانسری والا دوبارہ آیا۔بین بجا کر بستی کے تمام لوگوں کو اندھوں کے قبرستان لے گیا۔

ہم پندرھویں صدی کے، اندھوں کے قبرستان میں آ گئے... پاؤں کے نیچے سے زمین غائب۔آسمانی اشارے عذاب کے خوفناک راستوں کو دیکھتے ہوئے۔ وہ شامی بچہ تھا،جس نے مرنے سے قبل کہا تھا،عرش پر جب خدا سے ملونگا تو اس کو سب بتا دونگا۔اس نے بتا دیا اور سحر گم ہو گئی۔سورج سوا نیزے پر آ گیا۔دریاؤں کا پانی اچھلا،سمندر کی لہریں تیز ہوئیں۔کنارے پر بزرگوں کی فوج—— تھکے ہوئے، سر جھکائے،آسمانی دھند کو دیکھتے ہوئے،کمزور اور لاچار——وائرس کی تیز لہر چیخی اور بزرگوں کو ساتھ بہا لے گئی——یہی تو اٹلی نے کہا——فرانس نے کہا—— ہسپانیہ نے کہا۔بزرگ مرنے کے لئے ہوتے ہیں—— چین نے بھی عمل کیا—— گاڑیاں آتی تھیں، لاشوں کو خدا جانے کہاں لے جاتی تھیں—— ہزاروں تو بند دروازوں میں گیس سے ہلاک کر دیے گئے—— کیا ان میں صرف بزرگ تھے؟ وہ دونو جوان آنکھیں جو ابھی ڈھنگ سے محبت کے گلاب راستوں پر چل بھی نہ پائی تھیں، وہ معصوم بچہ جو آنکھیں کھولنے کے بعد قدرت کے سحر کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا

......ایسے ہزاروں بچے...... ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں نوجوان، اور بوڑھے، بوڑھے جو مرنے کے لئے ہوتے ہیں ......خوفزدہ گھر کی چوکھٹ سے بندھے، یہ پہلے سے ہی آیسولیٹ کر دیے گئے ہیں۔اب انکے پاس خوف کا نیا جان لیوا تحفہ ہے۔

ہم باہر نہیں نکلیں گے، کیونکہ باہر موت ہے۔ہم گھر میں رہیں گے، جہاں سے زہریلی گیسیں کبھی بھی ہمیں بیمار اور مردہ کر سکتی ہیں۔الگزنڈر سولسٹین کا ناول، گلاگ آرکیپلاگو کا ایک منظر ہے۔ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ جا رہا ہوتا ہے۔ ایک دوسرا شخص آواز دیتا ہے۔اور اس سے کہتا ہے کہ اسے بس دو منٹ چاہیے۔ بیوی کے ساتھ جو شخص ہے، اسے نہیں معلوم کہ یہ دو منٹ، 20 برس بھی ہو سکتے ہیں اور یہ بھی کہ دو منٹ کے بعد اسے اس دنیا سے دور کسی موت کے سیارے میں بھیج دیا جائے گا—— کیونکہ اسے گدھوں کے خلاف بولنے کے جرم میں سزا سنائی جا چکی ہے۔ مجھے روس کے انقلاب کی یاد آ رہی ہے، زار کی حکومت تھی، عوام میں اس کے غیض وغضب کو لے کر غصّہ تھا۔ پر امن ریلیوں کے ساتھ احتجاج شروع ہوا۔شاہی محل کے سامنے ایک پُر امن مظاہرے کا اہتمام کیا گیا۔ مظاہرین کی تعداد دیکھ کر شاہی گارڈ خوف زدہ ہو گئے۔انہوں نے خوف زدہ ہو کر فائرنگ کر دی جس سے ایک ہزار افراد مارے گئے۔ 23 فروری 1917ء کو خواتین کا عالمی دن تھا۔دارالحکومت سینٹ پیٹرز برگ میں مرد فیکٹریوں میں اور عورتیں خوراک کا راشن لینے گئی تھیں۔کئی گھنٹوں کے انتظار کے بعد جواب مل گیا کہ خوراک ختم ہو چکی ہے، کچھ نہیں ملے گا۔اس کے جواب میں عورتوں نے تاریخی ہڑتال کا آغاز کر دیا جسے تاریخ میں فروری انقلاب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔خواتین نے اردگرد کی فیکٹریوں کے محنت کشوں کو جمع کرنا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں تقریباً 50 ہزار محنت کش ہڑتال پر چلے گئے۔ دو دن بعد تک سینٹ پیٹر برگ کے تمام صنعتی مراکز



بند ہو چکے تھے۔کبھی یہی صورت فرانس کی تھی۔ جب پانی سر سے بلند ہو گیا تو عوام نے غصّے میں ان شاہی محافظوں کو کچل دیا جو فرانس کے بادشاہ کے حکم پر ظلم و بربریت کی کہانیاں لکھا کرتے تھے۔فرانس کا انقلاب ہمیں آواز دیتا ہوا نظر آتا ہے۔'

اکھلیش مسکرائے، دوبارہ بولنا شروع کیا——

'فرانس میں ان دنوں بوربون خاندان کی حکومت تھی۔بادشاہ کے اپنے لوگ تھے۔اپنا عدالتی نظام تھا، ہر شعبے پر حکومت تھی، عوام نے تنقید کا حق کھو دیا تھا۔ فرانس نے تمام عدالتی منصب فروخت کر دیے تھے۔دولت مند تاجر منصبوں اور عہدوں کو خریدتے تھے۔اس زمانے میں فرانس کے ججوں کی تنخواہیں کم تھیں۔جج بادشاہ کے زیر نگران کام کرتے اور فیصلے لیتے تھے۔ رشوت خوری کا بازار گرم تھا۔ فرانس کی پارلیمنٹ میں صرف ایک ہی کام ہوتا تھا بادشاہ کے ہر حکم کو قانونی اور آئینی شکل دینا۔فرانس میں اس وقت بھاری ٹیکس نافذ تھے۔معیشت کی کمر ٹوٹ گئی۔فرانس کا بادشاہ پیرس سے بارہ میل دور ''ورسائی'' کے محل میں رہتا تھا۔اس کے دربار میں اٹھارہ ہزار افراد موجود ہوتے تھے۔شاہی اصطبل میں انیس سو گھوڑے تھے جن کی دیکھ بھال کے لیے چالیس لاکھ ڈالر سالانہ خرچ ہوتے تھے اور باورچی خانہ کا خرچ پندرہ لاکھ تھا۔فرانس بھی دیوالیہ تھا۔ وہاں لاکھوں مزدور بے کار تھے۔فرانس کے جیل خانے معصوم اور بے قصور لوگوں سے بھرے پڑے تھے۔ فرانس میں بادشاہ کے خلاف پیدا ہوئی نفرت انقلاب میں تبدیل ہو گئی۔ 14 جولائی 1789 کا دن، انقلاب کے اگتے سورج کا دن تھا۔پیرس میں دو شاہی محافظ مارے گئے اور اس کے بعد فرانس میں وہ انقلاب آیا جس نے دنیا کا نقشہ بدل دیا۔

دوسرے جج نے ایک ذرا توقف کے بعد کہا۔ بہت اندھیرا ہے اور اس وقت یہ اندھیرا اس سرزمین پر رہنے والے تمام لوگوں کو دکھائی دے رہا ہے۔

تیسرے جج سبودھ کمار مصرا نے ہال کی طرف دیکھا۔ان کے ماتھے پر تلک لگا ہوا تھا۔ان کی عمر ۵۵ برس کے آس پاس ہوگی، یہ سپرا کا خیال تھا۔

سبودھ کمار مصرا نے ہال کی طرف دیکھا۔ پھر بولنا شروع کیا——'پہلے میں نے اس مقدمہ کو مذاق سمجھا۔ میں اپنے دونوں فاضل جج کی باتوں سے مطمئن نہیں تھا۔ اس وقت میرے کان سن پڑ گئے ہیں... اور میں جھینگروں کی آواز سن رہا ہوں...اور میں اپنے دونوں فاضل ججوں کی باتوں سے مطمئن ہوں۔

مہندر چندر چورسنگھ نے ہال کی خاموشی کا جائزہ لیا——'میرے فاضل دوست نے تاریخ کے تعلق سے کئی واقعات اور حادثات کا ذکر کیا۔تاریخ کیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں تاریخ ایک اندھی سرنگ ہے یا بلیک ہول۔ جس میں ہم اپنے وقت کے خزانے دفن کردیتے ہیں۔مگر ہمارے خزانے تو لٹ چکے ہیں۔ ہمارے پاس کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔اس لیے اس تاریخی فیصلہ کو سنانے سے قبل میں نے مسیح سپرا کے گھر کو دیکھنا مناسب سمجھا۔ میں اپنے الفاظ کے لیے معافی چاہتا ہوں۔گھر نہیں مردہ خانہ۔ بے شک وہ ایک مردہ خانہ تھا اور وہاں دو قبریں تھیں اور ایک موت کا مجسمہ تھا۔ میں نے کچھ دیر اس موت کے مجسمے سے گفتگو کی...اور اس وقت، اس لمحہ میں نے بھی محسوس کیا کہ وقت کی گھڑی رُک گئی ہے۔ میری سانس نہیں چل رہی ہے۔جسم میں خون کی گردش ٹھہر گئی ہے۔ میرا جسم سرد برف میں تبدیل ہو رہا ہے۔اور میں نے محسوس کیا، میں مردہ ہوں اور میں نے محسوس کیا کہ میں زندہ کب تھا؟ میں نے پوچھا کہ اخبار کہاں ہے، جواب ملا۔ نہیں ہے۔ میں نے پوچھا،



موبائل، ٹی وی کہاں ہے۔؟ جواب ملا، نہیں ہے۔ مجھے تعجب نہیں ہوا۔ مردوں کو زندگی کی ضرورتوں سے کوئی مطلب نہیں ہوتا۔؟ میں نے بھی فاضل جج سبودھ کمار مصرا کی طرح جھینگروں کی آوازیں سنیں۔ چمگادڑوں کو دیکھا جو اکثر شمشانوں اور قبرستانوں میں نظر آتے ہیں۔ملک زمین کا ایک ٹکرا ہے۔ میں نے اس زمین کے ٹکرے کے بارے میں سوچا تو مجھے چاروں طرف کسانوں کی لاشیں نظر آئیں۔ مجھے خیال ہوا کہ یہ زمین کا ٹکڑا بھی مردہ ہے۔ پھر میں نے خود کے سراپا کا جائزہ لیا۔ اور مجھے احساس ہوا کہ میں بھی مردہ ہوں۔ اور وہ کروڑوں روحیں جو ملک اور بیرون ملک سے آواز لگا رہی ہیں کہ ہم سب مردہ ہیں، تو میں نے ان آوازوں پر بھی غور کیا اور مجھے وہ سب بھی مردہ نظر آئے۔ پھر میں نے زندہ شخص اور مردہ شخص، زندگی اور موت کی تعریف پر غور کیا تو بات میری سمجھ میں آگئی۔

مہندر چندر چورسنگھ رُکے، ہال کی طرف دیکھا، ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ وہ کچھ سوچ رہے تھے۔، پھر انہوں نے بولنا شروع کیا۔

'جب میں فیصلے کے لیے گھر سے روانہ ہوا تو میں نے اپنے فاضل جج دوستوں سے کہا، یاد رہے، ہم زندوں کا نہیں، مردوں کا فیصلہ کرنے جارہے ہیں۔ اور اس وقت مجھے جیمس جوائز کی یاد آرہی تھی۔ اس کے شاہکار، یولیسز کی یاد آرہی تھی۔ اور یولیسز میں ایک ایسا لمحہ آتا ہے، جب وقت ساکت اور منجمد ہوجاتا ہے۔ایک گہری نیند ہوتی ہے۔ ایک انڈہ اور ایک پرندہ ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد سند باد جہازی ....پھر گہری لمبی اندھیری رات میں لایعنیت سے تعلق رکھنے والے کچھ الفاظ اترتے ہیں۔سند باد دی سیلز...... پند باد دی پیلر......ٹن باد دی ٹیلر.....اور حیرتوں کا ایک مجسمہ ہوتا ہے جسے میں نے مسیح سپرا کے گھر بھی دیکھا تھا اور مجھے یقین ہے، پرندے، انڈے اور سند باد کے ساتھ جوائز اس وقت لاشعور کے سرد خانے میں تھا۔ اور میرے

فاضل دوست نے پوچھا کہ یہ لاشعور کا سرد خانہ کیا ہے اور کٹے ہوئے سر والے کیسے چل سکتے ہیں؟ بندوق سے نکلی ہوئی گولیاں کیسے واپس آسکتی ہیں۔ میں نے بتایا کہ سند باد سب کچھ کرسکتا ہے۔ ڈلوامہ میں کیا ہوا؟ اور میرے فاضل دوست نے بتایا کہ چالیس سر تھے، فوجیوں کے، جو ہوا میں لہرا رہے تھے۔ میں نے پوچھا، لہراتے ہوئے کہاں گئے۔؟ میرے فاضل جج دوست نے کہا، منٹو کے ٹوبے ٹیک سنگھ کی طرح کبھی ادھر کبھی سرحد کے اس پار ادھر۔ میں نے کہا۔ اسی طرح لاشعور کے سرد خانے میں ایک فینکس نام کا پرندہ تھا، ایک سند باد جہازی تھا، کچھ ظالم اور رحم دل الفاظ تھے۔ کچھ جملوں کے خزانے تھے۔ سب تھے لیکن لاشعور کے سرد خانے میں۔ اور سند باد اور جیمس جوائز کی طرح اس سرد خانے کو مسیح سپرا نے بھی دیکھا تھا اور اس وقت یقیناً وہ مردہ تھا اور جب آسمان پر ہماری زمین کے ٹکڑوں کی چوری ہو رہی تھی، ہم سب اس وقت لاشعور کے سرد خانے میں تھے...اور اس سرد خانے میں ڈریگن بھی تھا اور اس سرد خانے میں، میں نے کھونٹی پر ٹنگے ہوئے بیس لاکھ کے سوٹ کو دیکھا تھا....اور آپ کو حیرانی نہیں ہونی چاہیے کہ یہ سوٹ اڑا اور امریکہ نے آسمان کی، ہماری کچھ زمینوں پر قبضہ کرلیا۔ یہ سوٹ اڑا اور نیپال نے، آسمان کی ہماری کچھ زمینوں پر قبضہ کرلیا۔ لاشعور کا سرد خانہ، ہم اس سرد خانے میں تھے۔ ساکت، منجمد اور مردہ۔ اور اس سرد خانے میں سند باد بھی تھا اور اس کے جھولے میں کچھ تھا، میں نے اس سے پوچھا، تمہارے جھولے میں کیا ہے، اس نے کہا، سات جنوری، داڑھی اور کچھ بطخیں ـــــ مجھے اس کی بات پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

مہندر چندر چور سنگھ اس دفعہ مسکرائے اور بولنا شروع کیا۔

’جو نہیں سوچتے، جو نہیں دیکھتے، جو نہیں بولتے، وہ زندوں کی فہرست میں شامل نہیں ہوتے ۔ جب زندگی کی حرکت بند ہوجائے تو موت کا ہی دروازہ کھلتا



ہے اور اس وقت ہم سب گمنام موت کی وادیوں میں ہیں۔ پھر میں نے اس تاریخ کے بارے میں غور کیا۔ ۷ جنوری، جسے بھگوان نے غائب کردیا اور پچھلی رات میں نے بھی خواب میں برہما، وشنو، مہیش کو دیکھا۔ ساکشات درشن۔ دھرتی ہل رہی تھی۔ نیل کنٹھ کا نیلا رنگ کچھ زیادہ ہی گہرا ہوگیا تھا۔ میرے سامنے کائنات کے خالق تھے...اور مجھ سے کہا گیا کہ دونوں بے قصور ہیں، کیونکہ ان دونوں کی روحیں برہمانڈ میں تیرتی ہوئی آچکی ہیں۔ اگر فیصلہ بھگوان کو حاضر ناظر جان کر ہی سنانا ہے تو میں برہما، وشنو، مہیش کو حاضر ناظر جان کر فیصلہ سناتا ہوں کہ

ایک۔ مردوں کو جیل میں رکھنا مردوں کی بے حرمتی ہے۔

دو۔ مردوں پر مقدمہ قائم کرنا، مردوں کے ساتھ کھلواڑ ہے۔

سوم۔ میں ان دونوں مردوں کو برہما وشنو مہیش کے حکم پر رہائی کا حکم دیتا ہوں....اور ہاں۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ میں بھی مردہ ہوں اور مجھے اپنے گھر جانا ہے، جہاں ایک مردہ خانہ میرا انتظار کررہا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ برہما وشنو مہیش کی آمد کے بعد اس مقدمے کو دنیا کی کسی بھی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔‘

مہندر چندر چور سنگھ نے فیصلہ سنایا۔ اٹھے اور کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ابھی وہاں ایک گدھ تھا، جو اڑتا ہوا باہر نکل گیا ہے۔ خیال رہے کہ گدھ دوبارہ اس کیمپس میں نظر نہیں آنا چاہیے۔ باقی دونوں جج بھی ان کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔

سپرا کے جسم میں ہلچل تھی مگر اس ہلچل کے باوجود اسے لگ رہا تھا کہ جسم سے روح پرواز کرچکی ہے۔ اور اس کے پاؤں سے لپٹے ہوئے آکٹوپس غائب ہیں اور اب وہ مردہ گھر واپس لوٹ سکتا ہے۔

# سپرا کی ڈائری سے

میں مردہ خانہ واپس آ گیا۔ میری قبر والی جگہ میرا انتظار کررہی تھی۔ میں نے کچھ دیر آرام کیا۔لیکن اس درمیان میں کہاں تھا، مجھے کچھ کچھ یاد آ رہا تھا، کچھ منظر تھے جو آنکھوں کی چمک میں اضافہ کررہے تھے۔میں ایک پتھریلی سڑک پر تھا۔ پھر سنگلاخ پہاڑیوں سے گزرا، پھر خود کو چھوٹے بڑے نخلستان کے درمیا ن پایا۔ پہاڑیوں کے درمیان گلیشیئر سے زعفرانی خوشبو فضا میں پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یونانی اساطیر کے مطابق کرکس نام کا خوبصورت نوجوان سی ہیکس نام کی حسینہ کے عشق میں گرفتار ہوا۔حسینہ بے وفا نکلی اور اسے فالسی رنگ کے پھول میں تبدیل کر دیا۔ یہ فالسی رنگ اب زعفران کہلاتا ہے۔۔زعفران کی خوشبو دور سے آتی ہوئی مجھے مدہوش کررہی تھی۔میں نے پہاڑیوں کے پاس اڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھا تو ان کے رنگ بھی فالسی تھے۔اور پھر میں نے دیکھا،گلیشیئر سے ایک ہاتھ باہر آیا اور مجھے شناخت کرنے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ یہ وہی نوجوان تھا کرکس۔ اس کے ہاتھ میں ایک پالتو گدھ تھا۔ وہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھا اور اس نے



کہا.....دنیا بدصورت ہوگئی ہے...اور ادھر....ادھر سے جو ہوائیں آتی ہیں، اس نے بے وفا حسینہ کی طرح زعفران کی خوشبو کو، جو مدہوش کر دیتی تھی، زہر میں تبدیل کر دیا ہے۔اور یہ بھی کہا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ اور جانے سے پہلے سن لو کہ زندگی خوبصورت ہے۔نفرت اور محبت کے بغیر بھی زندگی خوبصورت ہے۔ میں نے کرکس کو گم ہوتے ہوئے دیکھا اور خود کو اپنی قبر کے قریب پایا اور دیکھا کہ مجسمہ والی عورت میرے چہرے پر جھکی ہوئی ہے۔

پھر میں نے سیاہ طوفان کو دیکھا جو موسم بہار کا طواف کرتا ہوا سندھ وگنگا کے میدانی خطے سے اٹھا تھا۔ اور اس نے سورج کی روشنی پر بہت حد تک قبضہ کرلیا تھا اور میں نے معدوم ہوتی روشنی کو دیکھا۔ پرندوں، چمگادڑوں اور کیڑے مکوڑوں کو سورج کی تپش میں جلتے ہوئے دیکھا اور میں نے خانہ بدوشوں کو دیکھا جن کے لباس وگریباں چاک تھے اور وہ زندگی زندگی چلا رہے تھے۔

ایک لمبی نینداور خواب۔میں خواب سے ٹوٹا ہوا ایک لمحہ یا وقفہ ہوں۔ میں اس خواب میں کبھی گاندھی، نہرو اور جناح کو دیکھتا ہوں اور کبھی ان محلوں کو جو مکینوں سے خالی ہوگئے۔میں سراب کی طرف بھاگتا ہوں۔ کھنڈرات۔ پامال ہوچکی دیواریں، خستہ عمارت کے نقوش....چمگادڑیں اور اڑتی ہوئی خاک۔ کہیں کہیں ریت کا سمندر اور ٹولیوں میں نظر آنے والے ساربان۔ اور خواب....میں خوابوں کے میلے سے گزرا تو مجھے گل بانو نظر آئی۔ وہ رہائی والے دن شام کے وقت مجھ سے ملنے آئی تھی اور اس وقت تک سورج غروب نہیں تھا۔اس نے سفید سرسراتی چادروں کو دیکھا۔ پھر مجھ سے پوچھا۔

کیا اب ان کی ضرورت ہے؟

'ہاں'۔

'اس مجسمہ کی ؟'

'ہاں.....'

'کیا ہم حقیقت میں آزاد ہیں....؟'

'ابھی نہیں کہا جا سکتا....' میں نے آہستہ سے کہا۔ فالسی رنگ والا شہزادہ خطرے میں ہے۔

گل بانو نے آہستہ سے پوچھا۔ 'کیا تم بھگوان کو مانتے ہو؟'

'ہاں..'

گل بانو نے سر جھکایا۔ 'بھگوان دوبارہ آ سکتے ہیں۔ نئی شکل میں۔ مگر ابھی میں آزاد ہوں۔ کیا یہ پردے اتار دوں....؟'

'نہیں..'

'کیوں ؟'

'مجھے چمگادڑوں کی ہنسی اچھی لگتی ہے اور تم ابھی بھی ریحانہ کی طرح باتیں کرتی ہو'

'یہاں سب ریحانہ ہیں۔ اور باہر زعفران کھلے ہیں۔ مگر...' گل بانو نے دوبارہ کہا۔ 'پردے اتار دوں۔ اب ان سفید چادروں کی ضرورت نہیں ہے اور یہ مجسمہ بھی توڑ ڈالو۔ اس نے مجھے بہت ڈرایا ہے۔' وہ اچانک چونک کر بولی۔ تم نے محسوس کیا.....وہی بو.....

'ہاں..'

'شاہراہوں پر لوگ ماسک لگائے ہوئے چل رہے ہیں....تم کو بھی ماسک کی ضرورت پڑے گی۔'

'نہیں۔ میں مردہ ہوں۔'



گل بانو ہنسی۔ 'مردہ مگر ایک خوبصورت گدھ جو میرے قابو میں نہیں آیا۔'

گل بانو کے جانے کے بعد میں نے سفید سرسراتی چادروں کے درمیان مجسمہ والی عورت کو غور سے دیکھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ مگر کیا۔؟ اور میں بھی اس خیال میں ہوں کہ اگر پردوں کو ہٹا دوں تو کیا مردہ خانہ کی خاموشی متاثر ہوگی ؟ کیا روحوں کو اندھیرا پسند ہے۔؟

ابھی میں خود کو تیار نہیں کر سکا ہوں کہ مجھے ان پردوں کو اتارنا چاہیے یا نہیں۔؟ بہت ممکن ہے، یہ پردے اتر جائیں۔ مگر ان پردوں کے باہر بھی ویرانی ہے اور جیسا کہ مہندر چندر چور سنگھ نے کہا تھا، یہ بنگلے والے بھی مردہ ہیں۔

یہ میرے آرام کا وقت ہے لیکن اس کے باوجود میں لایعنیت کے صحرا میں بھٹک رہا ہوں۔

مردہ خانے میں عورت

مشرف عالم ذوقی

MURDA KHANY MEIN AURAT
by
Musharaf Alam Zauqi

Musharaf Alam Zauqi

**مزید کتابیں**

- لے سانس بھی آہستہ
- آتشِ رفتہ کا سراغ
- ہائی وے پر کھڑا آدمی
- دل فگارو چلو
- آدمی بیاں بھی ہے
- صحبتِ یار

Rs.

www.sangemeel.com
ISBN-10: 969-35-3306-2
ISBN-13: 978-969-35-3306-4
9789693533064